

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
فروری 2015
خواتین ڈائجسٹ
WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — نادرہ ناقی

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی — امت الصبور
بلقیس بھٹی

ادبیات — عدشان

اشتہارات — خالدہ جیلانی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

700
6000
8000













فروری 2015

جلد 42 شمارہ 10

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Phone 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ایک انسان کی ذہنی تشکیل میں جہاں بہت سے بیرونی عوامل ہوتے ہیں، اس کے اردگرد ہونے والے حادثات، واقعات اور حالات ہوتے ہیں، وہیں اس کے گھر کے ماحول اور تربیت خصوصاً ماں کی تربیت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کبھی کوئی ایک واقعہ، حادثہ یا سانحہ انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ زندگی کا دھارا بدل کر اسے یکسر تبدیل کر دیتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے بیشتر لوگوں کی زندگی میں ان کے گھر کا ماحول، مضبوط تربیت اور صحیح رہنمائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انہیں حالات سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں عالمی سطح پر ایک ظلم کا نظام فروغ پا رہا ہے۔ انصاف کا تصور ناپید ہے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شرانگیزی کر کے مسلمانوں کو مشتعل کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف نسلی، لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ تفریق میں الجھایا جا رہا ہے تاکہ وہ متحد نہ ہو سکیں۔

سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے بچوں کے والدین کے ساتھ پاکستان کے ہر فرد کی آنکھ خون کے آنسو رو رہی ہے۔ اس واقعے نے قوم کو جہاں بیدار کیا وہاں ایک مرتبہ پھر تمام تفریقات کو مٹاتے ہوئے متحد ہونے کا موقع بھی دیا ہے۔ وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ہوش مندی سے کام لیا جائے۔ میڈیا اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ خاص طور سے الیکٹرانک میڈیا کو ہیجان خیزی کے بجائے دلیل، سوچ، علم اور شائستگی سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمت اور حوصلہ پیدا کیا جائے، امید جگائی جائے۔ ہر طرح کا تعصب اور نفرت ختم کر کے محبت کا سبق دیا جائے۔ امید ہی زندہ رکھتی ہے اور محبت رب تک لے جاتی ہے۔

سالگرہ نمبر،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ مصنفین سے درخواست ہے، اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہدِ الست،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- عنیقہ ملک کا مکمل ناول۔ مسکراتی ہے زندگی،
- حیا بخاری اور سمیرا ایاز کے ناولٹ،
- ایمل رضا، مہک فاطمہ اور ریحانہ اسلم کے افسانے،
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- ٹی وی فنکارہ شہریار منور سے ملاقات،
- ریحانہ لطافت سے باتیں، کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

فروری کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

تمام امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں سنت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حدود الٰہی میں سفارش کرنے کی حرمت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بدکار عورت اور بدکار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان دونوں پر اللہ کے دین کی تعمیل میں تمہیں رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔" (النور 2)

قائدہ آیت : اس آیت میں جن بدکار مرد و عورت کا ذکر ہے، غیر شادی شدہ ہیں۔ کیونکہ شادی شدہ بدکار مرد اور عورت دونوں کے لیے حد "رجم" ہے۔ زنا کی اس سزا اور شادی و غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا میں فرق پر تمام صحابہ اور فقہائے امت کا اتفاق ہے یعنی امت کا اجماع ہے۔

(2) اس سزا کے نفاذ میں نرمی اور مداہنت ایمان کے منافی ہے، جب ایسا ہے تو جو لوگ سرے سے ان اسلامی سزاؤں کو (نعوذباللہ) وحشیانہ قرار دیتے ہیں ان کے دلوں میں ایمان کس درجے میں باقی رہے گا۔ بہرحال ایمان، دین میں صلابت و استقامت اور نفاذ احکام اسلام میں مخلصانہ و صدق دلانہ کوششوں کا متقاضی ہے۔

چوری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کو ایک مخزومی عورت (کے معاملے) نے، جس نے چوری کا ارتکاب کرلیا تھا، پریشانی میں مبتلا کر دیا تو انہوں نے (آپس میں) کہا "کون ہے جو اس عورت کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرے؟"

چنانچہ انہوں نے کہا کہ "اس کی جرات تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی کرسکتے ہیں۔"

چنانچہ حضرت اسامہ نے آپ سے گفتگو کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اسامہ! کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟؟"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا

"تم سے پہلے لوگوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں کوئی بلند رتبہ آدمی چوری کر لیتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور کوئی کمزور آدمی چوری کر لیتا تو اس پر حد قائم کر دیتے تھے' اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو ضرور میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا۔

"کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟؟"

تو حضرت اسامہ نے کہا "اے اللہ کے رسول! میرے لیے مغفرت کی دعا فرمایئے۔"

راوی حدیث بیان کرتے ہیں "پھر آپ نے اس عورت کی بابت حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

فوائد و مسائل : (1) حد' وہ سزا ہے جو شریعت کی طرف سے مقرر ہے' اس میں کسی کو کمی بیشی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے' جیسے چوری کی حد قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے' زنا کی حد سو کوڑے یا رجم ہے' شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہے' وغیرہ۔

(2) ان میں کسی کو سفارش کرنے کا بھی شرعاً حق حاصل نہیں ہے' اور نہ سفارش سے ان کی معافی ہی ممکن ہے۔

(3) نفاذ حدود میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ جو بھی قابل حد جرم کا ارتکاب کرے گا' وہ مرد ہو یا عورت' اس پر حد کا نفاذ ہو گا۔

(4) کوئی کتنا بھی بلند رتبہ ہو' حد سے مستثنیٰ نہیں' اقامت حد میں ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔

(5) گزشتہ امتوں کے احوال و وقائع سے عبرت و موعظت حاصل کرنی چاہیے تاکہ ایسے افعال سے اجتناب کیا جا سکے جو ان کی تباہی کا باعث ہوئے۔

(6) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کا مقام و مرتبہ ثابت ہوتا ہے۔

راستے' سایہ دار جگہ' پانی کے گھاٹوں اور اس قسم کی دیگر جگہوں میں قضائے حاجت کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں' پس تحقیق انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

فائدہ آیت : مذکورہ جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنا یقیناً "ایذا" کا باعث ہے اور مومنوں کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے' اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ جس طرح گرمی میں سایہ دار جگہ کی اہمیت ہے' سردی میں دھوپ والی جگہ وہی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے' اس لیے موسم کے اعتبار سے ان جگہوں کا غلط استعمال گناہ کا باعث ہو گا بشرطیکہ وہ دھوپ والی جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے ہو یا ان کی گزرگاہ ہو۔

دو کام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو لعنت کا سبب بننے والے کاموں سے بچو۔"

صحابہ نے عرض کیا "وہ لعنت والے دو کام کون سے ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ شخص جو لوگوں کے راستے میں یا ان کی سایہ دار جگہ میں قضائے حاجت کرے۔" (مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کاموں سے اجتناب ضروری ہے جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچے۔ مذکورہ جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے

تکلیف کے علاوہ یہ اندیشہ بھی ہے کہ ایسی جگہوں پر غلاظت و نجاست سے وبائی امراض پھوٹ پڑیں' اس لیے نظافت کے اعتبار سے بھی مذکورہ کاموں سے بچنا ضروری ہے۔

باپ کے' اپنی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کراہت کا بیان

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور جا کر عرض کیا "کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو بطور عطیہ ایک غلام دیا ہے' جو میرا تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔
"کیا تو نے اپنی سب اولاد کو اس کی مثل عطیہ دیا ہے؟"

انھوں نے کہا "نہیں۔"
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تب اسے اس سے واپس لے لو۔"

ایک اور روایت میں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔
"کیا تو نے ایسا اپنی تمام اولاد کے ساتھ کیا ہے؟"
انھوں نے کہا "نہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔"

چنانچہ میرے باپ واپس آئے اور وہ دیا ہوا صدقہ (عطیہ) واپس لے لیا۔

ایک اور روایت میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

"اے بشیر! کیا اس کے علاوہ بھی تیری اولاد ہے؟"
انھوں نے کہا۔ "ہاں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کیا تو نے ان سب کو اس کی مثل عطیہ دیا ہے؟"
انھوں نے کہا "نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تب تو مجھے اس پر گواہ مت بنا' اس لیے کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔"

ایک اور روایت میں ہے۔
"تو مجھے ظلم پر گواہ مت بنا۔"

ایک اور روایت میں ہے۔
"تو میرے علاوہ کسی اور کو اس پر گواہ بنا۔"
پھر فرمایا "کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ ساری اولاد تیرے ساتھ نیکی کرنے میں برابر ہو؟"
انھوں نے کہا۔
"کیوں نہیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر یہ کام نہ کر۔ (یعنی صرف ایک بیٹے کو عطیہ نہ دے۔) (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: (1) ہر اقدام کی بابت اہل علم اور ماہرین شریعت سے دریافت کیا جائے۔
(2) والدین کو چاہیے کہ وہ اولاد کے درمیان عدل و مساوات کا اہتمام کریں۔ کسی ایک بچے کے ساتھ ترجیحی سلوک سے دوسرے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور بعض دفعہ وہ اس ناانصافی سے تنگ آکر گھر چھوڑ جاتے ہیں' جس سے وہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں' والدین کے لیے بھی یہ چیز پریشانی کا باعث بنتی ہے اور خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔
(3) یہ حدیث ان علما کی بھی دلیل ہے' جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اولاد ذکور و اناث میں کوئی فرق نہ کرے بلکہ سب کو برابر کا حصہ دے۔

تین دن سے زیادہ میت پر سوگ

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس' جس وقت کہ

ان کے والد حضرت ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی وفات ہو چکی تھی' حاضر ہوئی۔ انہوں نے ایک خوشبو منگوائی' جس میں زرد رنگ کی خلوق یا کوئی اور خوشبو ملی ہوئی تھی۔ اس میں سے کچھ ایک لونڈی کو لگائی' پھر اسے اپنے رخساروں پر مل لیا اور کہا۔

"اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی کوئی حاجت نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا "کسی عورت کے لیے' جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہے' جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے' مگر خاوند پر چار مہینے دس دن سوگ کرنا جائز ہے۔"

حضرت زینب فرماتی ہیں کہ میں پھر حضرت زینب بنت حجش رضی اللہ عنہا کے پاس گئی جب کہ ان کے بھائی وفات پا گئے تھے۔ انہوں نے خوشبو منگوائی اور اس میں سے کچھ لگائی' پھر فرمایا۔

"خبردار' اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا۔

"کسی عورت کے لیے' جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہے' جائز نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے' مگر خاوند پر چار مہینے دس دن سوگ کرنا جائز ہے۔" (بخاری و مسلم)

اذان دینے والے کی فضیلت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اذان دینے والے قیامت کے دن دیگر تمام لوگوں سے لمبی گردن والے ہوں گے۔" (مسلم)

فوائد مسائل

اس سے' اذان کی فضیلت واضح ہے۔ اذان' اللہ کی عبادت اور خیر کی طرف بلانے کا نام ہے۔ جتنے لوگ موذن کی اذان سن کر نماز پڑھنے آئیں گے' موذن کو بھی ان سب نمازیوں کی نمازوں کے برابر ثواب ملے گا' کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "جو خیر کی طرف رہنمائی کرے گا تو اس کو بھی اس خیر کے عمل کرنے والے کی مثل اجر ملے گا۔" (صحیح مسلم' الامارۃ' حدیث: 1893) اسی لیے میدان محشر میں وہ تمام لوگوں میں ممتاز ہو گا کہ اس کی گردن سب سے لمبی ہو گی۔

اذان کی اہمیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان ہوا خارج کرتا ہوا پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے' تاکہ اذان کی آواز نہ سنے اور جب اذان پوری ہو جاتی ہے تو (واپس) آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تکبیر کہی جاتی ہے تو پھر پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے۔ پھر جب تکبیر پوری ہو جاتی ہے تو (پھر) آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اور اس کے نفس کے درمیان وسوسے ڈالتا ہے۔ کہتا ہے: فلاں چیز یاد کر' فلاں چیز یاد کر' وہ چیزیں جو اس سے پہلے اسے یاد نہ تھیں' یہاں تک کہ آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اسے پتا نہیں چلتا کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور اذان سے کراہت شیطان کا فعل ہے۔

2۔ دوسری بات' اس سے یہ معلوم ہوئی کہ نماز میں خشوع خضوع کا اہتمام ضروری ہے تاکہ شیطان کی وسوسہ اندازی کو ناکام بنایا جا سکے۔

اذان کا جواب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جس طرح موذن





کہتا ہے۔ پھر مجھ پر درود پڑھو' اس لیے کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے' اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر تم اللہ سے میرے لیے وسیلے کا سوال کرو۔ بے شک یہ جنت میں ایک بلند درجہ ہے۔ یہ اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ چنانچہ جو شخص میرے لیے وسیلے کا سوال کرے گا' اس کے لیے (میری) شفاعت حلال ہو جائے گی۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس وقت اس کے معنی رحمت و مغفرت کے' فرشتوں کی طرف ہو تو مغفرت طلب کرنے کے اور بندوں کی طرف ہو تو دعا کرنے کے ہوتے ہیں۔

2۔ وسیلہ کے لغوی معنی قرب کے ہیں' یا وہ طریقہ اور ذریعہ جس سے انسان اپنے مقصود تک پہنچ جائے۔ لیکن یہاں اس سے مراد جنت کا وہ درجہ ہے جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جائے گا۔

3۔ شفاعت کے معنی ہوتے ہیں۔ خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر کرنے کے یا کسی سے کسی کے لیے خیر کی درخواست کرنا۔ حدیث میں اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حق شفاعت ہے۔ جس کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی مغفرت کی درخواست کریں گے جن کی بابت اللہ کی طرف سے اجازت مل گئی۔

4۔ اس میں ایک تو اس امر کی ترغیب ہے کہ اذان سننے والا بھی کلمات اذان ادا کرتا رہے' البتہ حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ دوسرے' اذان کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور پھر دعائے وسیلہ' تو ایسے شخص کے لیے شفاعت واجب ہو جائے گی' بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان و توحید پر ہو۔

اذان کا جواب

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جس طرح موذن کہتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

گناہوں کی معافی

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے اذان سن کر کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ کے رب ہونے پر' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں تو اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" (مسلم)

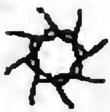
فوائد مسائل

1۔ اس میں دعائے وسیلہ کے علاوہ ایک اور دعا ہے' اسے بھی پڑھنا چاہیے۔

دعا کی قبولیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اذان اور تکبیر کے درمیان کی گئی دعا رد نہیں کی جاتی۔" (اس روایت کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن ہے۔)



گرجا گھر کا دربان

ابنِ انشا

پچھلے دنوں ہمارے مخدوم جناب سید ہاشم رضا نے کہ باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں' ہمیں یہ ایک کہانی سنائی اور ہم وہ کہانی آپ کو سناتے ہیں۔ تقریب اس کی یہ ہے کہ پچھلے دنوں ہماری دو نئی کتابیں چھپ کر آئی ہیں۔ بلکہ نواب تیس مار خاں کے کارناموں کو شامل کرکے جو قسطوں میں ان ہی کالموں میں چھپتے رہے ہیں۔ تین کہنا چاہیے۔ بہر حال یہاں جن دو کتابوں کا ذکر ہے۔ ان میں ایک تو سفرنامہ ہے "آوارہ گرد کی ڈائری" اور دوسری اردو کی آخری کتاب' اس "آخری کتاب" کی تعریف میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ ٹیکسٹ بورڈ نے اسے دیکھتے ہی نامنظور کر دیا ہے۔ یعنی یکسر رد کر دیا ہے۔ اس کتاب میں تاریخ' جغرافیہ' ریاضی' گرامر اور حکایات وغیرہ سب ہی کچھ ہیں اور آخر میں امتحانی سوالات کا پرچہ بھی دیا گیا ہے۔ سوالات تو اس میں آپ کی دلچسپی کے اور بھی بہت سے ہیں۔ مثلاً "پانی پت کی پہلی لڑائی کہاں ہوئی تھی؟ مثلث کے چاروں ضلعے برابر کیوں نہیں ہوتے؟ خط نستعلیق خط استوا اور خط وحدانی کا فرق بتاؤ۔ اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ کیا کیے تھے؟ وغیرہ
لیکن سید صاحب نے ہمیں وہ کہانی جس سوال کے جواب میں سنائی وہ یہ ہے۔
"یہ کہ تم ان پڑھ رہ کر اکبر بننا پسند کرو گے یا پڑھ لکھ کر اس کا نورتن؟"

* * *

راوی ہیں سید صاحب کہ ایک شخص ایک گرجا کا دربان تھا اور ایک زمانے سے چلا آرہا تھا کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس کا بڑا پادری مر گیا اور نیا پادری ایسا آیا جسے علم سے بہت محبت تھی۔ اس نے آتے ہی حکم دیا کہ جتنے ان پڑھ ملازمین اور متوسلین اس گرجا میں ہیں سب برخاست۔ دربان صاحب بہت گھبرائے اور عرض کیا کہ "حضور' ہمارے کام میں لکھنے پڑھنے کا کیا دخل ہے؟ ہمیں تو دروازے کی چوکیداری کرنی ہوتی ہے۔ لوگوں کے جوتے چھاتے ٹوپیاں وغیرہ لے کر رکھنی ہوتی ہیں۔ اب تک یہ نہیں ہوا کہ اس میں غلطی ہوئی ہو' یعنی ہم نے ایک کی ٹوپی دوسرے کو دے دی ہو۔ اپنے فیصلے پر نظرثانی فرمائیں۔"

لیکن نیا پادری چونکہ خود عالم فاضل تھا لہٰذا ان پڑھ ہونے کو ناقابل معافی جرم سمجھتا تھا۔ نہ مانا اور کہا "یہ رہی تمہاری تنخواہ' کل سے کام پر مت آنا۔"

کہانی یوں چلتی ہے کہ وہ شخص دل برداشتہ ہو کر گرجا سے نکل آیا۔ اور دفع الوقتی کے لیے اسے سگریٹ کی طلب ہوئی' سامنے کی گلی میں کوئی دکان نہ تھی۔ اگلی گلی میں بھی نہ تھی' ادھر ادھر کے چوک بھی خالی تھے۔ سگریٹ ملا لیکن کوئی آدھ میل دور جاکر۔ اس شخص نے سوچا کہ ایسے اور بھی لوگ ہوں گے جن کو سگریٹ کے لیے دور جانا پڑتا ہوگا کیوں نہ سگریٹ کا خوانچہ لگایا جائے۔

صاحبو! اس شخص نے گھوم پھر کر سگریٹ بیچنا شروع کی۔ اور چونکہ یہ ضرورت کی چیز تھی۔ اس کی اچھی خاصی بکری ہونے لگی۔ لوگ دور جانے کی زحمت سے بچ گئے۔ اس میں ایسی برکت ہوئی کہ اس نے گلی میں چھوٹی موٹی دکان کھول لی۔ پھر وہ دکان بڑی ہو گئی اور عملہ وملا بھی رکھنا پڑا۔ اور یہ شخص چند برس میں مالا مال ہو گیا۔ اس کے سگریٹ ایک قریبی بینک میں بھی جاتے تھے اور اس شاخ کے منیجر سے بھی اس کی صاحب سلامت ہو گئی تھی۔ ایک روز منیجر نے پوچھا



کہ۔ ”تم اپنے پیسے کس بینک میں رکھتے ہو۔“

اس شخص نے بتایا کہ ”کسی بینک میں نہیں بلکہ تکیے میں چھپا کر رکھتا ہوں۔“

مینیجر نے کہا کہ ”ان کو ہمارے بینک میں رکھو۔ چوری چکاری کا خطرہ بھی نہ ہو گا۔ اور سود بھی ملے گا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”لیکن میری ایک شرط ہے؟“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ میں کسی کاغذ یا چیک پر دستخط نہیں کروں گا۔“

منیجر نے بہت کہا لیکن وہ شخص اپنی شرط پر اڑا رہا۔

چونکہ کئی ہزار پونڈ کے ڈپازٹ کی بات تھی منیجر نے یہ عجیب غریب شرط مان لی۔

اس شخص نے کہا۔ ”کہ میں خود ہی جمع کرانے آیا کروں گا اور خود ہی نکلوانے آیا کروں گا۔ آپ میری شکل اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ نہیں تو میری تصویر کھنچوا رکھیں۔“

یوں یہ سلسلہ بہت دن تک چلتا رہا۔ ایک روز منیجر نے اس سے کہا کہ ”بیٹھو بیٹھو! چائے پی کر جانا۔“

وہ بیٹھ گیا۔

منیجر نے کہا۔ ”آپ کی شرط تو ہم نے مان لی لیکن آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں۔ دستخط کرنے سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ بس چیک پر دستخط کرکے بھیج دیا کیجیے۔ سب ہی کرتے ہیں۔ بڑا آسان کام ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”لیکن مجھے دستخط کرنا کہاں آتا ہے۔ میں تو سراسر ان پڑھ ہوں۔“

منیجر بہت متعجب ہوا اور کہنے لگا۔ ”میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے اکنامکس کا گریجویٹ ہوں اور میری تنخواہ یہ ہے۔ آپ کی آمدنی ان پڑھ ہونے کے باوجود میری تنخواہ سے چار گنا زیادہ ہے۔ اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو جانے کیا ہوتے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”میں بتاتا ہوں کہ پڑھا لکھا ہوتا تو کیا ہوتا۔ میں سامنے کے گرجا کا دربان ہوتا۔“

☆

باتیں حنا الطاف سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"حنا الطاف۔ پٹھان فیملی سے تعلق ہے میرا۔"

2 "پیار کا نام؟"

"حنو، حنی" اور میرے کزن "ہنی" بلاتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"

"2 جنوری 1999ء، کراچی۔"

4 "قد بغیر ہیل کے / ستارہ؟"

"5 فٹ 2 انچ اور کیپری کورن۔"

5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"

"دو بڑے بھائی اور میں، تیسرا نمبر۔ آخری۔"

6 "تعلیمی میدان؟"

"ابھی کالج پار لیا ہے۔ اب بیچلر کروں گی۔"

7 "شادی۔۔۔؟"

"ابھی تو سوچا بھی نہیں ہے۔"

8 "شوبز میں آمد؟"

"سو فیصد اپنے ٹیلنٹ سے آئی ہوں۔ کسی نے ہاتھ نہیں پکڑا۔"

9 "شوبز کی پہلی کمائی؟"

"اٹھارہ ہزار اور بہت مزے سے خرچ کیا تھا۔"

10 "اس فیلڈ کی برائی؟"

"یہاں بہت دوغلے لوگ ہیں۔ اچھے لوگوں کی بہت کمی ہے۔"

11 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"بہت عجیب سوال ہے۔۔۔ میری صبح تو اگر کوئی کام نہ ہو تو بارہ بجے ہوتی ہے۔"

12 "اور رات؟"

"رات۔۔۔ رات کے دو تین بجے یا جب نیند آجائے۔"

13 "بارہ بجے اٹھ کر کیا کرتی ہیں؟"

"پانی پیتی ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ جب میں صبح اٹھوں تو ڈیڑھ لیٹر کی پانی کی بوتل غٹاغٹ پی جاؤں۔"

14 "گھر والوں کی کوئی بات، جو بری لگتی ہو؟"

"جب گھر سے نکلنے لگو تو پوری ڈیٹیل پوچھتے ہیں کہ کہاں جا رہی ہو۔ شو کب آئے گا۔ تم کب گھر واپس آؤ گی، وغیرہ وغیرہ۔"

15 "تہوار کون سے پسند ہیں۔ قومی یا مذہبی؟"

"دونوں تہوار ہی پسند ہیں۔ قومی تہوار میں جوش و جذبہ بہت ہوتا ہے۔ شو کرنے میں بھی بہت مزا آتا ہے۔ خوب ہلا گلا رہتا ہے۔"

16 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

17 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"بستر پر لیٹ جاتی ہوں اور امی کو پکار پکار کر کہتی ہوں کہ کچھ کھانے کو دے دیں۔ بے ہوشی والی حالت ہو رہی ہے۔"

18 "ناشتا ضروری ہے؟"

"بالکل جی بہت ضروری ہے۔ میں تو ناشتے کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی۔ ڈرائیور کو انتظار کروالوں گی، مگر ناشتا نہیں چھوڑوں گی۔"

19 "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"

"اپنی سالگرہ کے دن کا۔"

20 "تھکن میں بھی کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔۔۔ گھر، گھر اور صرف گھر، بہت پرسکون جگہ ہے۔"

21 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"اس طرح کہ جس کی خوشی ہوتی ہے وہ حیران ہو رہا ہوتا

ہے کہ ہم سے زیادہ تو اسے خوشی ہو رہی ہے۔ شو میں بھی ذکر کر رہی ہوتی ہوں۔"

22 "طبیعت میں ضدی پن ہے؟"

"گھر والوں کے لیے بہت ضدی ہوں گھر سے باہر اچھی بچی ہوں۔"

23 "دوسروں پہ غصہ کب آتا ہے؟"

"جب کوئی اوور سیانا بنتا ہے کہ ہمیں تو یہ بھی آتا ہے وہ بھی آتا ہے اور اندر سے ہوتے ہیں بالکل کھوکھلے۔"

24 "غصے میں کیفیت؟"

"خاموش ہو جاتی ہیں۔ زیادہ بحث نہیں کرتی۔ بہت حساس ہوں۔"

25 "لڑکوں میں کیا بات اچھی ہونا چاہیے؟"

"کہ وہ لڑکیوں کی عزت کریں اور نہ صرف ان کے سامنے بلکہ ان کی غیر موجودگی میں بھی عزت کریں۔"

26 "لڑکوں میں کیا بات بری لگتی ہے؟"

"ان کا نزدیک بن جانا یعنی لگائی بجھائی کرنا غیر موجودگی میں برائیاں کرنا مجھے یہ بات بہت بری لگتی ہے۔"

27 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"نظر انداز کر دیتی ہوں۔ اٹھ کر چلی جاتی ہوں' جواب نہیں دیتی۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی اور ابو کے۔"

29 "کس ملک کی شہریت پسند ہے؟"

"برطانیہ.... لیکن اپنے ملک کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

30 "شاپنگ میں پہلے کیا خریدتی ہیں؟"

"کپڑے' کپڑے.... کرتے۔"

32 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"بہترین نغمہ "دعا" کا تحفہ ہے۔"

33 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"

"یہ خرچ ہو گیا۔ اب پتا نہیں اگلا چیک کب ملے گا۔"

34 "کس شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"



"مجھے آمنہ شیخ کے ساتھ شام گزارنے اور ملنے کا بہت شوق ہے اور صنم بلوچ کے ساتھ بھی۔"

35 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"

"اگر کوئی میرے کام کی تعریف کرے۔"

36 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں یا ابھی نہیں؟"

"آنکھ کھلتے ہی پہلے فون ہاتھ میں لے کر ایس ایم ایس اور مس کالز چیک کرتی ہوں اور پھر تھوڑی دیر لیٹی رہتی ہوں۔"

37 "مخلص کون ہوتے ہیں۔ اپنے یا پرائے؟"

"اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ مگر صرف والدین اور بہن بھائی۔"

38 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"

"کوئی مخصوص جگہ نہیں۔ کبھی گھر تو کبھی دوست کے یہاں۔"

39 "پسندیدہ لباس؟"

"شلوار قمیص۔"

40 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"

41 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً "دیتی ہیں؟"
"دوستوں کے۔"
42 "بور ہو رہی ہوں تو کیا کرتی ہیں؟"
"ٹی وی دیکھتی ہوں۔ میوزک سنتی ہوں' ریسرچ کرتی ہوں۔ ریڈنگ کرتی ہوں۔ بہت سے کام ہیں۔"
43 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں... اگر کوئی تنگ کرے تو پھر اسے بلاک کر دیتی ہوں۔"
44 "اچانک مہمان آجائیں تو؟"
"تو کوئی بات نہیں۔ مجھے برا نہیں لگتا۔"
45 "اگر آپ حکومت میں آگئیں تو کیا کریں گی؟"
"عورتوں کے حقوق کے لیے بہت کام کروں گی۔"
46 "کیا چیزیں جمع کرتی ہیں؟"
"کپڑے اور میک اپ جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔"
47 "نصیحت کوئی کرے تو؟"
"تو برا نہیں لگتی اور ابھی تک کسی نے کوئی ایسی نصیحت نہیں کی جو مجھے بری لگے۔"
48 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
"مجھے تو سب سے اچھا دور یہی لگ رہا ہے۔ جبکہ بچپن کو لوگ اچھا دور کہتے ہیں۔"
49 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"آپ تو جانتی ہی ہیں' بالکل بھی نہیں۔ سب کو یہی شکایت ہے۔"
50 "کن لوگوں پر خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
"دوستوں پہ اور فیملی پہ بھی۔"
51 "اپنی کمائی سے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنے منہ پہ لگانے والی کریم... خاصی مہنگی ہوتی ہے۔"
52 "ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانے کا مزا آتا ہے؟"
"نہیں جا کر کھانا کھانا پسند نہیں کرتی بلکہ آرڈر کر کے گھر منگوا لیتی ہوں۔"
53 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا لینا پسند کریں گی؟"
"ولی مستی کا زی۔"
54 "ڈرامے کے کردار انسان کی شخصیت کے کتنے قریب ہوتے ہیں؟"
"کردار کا انسان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بس ہم کردار کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ ہم تعلق بناتے ہیں۔"
55 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت زیادہ ہے۔ اپ ڈیٹ رہتی بھی ہوں اور رکھتی بھی ہوں۔ خاص طور پہ سوشل میڈیا میں۔"
56 "کون سا کھانا بہت اچھا پکا لیتی ہوں؟"
"دو منٹ والے نوڈلز بہت اچھے بنا لیتی ہوں۔"
57 "نرم دل کون ہوتا ہے... مرد یا عورت؟"
"عورت۔"
58 "بہترین شیف کون ہوتا ہے مرد یا عورت؟"
"مرد... میرے گھر میں زیادہ اچھا میرے والد پکاتے ہیں۔"
59 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان میں کیا لینا چاہتی ہیں؟"
"تمنہ شیخ کو... اور لندن کا ریٹرن ٹکٹ اور اچھے سے ہوٹل میں قیام مانگوں گی۔"
62 "کس قسم کے لوگ برے لگتے ہیں؟"
"دو غلے قسم کے اور ایسے لوگ جو آپ کو صرف اس لیے اپنا دوست بناتے ہیں کہ آپ کو دس لوگ جانتے ہیں تاکہ سب کو بتا سکیں کہ ان سے ہماری دوستی ہے۔"
63 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی..."
64 "شادی میں تحفہ دینا اچھا لگتا ہے یا کیش؟"
"تحفہ... مجھے تحفہ دینے کا بہت شوق ہے اور خوب صورت پیکنگ کے ساتھ۔"
65 "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"ناشتا امی کے ہاتھ کا اور کھانا زیادہ تر ابو کے ہاتھ کا پسند ہے۔"
66 "کس سیلبریٹی سے ملنے کا شوق ہے؟"

"پاکستان میں آمنہ شیخ سے اور بالی ووڈ میں پریانکا چوپڑا ہے۔"

67 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"کبھی نہیں۔"

68 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں جاتی؟"
"سیل فون، میک اپ کا سامان اور پانی۔"

69 "پاکستان کے لیے تم کیا سوچتی ہوں؟"
"اچھا سوچتی ہوں اور امید ہے کہ آئندہ چند سالوں میں ہماری فلم انڈسٹری بہت ترقی کرے گی۔"

70 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"اچھی تو یہ کہ لوگوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں اور بری یہ کہ بہت حساس ہوں اور سوچتی بہت ہوں۔"

71 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"جی فوراً۔"

72 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"غصے میں تو نہیں ہاں دکھ میں ضرور چھوڑا ہے۔"

73 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"مجھے آپ سے بات نہیں کرنی چلیں جائیں آپ۔"

74 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے کیا؟"
"نہیں نہیں لیٹتے ہی تو کبھی بھی نیند نہیں آتی۔"

75 "شہرت کب زحمت بنتی ہے؟"
"جب آپ اسے سر پر چڑھا لیں۔"

76 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"پانی اور موبائل... سائیڈ ٹیبل کو بھرنے کا شوق نہیں ہے۔"

77 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"یوں تو ساری دنیا خوب صورت ہے اور اس دنیا کو مزید حسین والدین بناتے ہیں۔"

78 "زندگی بری لگتی ہے جب؟"
"کبھی نہیں یہ تو بہت بڑی نعمت ہے۔ اسے کبھی برا نہیں کہوں گی۔"

79 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"
"اچار... اور کیچپ... یہ نہ ہوں تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

80 "ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟"
"کبھی منایا ہی نہیں۔"

82 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"بہت چڑ ہوتی ہے۔ بہت زیادہ چڑ ہوتی ہے۔"

83 "اپنے گھر والوں سے کس چیز کا ایوارڈ لینا چاہتی ہیں؟"
"اپنی کارکردگی کا۔ بحیثیت بیٹی کے۔ یعنی بہترین بیٹی کا ایوارڈ لینا چاہتی ہوں۔"

85 "اپنی شخصیت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"ویسے تو کچھ نہیں لیکن میں میچور ہونا چاہتی ہوں۔"

86 "ڈھیر ساری دولت ہاتھ آجائے تو؟"
"تو ضرورت مندوں میں تقسیم کردوں گی۔"

87 "اپنے آپ میں انرجی کب محسوس کرتی ہیں؟"
"جب اپنا شو کر رہی ہوتی ہوں۔"

88 "گھر آکر فوری طور پر کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ میرے ہاتھ میں کوئی پانی کی بوتل رکھ دے اور کھانا دے دے۔"

89 "کیا موبائل سروس آف ہونی چاہیے؟"
"نہیں بالکل نہیں۔ انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔"

90 "سینما میں پہلی فلم کب دیکھی تھی؟"
"جب میں بہت چھوٹی تھی تو دو فلمیں سینما میں لگی تھیں ایک ٹائی ٹینک اور گوروزیلا۔ میں نے گوروزیلا دیکھی تھی۔"

91 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"میں فقیر کو ایسے ہی پیسے نہیں دیتی کوئی کھانے کی چیز دے دیتی ہوں یا کوئی ایسا بچہ جو کچھ بیچ رہا ہے مگر میرے کام کی بھی نہیں تو میں خرید کر اس کی مدد کر دیتی ہوں۔"

92 "زندگی میں کیا کر گزرنے کی خواہش ہے؟"
"فلم میں کام کرنے کی بہت خواہش ہے۔"

☆





نازیہ خاتون

خط بھیجنے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

صومیہ ناہید۔۔۔ احمد ال

آج ہی خواتین ڈائجسٹ ملا۔ ابھی پڑھا تو کیا دیکھا بھی نہیں پر اس بار مجھے کہانیوں پر تبصرہ کرنا بھی نہیں ہے' مجھے تو بس اپنی تمام رائٹرز سے ایک چھوٹی سی بات پوچھنی ہے۔ آج کل ایک چینل پر ڈرامہ آرہا ہے مجھے وہ ڈرامہ بہت پسند ہے۔ خیر اس ڈرامے میں جو لڑکی ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتی ہے جب اس کے رشتے کی بات چلتی ہے تو بہت جلد یہ اس کو صرف اس وجہ سے لوگ پسند نہیں کرتے کہ وہ ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتی ہے۔ تو کیا ہماری تمام رائٹرز کو بھی اس صورت حال کا سامنا ہوا یا وہ صرف ڈرامے میں ہی تھا؟ اور اس ڈرامے میں مدیرہ کا رویہ بھی بہت عجیب سا تھا۔ رائٹرز یہ سب کیسے برداشت کرتی ہیں؟

ج : پیاری صومیہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈرامے اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دوسرے ہر رائٹر اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق لکھتا ہے جہاں تک ہماری مصنفین کا تعلق ہے تو ہمارے دل میں اپنی رائٹرز کا بے حد عزت اور احترام ہے بلکہ ہم ان سے دلی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔ وہ ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ نہ صرف ان رائٹرز کی جو ہمارے ہاں لکھتی ہیں بلکہ ان تمام تخلیق کاروں کی بھی جنہوں نے مختلف' کہیں بھی لکھا ہے۔ تخلیقی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نہایت قیمتی عطیہ ہے جو ہر ایک کو عطا نہیں ہوتا۔ ہر ماہ ہمیں جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قارئین بھی ان سے بہت محبت رکھتی ہیں۔ ہمارے پاس جو خطوط اور فون آتے ہیں ان میں ہر عمر کی خواتین اور لڑکیاں شامل ہیں۔ وہ خواتین بھی جو پہلے شمارے سے خواتین ڈائجسٹ کی قاری ہیں اور ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ وہ ہمیں فون کرکے مصنفین کی نہ صرف تعریف کرتی ہیں بلکہ انہیں دعائیں بھی دیتی ہیں۔ اور جہاں تک رشتہ نہ ہونے کی بات ہے تو ہماری زیادہ تر مصنفین شادی شدہ ہیں اور ان کے سسرال والے اور شوہر ان کی اور ان کی صلاحیتوں کی بے حد قدر بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے جس رائٹر نے یہ ڈراما تحریر کیا ہے' انہیں اس قسم کا کوئی تجربہ یا مشاہدہ ہوا ہو۔

مسز ثوبیہ عمران۔۔۔ راولپنڈی کینٹ

ماہ جنوری کے خواتین ڈائجسٹ کے شمارے کے مکمل ناول "عہد الست" میں جس قرآنی آیت کا ذکر کیا گیا ہے اسے پارہ 9' سورۃ 8 میں بتایا گیا ہے جبکہ دراصل یہ آیت سورۃ نمبر 7 میں ہے۔ چونکہ ہماری مقدس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس لیے میں نے تصحیح ضروری سمجھی۔

ج : ثوبیہ! بے حد شکریہ آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی کی' یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہماری قارئین بہت باشعور اور باعلم ہیں اور وہ ہماری خامیوں کی بروقت نشان دہی کرکے تصحیح کرنے کا موقع دیتی ہیں۔ ہم اس سہو کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

آمنہ طالب۔۔۔ لاہور

میں پچھلے چار سالوں سے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ عمیرہ احمد' سمیرا حمید' عنیزہ سید' راحت جبیں اور فاخرہ جبیں میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اکثر نئی رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں۔ مگر کئی نو وارد رائٹرز تو پتا نہیں کس کلاس کی کہانیاں لکھتی ہیں۔

پاکستان میں بمشکل پانچ یا دس فیصد ایسے امیر اور ہائی کلاس گھرانے ہوں گے۔ جہاں مشرقی اصولوں کی پاس داری کی جاتی ہے۔ مگر آج کل ہر رائٹر کی کہانی کی ہیروئن مشہور بزنس ٹائیکون کی بیٹی ہونے کے باوجود سر سے دوپٹا نہیں اتارتی اور کبھی اکیلی گھر سے باہر نہیں جاتی۔

ہر دوسرے ناول کا ہیرو آکسفورڈ یونیورسٹی سے پڑھ کر آیا ہوتا ہے مگر اتنے مغربی ماحول میں رہنے کے باوجود کبھی کسی لڑکی سے افیئر نہیں چلاتا۔ ایسے امیر لڑکے اور لڑکیاں صرف آپ لوگوں کی کہانیوں میں ہی مل سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آج کل بہت سی رائٹرز کی کہانیوں میں یہ رجحان چل پڑا ہے کہ ہیرو ہیروئن کو اغوا کرلیتا ہے۔ ایسے مرد پتا نہیں کون سی دنیا میں پائے جاتے ہیں جو اغوا کرنے کے باوجود لڑکی کو ہاتھ تک نہ لگائیں۔ اس سب کے باوجود بھی ہیروئن ہیرو کی محبت میں ڈوب جاتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کو تو ویسے ہی ڈوب مرنا چاہیے جو عزت نفس کی پروا نہیں کرتیں۔

رائٹرز ایک فینٹسی سے بھرپور کہانیاں لکھ کر نوجوان لڑکیوں کو حقیقت سے بھاگنا سکھا رہی ہیں۔ جو اپنے دماغ میں ایسے ہیروز کو آئیڈیلائز کرتی ہیں اور حقیقت کا سامنا نہیں کرپاتیں۔

ج: پیاری منہ! ہماری قارئین کو تو ہم سے یہ شکایت ہے کہ ہم کہانیوں میں ضرورت سے زیادہ تلخ حقائق پیش کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ہمارے ہاں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں' وہ زیادہ تر حقیقی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں ایک آدھ کہانی ایسی بھی سہی جو تھوڑی دیر کے لیے ہمیں اردگرد کی تلخیوں سے دور لے جائے' تلخ حقائق سے تنگ آکر تھوڑی دیر کے لیے خوابوں کی دنیا میں پناہ لے لی جائے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں۔ ایسی سچائی کس کام کی جو انسان کو مایوس اور زندگی سے ہی بیزار کردے۔

نرگس نور' شکیلہ نور۔۔۔ لالہ موسیٰ

سب سے پہلے آب حیات پڑھا۔ سالار کی حالت دیکھ کر بہت مزہ آیا۔ بہت اچھا لکھا ہے عمیرہ آپی نے نبیلہ رمضان کا مرکب وفا بھی بہت اچھا تھا۔ باقی ناولٹ اور افسانے بھی اچھے تھے۔ مکمل ابھی پڑھا نہیں۔

ج: نرگس اور شکیلہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ آئندہ تمام کہانیوں پر تبصرہ لکھیے گا۔

اقرا ملک۔۔۔ گوجرانوالہ

افسانے تینوں ہی اچھے تھے نیلم سعدی گل نے کیا افسانہ لکھا' مزہ آگیا! ڈیئر عفت آپ کہانی بڑی اچھی طرح سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ ریکویسٹ ہے کہ وہ ان لوگوں کا انٹرویو بھی کریں جن کا تعلق ادب سے ہے مجھے عمران ڈائجسٹ پچھلے سال کے خریدنے ہیں تو کیا کروں۔

ج: پیاری اقرا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خطوط شامل نہ ہوسکے۔ پچھلے سال کے عمران ڈائجسٹ منگوانے کے لیے آپ 700 روپے اس ایڈریس پر منی آرڈر کردیں۔

عمران ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی

اپنا ایڈریس صحیح اور صاف لکھیں۔

ایمن تحریم۔۔۔ سرگودھا

"آب حیات" دیکھا جب پہلی مرتبہ فہرست میں تو سمجھ میں نہ آیا کہ خوش ہونا چاہیے یا غمگین۔ پیر کامل پانچ بار پڑھ چکی ہوں ایک ایسا مکمل اور شاندار ناول محسوس ہوتا تھا جس میں کسی سیکوئل یا پری کوئل کی کوئی گنجائش نکلتی دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ اب جبکہ اس کا دوسرا حصہ آچکا ہے تو پہلے تو بہت ہی مشکل لگا اس کو آگے جاری رکھنے کا سوچ کے۔ کیونکہ وہ جو تھا جیسا تھا پرفیکٹ تھا۔ مگر پہلی قسط پڑھی تو اس نے بہت الجھا دیا۔ یہ نہیں کہ اچھی نہیں تھی یا سمجھ میں نہیں آئی۔ مطلب دل کی جس مسند پر پیر کامل ہے' اس کو ایک امیچیور جنس ٹائپ والی اسٹوری کے طور پر قبول کرنے پر دل بالکل آمادہ نہ ہوا' خیر دوسری قسط سے کہانی پھر امامہ اور سالار کے گرد ہی گھوم رہی ہے پہلے کی طرح تو وہ پڑھ کر اچھا لگتا ہے مگر جو لڑکی پاسٹ کو ہاتھ دکھاتی ہے اگر وہ امامہ ہی ہے تو یہ اچھی بات نہیں۔ عمیرہ جی آپ نے پہلے ہی ان دونوں کو جن مشکلات کے بعد اور ایک طویل عرصے کے بعد ایک کیا تھا' اب کسی دوری کی گنجائش نہیں بنتی۔ پلیز ان کو جدا مت کیجیے گا۔ نہ ان کو ماریے گا نہ ان کو بوڑھا کرکے ان کے بچوں کی اسٹوری چلائیے گا۔ نمرہ جی بہت اچھی لکھ رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین کہانی ہے۔ ہر ہر لفظ بہت خوب

صورتی سے لکھا گیا ہے۔ اس میں پلیز فارس کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا اور نہ زمر کو ماریے گا۔ پلیز پلیز۔ اس کے علاوہ بن مانگی دعا بھی اچھی ہے۔ مگر رفتار بڑھایئے۔

ج: پیاری امین! طویل عرصہ بعد آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیوں کو ختم کرے اور آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آب حیات قطعاً" اشیلی جنس ٹائپ اسٹوری نہیں ہے اور عمیرہ احمد اپنے اتنے اچھے اور مقبول کرداروں کے ساتھ کچھ برا بھی نہیں کرنے جارہی ہیں' جہاں تک پیر کامل کا دوسرا حصہ لکھنے کا سوال ہے اس میں شک نہیں پیر کامل اپنی جگہ مکمل تھا لیکن سالار اور امامہ دونوں ہی غیر معمولی کردار تھے۔ امامہ نے جتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور سالار جتنی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا' ان کی آئندہ زندگی ایک عام سے انسان کی طرح تو نہیں گزر سکتی تھی۔ انہیں زندگی میں کچھ چیلنجز کا سامنا تو کرنا تھا۔ اسی لیے عمیرہ نے پیر کامل کا دوسرا حصہ لکھا اور آپ یقین رکھیں کہ عمیرہ آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔

ماہم علی ۔۔۔ اٹک

ٹائٹل کچھ خاص نہ لگا۔ عمیرہ آپی کا ناول بہت فٹ جارہا ہے۔ نبیلہ رمضان کا ناولٹ پڑھ کر میرا بھی دل کررہا ہے افریقہ جانے کو۔ اس بار بہترین کہانی مجھے شاہجہان گل کی لگی۔ کہانی سے زیادہ ڈائیلاگ بہت اچھے تھے۔ افسانے بھی سارے کے سارے اچھے تھے۔ اب آتے ہیں سب سے زیادہ پسندیدہ ناول بن مانگی دعا کی طرف مجھے یہ ناول بہت پسند آیا۔ ابیہا پر بہت ترس آتا ہے ان کے ساتھ بھی اب کچھ اچھا کردیں۔ نمل بھی ٹھیک ٹھاک جارہا ہے۔ ایک درخواست ہے۔ FM ۔ 101 کے ڈی جی رضوان علی کا انٹرویو کریں۔

ج: پیاری ماہم! خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا' یہ جان کر خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

حمیرا قریشی ۔۔۔ لاہور

عمیرہ احمد زبردست ناول لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ بن مانگی دعا بھی بہت بہتر انداز میں سفر طے کررہا ہے۔

ج: حمیرا! ہمیں افسوس ہے آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔

ثوبیہ پروین ۔۔۔ بصیرپور

جنوری کے شمارے میں مجھے سب سے زیادہ نبیلہ رمضان کا ناولٹ مرگ وفا پسند آیا۔ باقی سلسلے وار ناول سب ہی اچھے تھے مگر عمیرہ احمد کے ناول کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔

ج: پیاری ثوبیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ نبیلہ رمضان نئی مصنفہ ہیں لیکن انہوں نے بہت پر اثر اور خوب صورت انداز میں لکھا' ہمیں بھی اچھا لگا ان کا ناولٹ۔

فوزیہ ثمرہ بٹ' آمنہ میر ۔۔۔ گجرات

سب سے پہلے آب حیات کو پڑھا۔ واہ کیا بات ہے اس بار قسط خاصی مزیدار اور رومینٹک رہی۔ یہ امامہ کو سالار کا پیار سمجھ اور نظر کیوں نہیں آرہا۔ حالانکہ جن حالات سے وہ گزر کر آئی ہے' امامہ کو سمجھ داری آجانی چاہیے۔ سالار بے چارے کا کیا قصور' عمیرہ جی امامہ کو تھوڑی بہت رومانس کی سمجھ دیں ناں۔

اور ہاں تحریر میں اداکاری پیر کامل کسی بھی کچھ کچھ باتیں ایڈ کرتی رہیں دوسرا مکمل ناول عہد الست اس میں مجھے زارا اور نیپو کا کردار اچھا لگتا ہے۔ پہلی بارش میں موہ لینے والی تحریر۔ مرگ وفا نبیلہ رمضان کی کہانی انوکھی اور دلچسپ رہی' خواتین کی تمام تحریروں سے ہٹ کر تھی یہ تحریر اور اچھی لگی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ نما نواب کے بارے میں جان کر بے چینی ہوئی۔ ہائے وقت کی ستم ظریفی کیسے چہرے مرجھا گئے۔ حقیقت ہے' وقت بھی کسی کا نہیں ہوا۔

خط آپ کے تمام قارئین بہنوں کے تبصرے لاجواب تھے۔ شانہ عندلیب' ثوبیہ نور کا تفصیلی تبصرہ پسند آیا۔ نفسیاتی الجھنیں۔ یہ سلسلہ اچھا لگتا ہے حیرت ہوتی ہے۔ ذہنی مسئلہ کوئی ہوتا نہیں اور زندگی کو مشکل سے مشکل بناتے ہیں۔

ج: پیاری فوزیہ! عمیرہ احمد ان مصنفین میں سے ہیں جو کردار کے ہر پہلو پر نظر رکھتی ہیں اور لکھتے ہوئے کردار کی نفسیات کو مدنظر رکھتی ہیں۔ امامہ ان کی کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ آپ کے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے ہیں'

یقین رکھیں کہ آگے چل کر ان کے جواب آپ کو مل جائیں گے۔ امامہ کو سالار کا پیار نظر آرہا ہے لیکن وہ جن حالات سے گزری ہے اور ماضی میں سالار کو جیسا دیکھا ہے اس کی وجہ سے وہ بار بار بے یقینی کا شکار ہو جاتی ہے۔

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالہ

میں آٹھ سال سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہوں' کچھ سال پہلے نائزہ افتخار کا ناول پڑھا تھا جس کا نام تھا روگ یقین جانیے یہ ناول آج بھی میرے ذہن پہ نقش ہے میری فیورٹ رائٹرز نمرہ بخاری' راشدہ رفعت' عنیقہ محمد بیگ' ثروت نذیر' راحت جبیں اور آسیہ رزاقی ہیں۔

ج : پیاری عظمیٰ! آپ نے پہلی بار خط لکھا۔ آپ کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ اس بار شعاع میں شامل ہے۔ آپ کی یہ تمام پسندیدہ رائٹرز ہمیں بھی بہت پسند ہیں لیکن ٹی وی چینلز کی مصروفیت میں وہ ہمیں بھول گئی ہیں۔ آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں۔

حنا سلیم اعوان' کنزیٰ شاہین اعوان گاؤں آخون ہانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

سمجھ نہیں آرہا کہ کن الفاظ سے اپنے خط کا آغاز کروں۔ کہ 2014ء جاتے جاتے بھی ایک اور گہرا زخم ہمارے دلوں کے حوالے کر گیا ہے۔ اس المناک سانحے کا ذکر کرتے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں۔۔۔ کیسے کیسے اپنے غم کا اظہار کروں۔

مداوا کیسے کیا جائے ان کے دکھ کا جنہوں نے اپنے ہنستے کھیلتے' مسکراتے جوان بچے گنوائے ہیں۔ جن کی گودیں ویران ہیں۔ وہ کتنا ہیں۔

کوئی مجھے یہ بتائے آخر ان کا قصور ہی کیا تھا۔ ان معصوموں کو بے رحم موت کے حوالے کرتے ان ظالموں کے دل کیوں نہ کانپے؟ ننھے جسموں کو گولیوں سے اتنی درندگی سے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارتے انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ایک دن اللہ کے حضور بھی حاضر ہونا ہے۔

ج: حنا اور کنزیٰ! پشاور کے اس سانحے نے ہم سب کا دل ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کس کس سانحہ پر غم کریں' لگتا ہے دل کی جگہ درد ہی رہ گیا ہے۔

وہ معصوم بچے جو آج بھی ڈرون حملوں کا نشانہ بن رہے ہیں جو بموں سے جل کر کوئلہ بن جاتے ہیں جن کی شناخت بھی ممکن نہیں۔

ان دس لاکھ افراد کے دکھ اور تکلیف کا اندازہ کون لگا سکتا ہے کہ جو کھلے آسمان تلے' موسم کی سختیاں' جھیل رہے ہیں' بھوک اور افلاس کا شکار ہیں' مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں۔

ان کے دکھوں کا مداوا کون کرے گا۔ اللہ کے سوا کسی سے امید نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان ظالموں کو دنیا میں عبرت کا نشان بنا دے جو معصوم بچوں کو' خواتین کو نشانہ بناتے ہیں اور ہمیں ان سے نجات دے۔ آمین

کنیز فاطمہ۔۔۔ بورے والا وہاڑی

"کرن کرن روشنی" "عہد الست" "آب حیات" کمال۔ کہانی تیزی سے آگے رواں دواں ہے' عمیرہ آپی نے میاں بیوی کے رشتے کے نازک احساسات کو بڑی باریک بینی اور خوب صورتی سے لفظوں کے پیرہن میں ڈھالا (خدا کرے بڑوں کو کچھ عقل آجائے پڑھ کے) مجھے جس نقطے نے قلم اٹھانے پہ مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ ناول کی اس قسط میں ایک جگہ شادی کو دنیا کا سب سے بے ہودہ کام کہا گیا۔

ناول میں دوسری بات جو بار بار کھٹک رہی ہے۔ وہ امامہ کا سالار کو "آپ" کے بجائے تم کہنا ہے (پہلے سے آپ اس بات پر خوب ہنسیں) میاں بیوی میں دوستی اور بے تکلفی' محبت اپنی جگہ لیکن شوہر کا رشتہ جس احترام کا متقاضی ہوتا ہے اس کے مطابق یہ لفظ تم' نامناسب لگتا ہے یہ ہم سب

اعتذار

عہد الست قرآن پاک کی سورۃ نمبر 7 الاعراف کی آیت نمبر 172 میں ہے۔ جنوری کے شمارے میں سورۃ کا نمبر غلط شائع ہو گیا۔ اس سہو کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور معافی کے خواستگار اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔
ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے خط لکھ کر یا فون کر کے ہماری غلطی کی نشان دہی کی۔

نزنز کی متفقہ رائے ہے' صرف رائے ہے اعتراض نہیں وہ بھی معذرت کے ساتھ کیونکہ ہم نے تو آج تک کسی پڑھی لکھی باشعور عورت کو شوہر کے لیے "تم" کا صیغہ استعمال کرتے نہیں سنا چاہے وہ اس سے عمر میں کچھ کم ہی کیوں نہ ہو۔

خواتین ڈائجسٹ اور شعاع سے ہمیں اور بھی بہت سی شکایتیں ہیں جن کے سبب ہمارا دل اس پرچے کا پہلے کی طرح مشتاق نہیں رہا۔

نفسیاتی الجھنیں میں بہن سعدیہ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا ان کے لیے تہہ دل سے دعا ہے کہ خدا ان کی مشکلیں دور فرمائے' آمین اور ان سے صرف اتنا کہوں گی کہ آپ ذکر و عبادت کی طرف توجہ بڑھائیں کیونکہ دلوں کا سکون صرف خدا کی یاد میں ہے۔

ج: پیاری کنیز! جب بھی کوئی کہانی پڑھیں تو کرداروں کو سامنے رکھیں۔ سالار اور امامہ کے درمیان شوہر اور بیوی کا رشتہ ہے' انتہائی قریبی اور اپنائیت کا رشتہ جہاں ناز بھی ہے اور نیاز بھی.... میاں بیوی کے درمیان جب کوئی کھٹ پٹ' گلے شکوے۔ کوئی میٹھی سی شکایت ہوتی ہے تو اسی قسم کے جملے بولے جاتے ہیں ان کا مقصود ناراضی کا اظہار ہوتا ہے دونوں میں سے ایک بھی دل سے ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا' جو اس کھٹ پٹ میں زبان سے ادا ہوتی ہیں۔ ان جملوں کو آپ ان دونوں کی نوک جھونک سمجھ کر پڑھیں کیونکہ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ امامہ شادی کو دنیا کا سب سے بے ہودہ کام سمجھتی تو شادی پر رضامند ہی نہ ہوتی اور سالار جس نے امامہ کو پاکر سب کچھ پالیا ہے۔ وہ کیسے اس بات پر اس سے اتفاق کر سکتا ہے کہ شادی دنیا کا سب سے بے ہودہ کام ہے۔

جہاں تک تم بولنے کا سوال ہے تو اکثر لوگ خود اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ انہیں آپ کہہ کر مخاطب کیا جائے انہیں تم میں زیادہ بے تکلفی اور اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ بقول شاعر

پیار جب حد سے بڑھا' سارے تکلف مٹ گئے
آپ سے تم ہوئے اور پھر تو کا عنواں ہوگئے

پاکیزہ ہاشمی ـــــ بھلوال پور

اس ماہ نمبرون مرگ وفا تھی۔ معیز کے فیصلہ نے دل خوش کردیا۔ آب حیات میں میرا خیال ہے کہ تاش کے پتوں میں سالار اور امامہ کی زندگی میں آنے والے واقعات ہیں۔

ج: پاکیزہ! ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو' لیکن عمیرہ کی کہانیوں میں اندازہ لگانا آسان نہیں ہوتا' وہ ہمیشہ حیران کردیتی ہیں۔ سالی سامنے آئے گی تو پتا چلے گا آپ کا اندازہ کتنا درست ہے۔

تیرا خان ـــــ ملتان

میں نے آپ سے ایک سوال ملالہ کے حوالے سے کیا تھا۔ کیا وہ مرزائی ہے۔؟ آپ نے جواب نہیں دیا۔ اب آتی ہوں ڈائجسٹ کی طرف سب سے پہلے "مکمل" پڑھا۔ نمرہ احمد کی تحریر بہت متاثر کن ہے۔ اس دفعہ کی قسط بہت اچھی تھی۔ عمیرہ احمد کے آب حیات کی تو کیا بات ہے۔ عمیرہ سے درخواست ہے پلیز سالار کو مارنے سے بچیے گا جس طرح سالار امامہ کا خیال رکھ رہا ہے' اس سے تو یہی لگتا ہے کہ شاید سالار قتل ہو جائے۔

"بن مانگی دعا" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا "عہد الست" اچھی اور عمدہ تحریر ہے مگر اس میں کہیں کہیں الجھن ہے ناول اگرچہ بہت اچھا ہے لیکن کہیں کچھ کمی ہے۔ بعض حصہ ناول کا اتنا گہرا ہے کہ انسان اس میں کھو سا جاتا ہے اور حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور بعض حصہ میں کنفیوژن پائی جاتی ہے۔

مجھے قلم اٹھانے پر جس چیز نے مجبور کیا ہے وہ ہے "نبیلہ رمضان" کا ناولٹ "مرگ وفا" اتنا مختصر اور اتنا جامع۔ بہت اچھا ناولٹ تھا۔ کہانی کے اختتام نے تو رلا دیا۔ نبیلہ رمضان کو اتنی عمدہ تحریر لکھنے پر مبارک باد۔

عائشہ فیاض کا "اصلی ہنر" افسانہ لاجواب تھا صبا خان کے افسانے "فریب" کے بھی کیا کہنے۔ دوری کا طلسم بھی اچھا افسانہ تھا۔

ناولٹ بھی سب اچھے تھے خاص طور پر پہلی بارش۔ آخر میں عدنان کی نفسیاتی ازدواجی الجھنیں پڑھیں۔ ان سے بہت اچھا سبق ملتا ہے بشرطیکہ ہم ان سے سیکھنا چاہیں تو یہ ہمارے ہی مسائل کا حل ہوتے ہیں۔

کیا رخسانہ نگار عدنان کا ان عدنان سے کوئی رشتہ ہے یا محض اتفاق ہے اب اجازت دیں۔

ج: پیاری سمیرا! آپ کے سوالوں کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ ہمیں خود اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ رخسانہ نگار عدنان کا ان عدنان صاحب سے کوئی رشتہ نہیں ہے، جو نفسیات کے کالم میں آپ کی الجھنوں اور مسائل کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

افشاں خان۔۔۔ نامعلوم شہر

ہمانواب سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ مکمل ناول میں "نمل" کے بارے میں کیا کہوں۔ نمرہ احمد کا تو نام ہی کافی ہے۔ لاجواب تحریر ہمیں یقین ہے ان کے باقی ناولوں کی طرح یہ بھی "امر" ہو جائے گا۔ ناول میں "بن مانگی دعا" بہت اچھا جا رہا ہے۔ افسانوں میں "بنجر" بازی لے گیا۔
ج: پیاری افشاں! آپ کے پیارے بھتیجے محمد وصی کی آمد پر مبارک باد اور دعائیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شائستہ نور۔۔۔ لاہور

میں تقریباً پندرہ سالوں سے آپ کے رسالوں کی قاری ہوں۔ شادی کے بعد سے میں اور میری ساس دونوں آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔
سب سے پہلے عمیرہ احمد کے "آب حیات" کی تعریف کروں گی۔ پلیز امامہ اور سالار کے ساتھ کچھ برا نہ کریں۔ عفت سحر کا بن مانگی دعا بھی اچھا جا رہا ہے۔ سب سے زبردست نمرہ احمد کا "نمل" ہے۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ، ماضی اور حال کا جوڑ قابل تعریف ہے زمر کا کردار بہت جاندار ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد ہمیں سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود زمر سے ہمدردی ہے "عہد الست" کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔
ایک شکایت بھی ہے، اتنی زبردست لکھاریوں کے درمیان نبیلہ رمضان کا ناولٹ "مرگ وفا" بہت غیر تعمیری، ڈرامائی اور بچکانہ تحریر تھی۔
ج: پیاری شائستہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے نبیلہ رمضان کی کہانی آپ کو پسند نہیں آئی لیکن ہماری بیشتر قارئین نے اسے بہت پسند کیا۔

عائشہ وحید۔۔۔ گوٹھ میلو بیلو شکر گڑھ

ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے اور سب لکھاری بہنوں سے جو مسلسل اس گناہ کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ عزوجل کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ ہر دوسری تحریر میں ہیرو یا ہیروئن کی تعریف میں بے دھڑک لکھ دیا جاتا ہے۔ "وہ اتنا حسین ہے لگتا ہے قدرت نے اس کو فرصت سے بنایا ہو گا خود اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو گا" نعوذ باللہ کیا اس قادر مطلق کو فرصت کی ضرورت ہے؟ کیا وہ فرصت کا محتاج ہے؟ وہ اللہ وہ قادر مطلق جو کن کہہ دے تو زمین و آسمان بن جائیں وہ کن کہہ دے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ اسے ہماری لکھاری بہنوں نے فرصت کا محتاج بنا دیا۔ سوچیے یہ شرکیہ کلمہ نہیں ہے کیا؟ خدارا کچھ سوچیے۔ لکھتے وقت تو میرے ہاتھ بھی کانپ اٹھے کہ کہیں ہم خدا کے عذاب کی لپیٹ میں نہ آ جائیں یاد رہے جب قہر خداوندی آتا ہے تو ہر نیک و بد اس کی لپیٹ میں آتا ہے۔

عروج فاطمہ۔۔۔ کراچی

خواتین کے تمام سلسلے ہی اپنی مثال آپ ہیں اور تمام لکھاری بہنیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ایک بات کہوں آپ سے آج کل کی تمام کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں لیکن ان میں کچھ لو اسٹوری نہیں ہوتی۔ تھوڑا بہت رومانس بھی تو ہونا چاہیے نا۔
پیاری عروج! افسانہ مل گیا ہے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اپنا ناول بھجوا دیں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کی اس بات سے ہم بھی متفق ہیں کہ کہانیوں میں دلچسپی کا عنصر ضرور ہونا چاہیے۔

مسز یمن اجمل۔۔۔ لاہور

آج جو اتنی جلدی میں خط لکھ رہی ہوں اس کی وجہ نبیلہ رمضان کا "مرگ وفا" ہے۔ پہلی لائن سے جو کہانی نے اپنی گرفت میں لیا تو آخر تک سانس روک کر پڑھی۔ تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے۔
اس کے علاوہ "نمل" وری گریٹ۔ نمرہ کی کہانیوں کا بدل ہی نہیں۔ "بن مانگی دعا" ہلکی پھلکی رومانٹک تحریر ہے مزہ آ جاتا ہے پڑھ کر۔
ایک اہم بات اور۔ پلیز آپ اپنی رائٹرز سے کہیں کہ وہ

اپنی کہانی کے ذریعے ایک پیغام لوگوں کو ضرور دیں کہ مسجدوں میں خدارا انڈین گانوں کی طرز پر نعتیں نہ پڑھیں۔

ج: نبیلہ! آپ کا پیغام رائٹرز اور نعت خوانوں تک پہنچا رہے ہیں اور ساتھ اتنا اضافہ بھی کر رہے ہیں کہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر نعتیں نہ پڑھیں بے ادبی کا ـــــ احتمال ہوتا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عنبر عرفان ـــــ سیالکوٹ

نگہت سیما کا "تیسرا دروازہ" اور نگہت عبداللہ کا "اک کھڑکی مگر کھلی ہے" ابھی "کہاں تک پہنچا ہے۔ "عہد الست" بہترین بہترین۔۔۔۔ تنزیلہ کی تصویر دکھادیں۔ "نمل" کچھ خاص نہیں "بن مانگی دعا" کب بھی بن مانگی دعا کب تک چلے گا۔ اب ختم بھی کردیں۔ ٹائٹل بس سو سو تھا۔

ج: عنبر! آپ ون سے ناول کتابی شکل میں پڑھنا چاہتی ہیں۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔ تنزیلہ کی تصویر شائع ہو چلی ہے۔ عہد الست مکمل ہونے پر تنزیلہ کا انٹرویو شائع کریں گے اور انہوں نے تصویر شائع کرنے کی اجازت دی تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

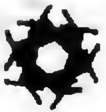
ثنا عابد ـــــ نارووال

دسمبر کے شمارے میں شامل تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ ایک بات ایمان داری سے کہوں گی کہ مجھے سب ہی کہانیاں پڑھ کے وہ چاہے افسانے ہوں، ناول یا ناولٹ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں بیزار ہوئی یا وقت ضائع کیا کیونکہ ہر کہانی اپنے اندر مثبت پہلو رکھتی ہے۔

ناولٹ بہت اچھا لگا" افسانوں میں میمونہ صدف کی کہانی "دو زیست کو" زیادہ پسند آئی اور سلسلہ وار ناولز تو سب ہی "آب حیات" پڑھا۔ پڑھنے کا مزا آیا۔ بیسٹ اینڈ چھوڑا

تھا" نمل "میں حنین اور زمر کے کرداروں کو بہت مس کیا نیو تم۔ اس ناول کا بڑا انتظار تھا۔ آخر میں "عہد الست" کے بارے میں میرے حساب سے تو یہ کہانی جہاں تک ابھی پہنچ گئی ہے بہت دلچسپ اور توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ سب سے زیادہ مزہ اس ناول کا آرہا ہے۔ سنا تھا کہ عمیرہ احمد نمرہ احمد دونوں بہنیں ہیں کیا یہ سچ ہے۔

ج: ثنا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔



قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتی ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی

میری خاموشی کو بیاں مل جائے

ادارہ

نمرہ کشور ...... میلسی

(1) نام ہے ہمارا نمرہ کشور' رہتے ہیں میلسی میں۔ تعلیم بی اے' مشاغل ہیں پڑھنا اور گھر کے کام کاج۔

(2) "خواتین" سے تعلق آٹھ سال پرانا ہے' جب میں آٹھویں کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پہلے تو بے قاعدہ سا تعلق تھا' مگر اب باقاعدہ پڑھتے ہیں اور بھی اتنے خوش ہیں جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو' لیکن جو پچھلے پرچے میں نہیں پڑھ سکی۔ ان کے سلسلے میں جان کھا جاتی ہوں اپنی کزنز اور دوستوں کی اور کان کھا جاتی ہوں اپنے بھائی کے۔

تمہیں کسی لڑکی سے سامنا ہو جائے تو پوچھتی ہوں۔ "رسالے پڑھتی ہو؟" میری سہیلیاں کھینچ کے مجھے لے جاتی ہیں۔ "تمہارا جی نہیں بھرتا۔"

دو کوٹہ میں میری چچا زاد بہنیں رہتی ہیں' چاچی کا میکہ کہوڑ پکا ہے۔ وہاں سے پرانے رسالے دو کوٹہ آتے ہیں' پھر میرے پاس' مہوش کہتی ہے واہ اپنا مال تو بڑی دور دور سے سپلائی ہوتا ہے۔ ایک برانچ دو کوٹہ' ایک کہوڑ پکا۔ بہت ساری کہانیاں ہیں جو ابھی پڑھنی ہیں' دعا کرتی رہتی ہوں کہیں سے دستیاب ہو جائیں۔ فیورٹ رائٹر' فیورٹ ترین کہیں جسے وہ ہیں نمرہ آپی (نمرہ احمد) موسٹ فیورٹ' انیسہ سلیم بے انتہا اچھا لکھتی ہیں۔ آج کل ان کی یاد میں تو ہم آہیں ہی بھرتے ہیں "ترک رسوم" کو حفظ کر چکے ہیں' میں اور میرا بھائی۔ واپسی کی دعائیں مانگتے ہیں اور افسانے ثمینہ عظمت علی کے پڑھ کر جھوم جھوم جاتا ہے دل' عائشہ فیاض کی تحریروں کا انتظار رہتا ہے۔ سمیرا حمید اتنا پیارا لکھتی ہیں کہ چھپکے سے' آکے ہماری دعاؤں میں شامل ہو گئی ہیں اور سائرہ رضا کی تحریریں تو ہمیں ارد گرد سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ غزنہ نگار اور کرنزئی بہت شدت سے یاد آتی ہیں۔ کیا افسانے لکھتی ہیں واہ۔

ہمیں جو رائٹرز اور تحریریں پسند ہیں ان کی فہرست طویل ہے' سب ہی پسند ہیں ان کی تحریروں سے ان کے اندر کی اچھائی' لگن اور گہرا تجزیہ جھلکتا ہے۔ رائٹرز کی شان میں کچھ کہنا بساط سے باہر کی بات محسوس ہوتی ہے۔ سعدیہ رئیس کی تحریریں ہمارے معاشرتی رویوں کی بھرپور عکاس ہوتی ہیں۔ ان کی تحریر "آہٹوں کے سراب" بھول نہیں پائی۔ سحر ساجد بہت زبردست لکھتی ہیں' مگر کم کم نظر آتی ہیں۔ لاتعداد تحریریں ہیں' اسباق سے بھرپور' ذہن و دل پر نقش۔ رہنما ہیں' کچھ سکھاتی ہیں' ڈراتی ہیں' ڈھارس بندھاتی ہیں۔ ہماری زندگیوں میں بہتری لانے کا بہت سارا کریڈٹ رائٹرز کو جاتا ہے۔ تہہ دل سے شکر گزار ہوں ادارے کی' رائٹرز و ایڈیٹرز کی۔

(3) خوبیاں۔ یہ تو دوسرے ہی بہتر بتا سکتے ہیں اروبا کہتی ہے میں بہت اچھی دوست ہوں' بہت ہی اچھی۔ مہوش کے نزدیک کیئرنگ ہوں اور عروب نے تو اتنی ساری خوبیاں بتا دی ہیں کہ لگتا ہے مجھ سے اچھی لڑکی تو اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ عروب کہتی ہے مجھے تمہاری کوئی بات ذرا سی بھی بری نہیں لگتی اروبا نے وہ خامی گنوائی کہ میرا دل جل کے خاک ہو گیا۔ "تم موٹی ہو۔" مہوش کہتی ہے۔ "تم بڑی بہت رہتی ہو۔"

اب میں اپنی خامیاں خود بتاتی ہوں۔ جھگڑتی ہوں

بہت زیادہ۔ ویسے تو نیند کی رسیا نہیں ہوں' مگر جب سوتی ہوں تو بے ہوشوں کے بھی کان کتر جاتی ہوں۔ اتنا غفیل ہے۔ لگل بے سدھ۔ لگے ہاتھوں ایک اور بات بھی بتاتی چلوں' امی کہتی ہیں میں یوں چلتی ہوں جیسے اب گری کہ تب ہاہاہا۔ یعنی چلتے چلتے لہرا جاتی ہوں اور کبھی میرا دوپٹہ دروازے سے لپٹ جاتا ہے یا قمیص کا دامن فریج کی چوکی میں پھنس جاتا ہے' اور نہیں تو چلتے چلتے چارپائی کو دھکا ضرور لگا جاتی ہوں اور میری قسمت۔ اس چارپائی پر عموماً" امی ہی تشریف فرما ہوتی ہیں' پھر ان کی گھوری اور میری کھسیاہٹ۔ غصہ بڑی جلدی آتا ہے اور منٹوں میں ہوا بھی ہو جاتا ہے۔ ظلم سے نفرت ہے' ظالم لوگوں سے بھی۔ آنسو میری سب سے بڑی کمزوری ہیں اپنے بھی اور دوسروں کے بھی۔ احسان کر کے بھول جاتی ہوں اور دوسروں کا احسان

کبھی نہیں بھولتی۔ اور سب کو معاف کر دینا میری نظر میں میری بہت اچھی عادت ہے' لیکن کیا کروں جو لوگ دوسروں کو ناحق ستاتے ہیں وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ کتابیں زندگی بدل دیتی ہیں حتیٰ کہ فطرت و عادت بھی تبدیل ہونے لگتی ہے۔ مجھ میں ضد تھی' انا تھی' لیکن اب شکر ہے دونوں رخصت ہو گئی ہیں۔ سمجھوتا اب مشکل نہیں لگتا۔

(4) سالگرہ تو کبھی نہیں منائی نہ اٹینڈ کی۔ میری ڈائری میں سب کی ڈیٹس آف برتھ لکھی ہیں' لیکن شاید ہی کسی کو ٹائم پہ وش کیا ہو۔ مجھے اپنی سالگرہ بھی کبھی یاد نہیں رہتی۔

(5) شعر۔ پلیز پلیز ایک شعر اور ایک اقتباس پر اکتفا کرنے والے ہم نہیں ہیں لطیفہ نہیں لکھتے مگر شعر اور اقتباس دو' دو لکھیں گے۔ مختار صدیقی اور میر کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

نقطہ وروں نے ہم کو سمجھایا' خاص رہو اور عام بنو
محفل محفل صحبت رکھو' دنیا میں گمنام رہو

وضو کا مانگ کر پانی شرمندہ نہ کر میر
وہ مفلسی ہے کہ تیمم کو گھر میں خاک نہیں

(6) اقتباس۔ پسندیدہ ترین ناول "جنت کے پتے" سے:

"چیزیں وقتی ہوتی ہیں' ٹوٹ جاتی ہیں' رشتے دائمی ہوتے ہیں صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔"

انیسہ سلیم کے ناولٹ راکھ یا کندن سے:

"تمہارے غم ہمارے دل کو راکھ بنا دیتے ہیں یا کندن۔ دل راکھ ہو جائے تو بے مول' بے وقعت اور اگر کندن بن جائے تو بے انمول۔"

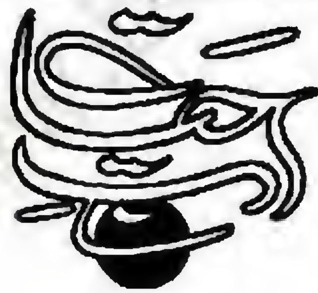
سمیرا حمید "یارم" میں اتنی خوب صورت بات کہہ گئی ہیں کہ میں اسے لکھے بنا رہ نہیں پائی۔

"اور انسان تو وہی ہے نا جو اپنی خود نمائی بے شک کرتا پھرے' لیکن دوسرے کی خامی کی پردہ پوشی ہر حال میں کرے اور ایسے انسان' انسانوں کے ڈھیر میں اب کہاں ملتے ہیں۔"

(7) پسندیدہ ترین کتاب قرآن پاک ہے۔ اب ترجمے کے ساتھ غور سے پڑھتی ہوں۔ تفسیر قرآن پڑھنے کی خواہش ہے' لیکن ابھی دستیاب نہیں ہے۔ "جنت کے پتے" کو کبھی نہیں بھول سکتی انتہائی منفرد ناول۔ نمو آپی! اللہ آپ کو دنیا و آخرت میں کامیاب کرے۔ "سیرت النبی قدم بہ قدم" عبداللہ فارابی کی تحریر کردہ سیرت النبی کی کتاب بے حد پسند ہے' بے حد سادہ اور جامع انداز میں واقعات زندگی رسول اللہ قلمبند کیے گئے ہیں اور میرے کورس کی تمام کتابیں "جنت کا منظر" نسیم حجازی کی "آخری معرکہ" یہ ہی پڑھی ہیں۔ دستیاب نہیں ہوتی نا! اپنی فیورٹ رائٹرز کے فیورٹس کو پڑھنے کی تمنا ہے اور نمرہ احمد کی فیورٹ کتابوں کو پڑھنے کی خواہش۔

اچھا جی! میری خاموشی کو بہت لمبی زبان مل گئی ہے یہ نہ ہو کہ کاٹ دی جائے تو اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

عمیرہ احمد



آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایرِ رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام ترمکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں ان میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

آ۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادی۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے، مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر بقیہ ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ سے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی، اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثرانداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخرکار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہوگا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آب حیات

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو نو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے۔ امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے۔ سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان، طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ سی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار، امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط، سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً "روتے ہوئے وہی بتاتی ہے جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں۔ پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو، کسی اور سے نہ کرنا، ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا، وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے کر آتا ہے، جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید خفا ہوتے ہیں۔

چوتھی قسط

"السلام علیکم پاپا!" اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگز رکھتے ہوئے اس نے پاس آتے ہوئے سکندر عثمان سے ہمیشہ کی طرح یوں گلے ملنے کی کوشش کی تھی جیسے وہ ان ہی کی دعوت اور ہدایت پر وہاں آیا ہے۔
سکندر عثمان نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں منع کیا تھا نا؟"
"جی۔" سالار نے بے حد تابعداری سے اس سوال کا جواب دیا۔
سکندر عثمان کا دل چاہا کہ وہ اس کا گلا دبا دیں۔
"کیسے آئے ہو؟" چند لمحوں کے بعد انہوں نے اس سے اگلا سوال کیا۔
"ٹیکسی پر۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا۔
"ٹیکسی اندر لائے تھے؟"
"نہیں گیٹ پر ہی اترے ہیں۔" وہ نظریں جھکائے بے حد سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔
"تو سسرال والوں کو بھی سلام کر آتے۔" وہ اس بار چپ رہا۔ جانتا تھا نہ یہ سوال ہے نہ مشورہ۔
"بیٹا! آپ کیسی ہیں؟" اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے وہ اب امامہ کی طرف بڑھ آئے تھے۔ ان کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی اور سکندر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ سکندر کے سوال کا فوری طور پر جواب نہیں دے سکی۔
"سفر ٹھیک رہا؟" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے حد شفقت سے پوچھا تھا "اور طبیعت ٹھیک ہے؟ چہرہ کیوں اتنا سرخ ہو رہا ہے؟"
سکندر نے بھی اس کی آنکھوں کی نمی اور پریشانی کو محسوس کیا تھا۔
"جی۔ وہ۔ سردی۔" وہ اٹکی۔
"سردی کی وجہ سے۔ السلام علیکم امی! کیسی ہیں آپ؟" سالار نے بیگ دوبارہ کھینچتے ہوئے پہلا جملہ سکندر سے کہا اور دوسرا دور سے آتی ہوئی طیبہ کو دیکھ کر جو اسے دیکھ کر جیسے کراہی تھیں۔
"سالار! کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی؟ کچھ تو احساس کیا کرو۔" وہ اب ان سے گلے مل رہا تھا۔
"کچھ نہیں ہوتا امی!" اس نے جواباً کہا۔
"طیبہ! امامہ کو چائے کے ساتھ کوئی میڈیسن دیں اور اب اس ڈنر کو تو رہنے ہی دیں۔" سکندر اسے ساتھ لگائے ہوئے اب طیبہ سے کہہ رہے تھے۔ طیبہ اب سالار کو ایک طرف کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئیں۔
"کیا ہوا امامہ کو؟"
"کچھ نہیں۔ میں۔ ٹھیک ہوں۔" اس نے مدافعانہ انداز میں طیبہ سے ملتے ہوئے کہا۔
"آپ لوگ ڈنر پر جائیں ہماری پروا نہ کریں۔ ہم لوگ کھا لیں گے جو بھی گھر میں ہے۔" سالار نے سکندر سے

کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس وقت نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یقیناً گھر میں اس وقت ڈنر کی کوئی تیاری نہیں کی گئی ہو گی۔
سکندر نے اس کی بات سننے کی زحمت نہیں کی۔ انہوں نے پہلے انٹر کام پر گارڈز کو سیکیورٹی کے حوالے سے کچھ ہدایات کیں' اس کے بعد ڈرائیور کو کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانے کی کچھ ڈشز لکھوائیں اور خانساماں کو چائے کے لیے بلوایا۔

"پلیز پاپا! آپ ہماری وجہ سے اپنا پروگرام کینسل نہ کریں' آپ جائیں۔" سالار نے سکندر عثمان سے کہا۔
"تاکہ تم پیچھے سے ہمارے لیے کوئی اور مصیبت کھڑی کر دو۔"
وہ سکندر کے جملے پر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی نے سکندر کو کچھ اور برہم کیا۔ امامہ اگر اس کے پاس نہ بیٹھی ہوتی تو سکندر عثمان اس وقت اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دیتے۔
"جب میں نے تم دونوں سے کہا تھا کہ فی الحال یہاں مت آنا تو پھر... امامہ! کم از کم تمہیں اسے سمجھانا چاہیے تھا۔"
سکندر نے اس بار امامہ سے کہا تھا جو پہلے ہی بے حد شرمندگی اور حواس باختگی کا شکار ہو رہی تھی۔
"پاپا! امامہ تو مجھے منع کر رہی تھی' میں زبردستی لایا ہوں اسے۔" امامہ کی کسی وضاحت سے پہلے ہی سالار نے کہا۔
سکندر نے بے حد خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی اولاد میں سے کسی نے آج تک ان کے منہ پر بیٹھ کر اتنے فخریہ انداز میں ان کی بات نہ ماننے کا اعلان نہیں کیا تھا۔
سالار سے مزید کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے ملازم سے سامان ان کے کمرے میں رکھنے کے لیے کہا۔ اس سارے معاملے پر سالار سے سنجیدگی سے بات کرنا ضروری تھا' لیکن اکیلے میں۔
سالار کے کمرے میں آتے ہی امامہ مقناطیس کی طرح کھڑکی کی طرف گئی تھی' اور پھر جیسے سحرزدہ سی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے اس کے گھر کا بایاں حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے گھر کا اوپر والا حصہ۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں۔ وسیم کے کمرے کی کھڑکیاں۔ دونوں کمروں میں روشنی تھی لیکن دونوں کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ کوئی ان پردوں کو ہٹا کر اس وقت اس کی طرح آ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو اسے آرام سے دیکھ لیتا۔ پتا نہیں پہچانتا بھی یا نہیں۔ وہ اتنی تو نہیں بدلی تھی کہ کوئی سے پہچان ہی نہ پاتا۔ اس کے اپنے خونی رشتے تو... پانی سیلاب کے ریلے کی طرح سب بند توڑ کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ یہ کب سوچا تھا اس نے کہ کبھی اپنی زندگی میں وہ دوبارہ اس گھر کو دیکھ سکے گی۔ کیا ضروری تھا کہ یہ سب کچھ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ ہوتا۔
وہ بے حد خاموشی کے ساتھ اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے نظر آنے والے اس گھر کو دیکھا اور پھر امامہ کی آنکھوں سے بہنے والے پانی کو۔ اسی خاموشی کے ساتھ اس نے امامہ کے کندھے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے جیسے اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے سر کو چوما۔
"وہ میرا کمرا ہے۔" بہتے آنسوؤں کے ساتھ امامہ نے اسے بتایا۔
"جہاں سے تم مجھے دیکھا کرتی تھیں؟" وہ بہتے آنسوؤں کے بیچ ہنس پڑی۔
"میں تمہیں نہیں دیکھتی تھی سالار!" اس نے احتجاج کیا تھا۔
سالار نے اس کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور مجھے پتا تک نہیں تھا کہ یہ تمہارا کمرا ہے۔ میں سمجھتا تھا' یہ وسیم کا کمرا ہے۔ میں تو کپڑے بھی یہیں بدلا

کرتا تھا۔" سالار کو کچھ تشویش ہوئی۔
"مجھے کیا پتا تم کیا کرتے تھے۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں تو بند ہوتی تھیں۔"
"کیوں؟" سالار نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔
"تم شارٹس میں پھرتے تھے بیڈ روم میں اس لیے۔ اور تمہارے خیال میں، میں کھڑکیاں کھلی رکھ سکتی تھی۔ تمہیں کوئی شرم ہی نہیں تھی۔ تم کیسے اس طرح اپنے بیڈ روم میں پھرلیتے تھے۔"
وہ اب آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس پر خفا ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے آرام سے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹائی تھی۔
"تم کس طرح کے انسان تھے؟"
سالار نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔
"تمہیں کھانے کا کہنے آیا تھا۔ تم چینج کرلو تو چلتے ہیں۔" اس نے یک دم بات بدلتے ہوئے امامہ سے کہا۔ اس نے سالار کے تاثرات نہیں دیکھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے نظر آنے والا گھر دیکھ رہی تھی۔



وہ تقریباً" دو بجے کمرے میں آیا اور اس کا خیال تھا کہ امامہ سو چکی ہوگی مگر وہ ابھی بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھر کی لائٹس اب آف تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا تھا۔
"سو جانا چاہیے تھا تمہیں امامہ!" اس سے نظریں ملنے پر سالار نے کہا۔
وہ کھڑکیوں کے آگے ایک کرسی رکھے دونوں پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔
"سو جاؤں گی۔"
"وہاں سب سو چکے ہیں، دیکھو لائٹس آف ہیں سب بیڈ رومز کی۔"
وہ دوبارہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔
سالار چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر واش روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد کپڑے تبدیل کرکے وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔
"امامہ! اب بس کرو۔ اس طرح دیکھنے سے کیا ہوگا؟" بیڈ پر لیٹے لیٹے اس نے امامہ سے کہا۔
"میں نے کب کہا کہ کچھ ہوگا۔ تم سو جاؤ۔"
"تم وہاں بیٹھی رہوگی تو مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔"
"لیکن میں یہیں بیٹھوں گی۔" اس نے ضدی انداز میں کہا۔
سالار کو اس کی ضد نے کچھ حیران کیا۔ چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔
"امامہ! تم اگر بیڈ پر آکر لیٹو گی تو یہاں سے بھی تمہارا گھر نظر آتا ہے۔" سالار نے ایک بار پھر کوشش کی تھی۔
"یہاں سے زیادہ قریب ہے۔"
وہ اس بار بول نہیں سکا۔ اس کے لہجے میں موجود کسی چیز نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ چند گز کا فاصلہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ اس کا گھر نہیں تھا۔ چند گز کی نزدیکی اس کے لیے بہت تھی۔ وہ نو سال بعد اس گھر کو دیکھ رہی تھی۔

"ہمارے گھر کے اوپر والے فلور میں ایک کمرا ہے' اس کمرے کی کھڑکیوں سے تمہارے گھر کا لان اور پورچ تک نظر آتا ہے۔" وہ لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

امامہ یک دم کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

"کون سا کمرا...؟ مجھے دکھاؤ۔" اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"دکھا سکتا ہوں اگر تم سو جاؤ' پھر صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔" سالار نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"میں خود بھی جا سکتی ہوں۔" وہ بے حد خفگی سے سیدھی ہو گئی۔

"اوپر والا فلور لاکڈ ہے۔" امامہ جاتے جاتے رک گئی۔ وہ یک دم مایوس ہوئی تھی۔

"سالار! مجھے لے کر جاؤ اوپر..." وہ پھر اس کا کندھا ہلانے لگی۔

"اس وقت تو نہیں لے کر جاؤں گا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تمہیں ذرا سی بھی محبت نہیں ہے مجھ سے؟" وہ اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔

"ہے' اسی لیے تو نہیں لے کر جا رہا' صبح وہاں جانا۔ تمہاری فیملی کے لوگ گھر سے نکلیں گے۔ تم انہیں دیکھ سکتی ہو۔ اس وقت کیا نظر آئے گا تمہیں؟" سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ویسے بھی مجھے نہیں پتا کہ کمرے کی چابیاں کس کے پاس ہیں' صبح ملازم سے پوچھ لوں گا۔" سالار نے جھوٹ بولا۔

اوپر کا فلور مقفل نہیں تھا لیکن امامہ کو روکنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کچھ مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کی طرف جانے لگی۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اوپر فلور میں تب ان لاک کرواؤں گا' اگر تم ابھی سو جاؤ۔"

وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں بیڈ کے اس طرف سوؤں گی۔"

سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس نے کمبل ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنا دی تھی۔

"اور میں لائٹس بھی آن رکھوں گی۔" وہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ اب کراؤن سے ٹیک لگائے دونوں گھٹنے سکیڑے بیڈ پر بیٹھی کھڑکی کو دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے روشنی میں نیند نہیں آئے گی۔" سالار نے کمبل سے اس کے پاؤں اور ٹانگیں ڈھانپتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو روشنی میں ہی نیند آتی تھی۔" وہ کچھ جز بز ہو کر بولی۔

"اب اندھیرے میں آتی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو پھر مجھے روشنی میں ہی نیند آتی ہے۔" سالار نے اپنی مسکراہٹ روکی۔

"تمہیں ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی نیند کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔" مصنوعی غصے کے ساتھ سالار نے کچھ آگے جھکتے ہوئے سائیڈ ٹیبل لیمپ اور دوسری لائٹس آف کرنی شروع کر دیں۔

امامہ خفگی سے بیٹھی رہی لیکن اس نے سالار کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کمرا اب نیم تاریک تھا لیکن بیرونی روشنیوں کی وجہ سے امامہ کا گھر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔

"اس طرح دیکھنے سے کیا ہو گا؟" سالار اب کچھ جھلا گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کوئی پردے ہٹا کر کھڑکی میں کھڑا ہو۔"

وہ خواہش نہیں تھی' آس تھی اور وہ اس کی آس کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

"صبح گاؤں جانا ہے ہمیں۔" وہ اب اس کی توجہ اس کھڑکی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"مجھے نہیں جانا' مجھے یہیں رہنا ہے۔" امامہ نے دوٹوک انکار کیا۔ سالار کا اس کی توقع تھی۔
"تمہیں گاؤں لے جانے کے لیے لے کر آیا تھا۔" سالار نے کچھ خفگی سے کہا۔
"تم جاؤ' مجھے کسی گاؤں میں دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

سالار یک دم کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ سے اٹھا اور اس نے پردے برابر کر دیے۔ باہر سے آنے والی روشنی بند ہوتے ہی کمرا ایک دم تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں لیٹتے ہوئے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ سالار کے جگانے سے کھلی۔ سحری ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے اٹھ کر سب سے پہلے کھڑکی کے پردے ہٹائے تھے۔ سالار نے اسے کچھ ہمدردی سے دیکھا۔ وہ انٹرکام اٹھا کر خانساماں کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ رہا تھا۔ امامہ کے کمرے میں لائٹ آن تھی لیکن کھڑکیوں کے آگے اب بھی پردے گرے ہوئے تھے۔

اسے جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ جب تک وہ کپڑے تبدیل کرکے اور منہ ہاتھ دھو کر آئی تب تک خانساماں کھانے کی ٹرالی کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانا ختم کرتے ہی امامہ نے کہا۔
"اب چابیاں لے لو' اوپر چلیں۔"
"مجھے نماز پڑھ کر آنے دو۔"
"نہیں' مجھے اپنا گھر دیکھنا ہے۔"

اس بار سالار نے جیسے امامہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اسے لے کر وہ اوپر کے فلور پر آگیا۔ کمرا کھلا دیکھ کر امامہ نے اسے بے حد خفگی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ سالار کی کسی بات پر ناراض نہیں ہو رہی تھی۔

اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہی وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہاں سے اس کے گھر کا پورا لان اور پورچ نظر آ رہا تھا۔ لان بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ویسا نہیں رہا تھا جیسا کبھی ہوتا تھا' جب وہ وہاں تھی۔ تب وہاں وہ کرسیاں ابھی نہیں تھیں' جو پہلے ہوتی تھیں۔ لان میں لگی بیلیں اب پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور پھیل چکی تھیں۔ آنسوؤں کا ایک نیا ریلا اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ سالار نے اس دفعہ اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنا بے کار تھا۔ اسے فی الحال رونا تھا' وہ جانتا تھا۔

وہ مسجد میں نماز اور کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور حسب توقع تب بھی امامہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ گاؤں جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے اوپر آیا تھا۔ اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ وہ پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔

اڑھائی گھنٹے کے بعد بھی وہ کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی۔ سالار کے اندر آنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے اسے مخاطب کرنے کے بجائے کمرے میں دور پڑے صوفے کو کچھ جدوجہد کے ساتھ کھڑکی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔
"یہاں بیٹھ جاؤ' تم کب تک اس طرح کھڑی رہو گی۔"
صوفہ دھکیل کر اس کے قریب لانے کے بعد سالار نے اس کو مخاطب کیا اور تب ہی اس نے امامہ کا چہرہ دیکھا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔ سالار نے گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں ایک گاڑی میں کچھ بچے سوار ہو رہے تھے اور ایک عورت ان کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

"رضوان کے بچے ہیں؟" سالار نے گاڑی کو اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر امامہ سے کہا۔

امامہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بس انہیں دیکھ رہی تھی۔ سالار نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ نو سال لمبا عرصہ تھا۔ پتا نہیں مزید ان میں سے کس کو وہ پہچان سکی تھی اور کس کو نہیں اور ان میں سے کس کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت اب اندر چلی گئی تھی۔

اس کے کندھوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے سالار نے اس سے کہا "بیٹھ جاؤ!"

امامہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور ناک رگڑنے کی کوشش کی۔ صرف چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ خشک ہوا تھا' برسات پھر ہونے لگی تھی۔ سالار پنجوں کے بل اس کے سامنے چند لمحوں کے لیے بیٹھا۔ اس نے امامہ کے دونوں ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں اپنے ہاتھ میں لیے۔ اس کے دونوں ہاتھ بے حد سرد تھے۔ وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی سردی کو اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ ہیٹر آن کرنے کے

بعد اس نے کمرے کی الماری میں کوئی کمبل ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ایک کمبل اسے نظر آ ہی گیا تھا۔

"میں گاؤں کے لیے نکل رہا ہوں' شام تک واپس آؤں گا۔ واپس گیارہ بجے۔ قریباً پاپا اور ممی اٹھ جائیں گے' تب تم نیچے آ جانا۔" اس کی ٹانگوں پر کمبل ڈالتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔

وہ اب بھی اسی طرح دوپٹے سے آنکھیں اور ناک رگڑ رہی تھی لیکن اس کی نظریں اب بھی کھڑکی سے باہر تھیں۔ سالار اور یہ کمرا جیسے اس کے لیے اہم نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے کیا کہہ رہا تھا' اس نے نہیں سنا تھا اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔

وہ اگلے چار گھنٹے اسی طرح صوفے پر جمی بیٹھی رہی۔ اس دن اس نے نو سال کے بعد باری باری اپنے تینوں بھائیوں کو بھی گھر سے جاتے دیکھا تھا۔ وہ وہاں بیٹھی انہیں دیکھتی ہچکیوں سے روتی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ اس نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنے سال سے صبر کے جو بند وہ باندھتی چلی آ رہی تھی' اب وہ بند باندھنا مشکل ہو رہے تھے۔ وہ پہلے اسلام آباد آنا نہیں چاہتی تھی اور اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اسی طرح چوری چھپے اس گھر میں رہتی' اسی طرح روز اپنے گھر والوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کے لیے تو یہ بھی بہت تھا' وہ احمقانہ سوچ تھی لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ وہ ہر بات سوچ رہی تھی جس سے وہ یہاں اپنے ماں باپ کے گھر کے پاس رہ سکتی ہو۔

سالار نے گاؤں پہنچنے کے چند گھنٹے کے بعد سکندر کو فون کیا۔

"میں بھی حیران تھا جب ملازم نے مجھے بتایا کہ وہ اوپر گیسٹ روم میں ہے۔ میں سوچ رہا تھا پتا نہیں وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔"

سالار نے انہیں امامہ کو وہاں سے بلوانے کے لیے کہا تھا اور سکندر نے اسے "اچھا" کہا۔

"کیا ضرورت تھی اسے خوامخواہ وہاں لے جانے کی' گھر تو اس کا تمہارے کمرے سے بھی نظر آتا ہے۔"

"لیکن گھر والے اسے گیسٹ روم سے ہی نظر آ سکتے تھے۔" سالار نے کہا۔

سالار سے بات ختم کرنے کے بعد سکندر اٹھ کر اوپر والے فلور پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر آئے تھے۔

"بیٹا! نیچے آنا تھا ہم لوگوں کے پاس آ کر بیٹھیں کچھ دیر۔"

سکندر یہ کہتے ہوئے اندر آئے اور امامہ کچھ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

وہ ان کے وہاں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔

"رونے والی کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟" سکندر نے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ میں۔۔۔" وہ بے حد ندامت سے ان سے نظریں ملائے بغیر بولی۔

"چلیں! نیچے آئیں، طیبہ بھی پوچھ رہی ہیں آپ کا۔" سکندر نے ایک بار پھر اس کا سر تھپکا۔

یہ سالار نہیں تھا، جسے وہ مڑنے سے انکار کر دیتی۔ "جی۔" اس نے یہ کہتے ہوئے صوفے پر پڑا کمبل اٹھانے کی کوشش کی۔ سکندر نے اسے روک دیا۔

"ملازم اٹھا لے گا۔۔۔ آپ آجائیں۔"

اس کا چہرہ دیکھ کر طیبہ بھی بے چین ہو گئیں۔ جیسے بھی حالات میں شادی ہوئی، بہرحال وہ ایک ایسی فیملی تھی۔ جسے وہ طویل عرصے سے جانتے تھے اور جن کی دیوار کے ساتھ ان کی دیوار جڑی تھی۔ اس رشتے کا پاس بہو ہونے کے ناتے ان پر کچھ زیادہ ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ خود وہ بھی امامہ کو بچپن سے دیکھتے آئے تھے۔ کسی نہ کسی حد تک وہ

ان کے لیے بے حد شناسا تھی۔

وہ لوگ اسے تسلیاں دیتے اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سکندر نے اسے آرام کرنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے میں آکر کچھ دیر کے لیے کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی، پھر کچھ تھکی ہوئی آکر بیڈ پر لیٹ کر سو گئی۔

ساڑھے چار بجے اسے ملازم نے انٹرکام پر اٹھایا تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا، سکندر اور طیبہ بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سالار بھی افطار سے چند منٹ پہلے ہی پہنچا تھا۔ سکندر اور طیبہ اس رات بھی کہیں مدعو تھے۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ رات کو وہ بارہ بجے کے قریب واپس آئے۔ گیارہ بجے سالار اور اس کی فلائٹ تھی۔ طیبہ جانے سے پہلے امامہ کو کچھ تحائف دینے آئیں تو امامہ کو وہ تحائف یاد آگئے جو وہ کراچی سے ان دونوں کے لیے لے کر آئی تھی۔

امامہ کو حیرت ہوئی جب سالار، طیبہ سے ملنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

"تم مجھے دس بجے اٹھا دینا۔" اس نے امامہ کو ہدایت دی تھی۔

"گیارہ بجے فلائٹ ہے، دیر تو نہیں ہو جائے گی۔۔۔؟" امامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم پہنچ جائیں گے۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی اسے دیکھتی رہی پھر دوبارہ اوپر کے فلور کے اسی کمرے میں آگئی۔

اس کے گھر کے پورچ میں کوئی گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی۔ وہ ویک اینڈ تھا اور وہ یقیناً گھر پر نہیں تھے۔ کہاں ہو سکتے تھے۔ امامہ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ نو سال کے بعد یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ اسے امید یہ تھی کہ وہ وہاں بیٹھی انہیں واپس آتے دیکھ سکتی ہے، لیکن دس بجے تک کوئی گاڑی واپس نہیں آئی۔ وہ بوجھل دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر نیچے آگئی۔ سالار کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جانے کے لیے سامان سمیت کھڑا تھا۔ امامہ کا دل مزید بوجھل ہوا تو بالآخر ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ کر جانے کا وقت آگیا تھا۔

باہر پورچ میں ڈرائیور ایک گارڈ کے ساتھ گاڑی میں انتظار کر رہا تھا۔ سکندر عثمان نے گارڈ کو ایئرپورٹ تک ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ ہر طرح کی احتیاطی تدابیر کر رہے تھے۔ سالار نے سامان گاڑی میں رکھنے کے بعد چابی ڈرائیور سے لے لی۔ امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہم لوگ بائی روڈ جارہے ہیں' پاپا آئیں تو انہیں بتا دینا۔"

ڈرائیور نے کچھ احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ شاید سکندر اسے ضرورت سے زیادہ ہدایات کر گئے تھے' لیکن سالار کی ایک جھاڑ نے اسے خاموش کر دیا۔

"اور اب اتنی وفاداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے گھر سے نکلتے ہی پاپا کو فون کرو۔"

وہ گاڑی میں بیٹھتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس کے گھر سے نکلتے ہی یہی کام کرے گا۔ اس لیے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے سکندر کے فون پر کال کی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے سکندر کا فون انگیج کرنا چاہتا تھا۔

"پاپا! ہم لوگ نکل رہے تھے تو سوچا آپ سے بات کرلوں۔" سالار نے سکندر سے کہا۔

"اچھا کیا۔"

"ذرا ممی سے بات کرا دیں۔" اس نے سکندر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سکندر سے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ سکندر ڈرائیور کی ان کمنگ کال دیکھ کر چونکیں گے۔ وہ اگر گاڑی میں ان سے بات کر رہا ہے تو ڈرائیور انہیں کیوں کال کر رہا تھا۔ البتہ طیبہ اس سے بات کرتے ہوئے کسی ان کمنگ کال کو چیک نہ کرتیں اور اگر کرتیں بھی تو ان کو شک نہیں ہوتا۔ اگلے پندرہ منٹ وہ طیبہ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی امامہ کچھ حیران تھی۔ لیکن اس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔ وہ اتنی لمبی باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ جتنا وہ اب یک دم باتونی ہو گیا تھا۔

ادھر یہی حیرانی طیبہ کو بھی ہو رہی تھی۔ سکندر ڈرٹیبل پر چند دوسرے افراد کے ساتھ مصروف تھے۔ پندرہ منٹ لمبی گفتگو کے بعد جب سالار کو یقین ہو گیا کہ ڈرائیور اب تک سکندر کو کئی کالز کرنے کے بعد تنگ آکر کالز کرنا چھوڑ چکا ہوگا یا کم از کم دوبارہ کرنے کی اگلی کوشش کچھ دیر بعد ہی کرے گا تو اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون آف کر دیا۔ طیبہ اور سکندر کی واپسی بارہ بجے سے پہلے متوقع نہیں تھی اور اب اگر ڈرائیور سے پانچ دس منٹ بعد بھی ان کی بات ہوتی تو وہ بہت فاصلہ طے کر چکے ہوتے۔

"بائی روڈ آنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس کا فون بند ہوتے دیکھ کر امامہ نے اس سے پوچھا۔

"یونہی دل چاہ رہا تھا۔ کچھ یادیں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے سیل فون رکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی یادیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہارے ساتھ پہلے سفر کی یادیں۔" وہ کچھ دیر اس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔

وہ اس شخص سے کیا کہتی کہ وہ اس سفر کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس کے لیے سفر نہیں تھا' خوف اور بے یقینی میں گزارے چند گھنٹے تھے جو اس نے گزارے تھے۔ مستقبل اس وقت ایک دھیا تھا۔ بھوت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس راستے میں وہ بھوت مسلسل اسے ڈرا تا رہا تھا۔

"میرے لیے خوشگوار نہیں تھا وہ سفر۔" اس نے تھکے سے لہجے میں سالار سے کہا۔

"میرے لیے بھی نہیں تھا۔" سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"کئی سال ہانٹ کرتا رہا مجھے' دیکھنے آیا ہوں کہ اب بھی ہانٹ کرتا ہے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے اسے دیکھ کر بہت مدھم انداز میں مسکرایا۔

امامہ خاموش رہی۔ کئی سال پہلے کی وہ رات ایک بار پھر سے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے صرف رات ہی نہیں بلکہ جلال بھی آیا تھا۔ اس رات کی تکلیف کا ایک سرا اس کی ذات کے ساتھ بندھا تھا۔ دوسرا اس کی فیملی کے ساتھ۔ اس نے دونوں کو کھویا تھا۔ اگلی صبح کا سورج لاکھ ہمیشہ جیسا ہوتا' اس کی زندگی ویسی نہیں رہی تھی۔ کبھی وہ سوچ سکتی تھی کہ وہ کبھی اس رات کو صرف تکلیف سمجھ کر سوچے گی'

تقدیر سمجھ کر نہیں.... اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ برابر میں بیٹھا شخص آج اس کے آنسوؤں سے بے خبر نہیں تھا' لیکن اس وقت بے خبر تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا' امامہ آنکھیں پونچھنے لگی تھی۔ وہ سارا نقشہ جو اس نے اپنی زندگی کا کھینچا تھا' اس میں یہ شخص کہیں نہیں تھا۔ زندگی نے کس کو کس کے ساتھ جوڑا... کس تعلق کو کہاں سے توڑا تھا... پتا ہی نہیں چلا۔ سفر خاموشی سے ہو رہا تھا' لیکن طے ہو رہا تھا۔

"اب بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہے ہو۔" امامہ کو کئی سال پہلے کی اس کی ریش ڈرائیونگ یاد تھی۔ "زندگی کی قدر ہو گئی ہے اب؟" اس نے سالار سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری وجہ سے احتیاط کر رہا ہوں۔" وہ بول نہیں سکی۔ خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔

وہ شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور سڑک پر دھند محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں دھند گہری نہیں تھی' لیکن موجود تھی۔

"کبھی دوبارہ سفر کیا اکیلے اس روڈ پر...؟" امامہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"موٹر وے سے جاتا ہوں اب اگر گاڑی میں جانا ہو تو۔ بس ایک بار آیا تھا کچھ ماہ پہلے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جب پاپا نے مجھے تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ دیا۔ کیا رات تھی؟"

وہ جیسے تکلیف سے کراہا اور پھر ہنس پڑا۔

"امید تھی' جس کو اس رات میں نے مجسم فنا ہوتے دیکھا۔ سمجھ میں آیا مجھے کہ تب اس رات تم کس حالت سے گزری ہو گی۔ اذیت سے بہت زیادہ... موت سے ذرا سی کم... لیکن تکلیف اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔"

ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے' وہ جو کچھ اس تک پہنچانا چاہ رہا تھا' پہنچ رہا تھا۔ اس کانچ سے وہ بھی گزری تھی۔ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ گردن سیٹ کی پشت سے ٹکائے' وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں سارا راستہ بس یہی سوچتا رہا کہ میں اب کروں گا کیا۔ کیا کروں گا میں زندگی میں سوچ رہا تھا۔ اللہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ زندگی دے دی ہے... تمہارے ساتھ برا کیا تھا... برا تو ہونا ہی تھا میرے ساتھ... یاد ہے نا' میں نے تمہارے ساتھ سفر میں کیسی باتیں کی تھیں۔"

اس نے عجیب سے انداز میں ہنس کر ایک لمحہ کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھیں' پھر سالار نے نظریں چراتے ہوئے گردن سیدھی کر لی۔ سفر پھر خاموشی سے طے ہونے لگا تھا۔ وہ تعلق جو ان کے بیچ تھا' وہ جیسے خاموشی کو بھی گفتگو بنا رہا تھا۔ لفظ اس وقت خاموشی سے زیادہ بامعنی نہیں ہو سکتے تھے۔

امامہ بھی گردن سیدھی کر کے سڑک کو دیکھنے لگی۔ دھند اب گہری ہو رہی تھی۔ جیسے وہ سڑک پر نہیں بلکہ اپنے ماضی کی دھند میں داخل ہو رہے تھے۔ کہیں معدوم نہ ہونے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی گہری دھند... کیا کیا اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی' لیکن جو کچھ تھا' وہ اوجھل ہو گیا تھا' فراموش نہیں ہوا تھا۔

سیل فون کی رنگ ٹون نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ سیل پر سکندر کا نمبر چمک رہا تھا۔ سالار ہنس پڑا۔ امامہ اس کی بے مقصد ہنسی کو نہیں سمجھی۔

"ہیلو!" سالار نے کال ریسیو کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اسے حیرت تھی' سکندر عثمان کی کال اتنی دیر سے نہیں آنی چاہیے تھی۔ شاید ڈرائیور نے ان کے گھر پہنچتے ہی انہیں سالار کے ایڈونچر کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ سالار نے آواز کچھ کم کر دی تھی۔ جو کچھ سکندر اسے فون پر کہہ رہے تھے' وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ امامہ تک

پہنچتا۔

"جی۔۔۔ جی۔" وہ اب تابع داری سے کہہ رہا تھا۔ سکندر اس پر بری طرح برس رہے تھے اور کیوں نہ برستے وہ' انہیں بے وقوف بنانا جیسے سالار کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہ احساس سکندر کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے طیبہ کے پرس میں پڑے اپنے سیل پر ڈرائیور کی مسڈ کالز دیکھی تھیں اور اس سے بات کر کے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ بائی روڈ لاہور جانا' اس وقت ان کے لیے اس کی حماقت کا اعلا ترین مظاہرہ تھا' لیکن اس نے جتنے اطمینان سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی' وہ ان کے لیے زیادہ اشتعال انگیز تھا۔

"اب غصہ ختم کر دیں پاپا! ہم دونوں بالکل محفوظ ہیں اور آرام سے سفر کر رہے ہیں۔" اس نے بالآخر سکندر سے کہا۔

"تم ظفر کو دھمکیاں دے کر گئے تھے کہ وہ مجھے انفارم نہ کرے؟"

"دھمکی۔۔۔ میں نے ایک مودبانہ درخواست کی تھی اس سے کہ وہ آپ کو فی الحال انفارم نہ کرے۔۔۔ آپ ڈر چھوڑ کر خوامخواہ پریشان ہوتے۔" وہ بڑی رسانیت سے ان سے کہہ رہا تھا۔

"میری دعا ہے' سالار! کہ تمہاری اولاد بالکل تمہارے جیسی ہو اور تمہیں اتنا ہی خوار کرے' جتنا تم ہمیں کرتے ہو' پھر تمہیں ماں باپ کی پریشانی کا احساس ہو گا۔" وہ ہنس پڑا۔

"پاپا! اس طرح کی باتیں کریں گے تو میں اولاد ہی پیدا نہیں کروں گا۔"

امامہ نے اس کے جملے پر چونک کر اسے دیکھا۔

"پاپا دعا کر رہے ہیں کہ ہماری اولاد جلد پیدا ہو۔"

امامہ کو چونکتے دیکھ کر سالار نے فون پر بات کرتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ بے اختیار سرخ ہوئی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس طرح کی دعا کا کون سا وقت اور طریقہ ہے۔ دوسری طرف سکندر فون پر اس کا جملہ سن کر کچھ بے بسی سے ہنس پڑے تھے۔ ان کا غصہ کم ہونے لگا تھا۔ کئی سالوں کے بعد انہیں سالار سے اس طرح بات کرنا پڑی تھی۔ وہ اب اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ سکندر کو اپنے حدود اربعہ کے بارے میں بتا کر سالار نے فون بند کر دیا۔

"پاپا ناراض ہو رہے تھے۔۔۔؟" امامہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے جواباً کہا۔

"تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" امامہ نے جیسے اسے شرم دلانے کی کوشش کی تھی۔

"کیونکہ اگر میں سچ بولوں تو لوگ مجھے وہ نہیں کرنے دیتے' جو میں کرنا چاہتا ہوں۔" کمال کی منطق تھی اور بے حد سنجیدگی سے پیش کی گئی تھی۔

"چاہے تمہارے جھوٹ سے کسی کو دکھ پہنچے۔"

"میرے جھوٹ سے کسی کو دکھ نہیں پہنچتا' بلکہ غصہ آتا ہے۔"

اسے سمجھانا بے کار تھا' وہ سالار تھا۔ وہ اب اندازہ لگا سکتی تھی کہ سکندر نے اسے فون پر کیا کہا ہو گا۔

رات کے تقریباً پچھلے پہر وہ اس سروس اسٹیشن پر پہنچے تھے۔

"یہ جگہ یاد ہے تمہیں؟" سالار نے گاڑی روکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ امامہ نے دھندلا اس جگہ کو دیکھا' جہاں کچھ لائٹس دھند اور اندھیرے کا مقابلہ کرنے میں مصروف تھیں۔

"نہیں۔" اس نے سالار سے کہا۔
"یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے رک کر نماز پڑھی تھی۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اتر آیا۔
امامہ نے قدرے حیران نظروں سے اس جگہ کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔ اب وہ اسے کسی حد تک شناخت کرپا رہی تھی۔ وہ بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ ایک کپکپی اس کے جسم میں دوڑی۔ وہ آج بھی ایک سویٹر اور چادر میں ملبوس تھی۔
وہ کمرا بدل چکا تھا' جہاں انہوں نے بیٹھ کر کبھی چائے پی تھی۔
"چائے اور چکن برگر۔" سالار نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس آدمی سے کہا' جو جمائیاں لیتے ہوئے انہیں اندر لے کر آیا تھا اور اب آرڈر کے انتظار میں کھڑا تھا۔ امامہ اس کے آرڈر پر اسے دیکھ کر مسکرائی۔
"اب کھالو گے؟" وہ جانتا تھا' اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر مسکرا دیا۔
"لاسٹ ٹائم ہم وہاں بیٹھے تھے۔ تم نے وہاں نماز پڑھی تھی۔"
وہ ہاتھ کے اشارے سے اس کمرے کی مختلف اطراف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامہ کو یاد نہیں تھا' کمرے میں جگہ جگہ ٹیبلز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔
فجر کی اذان میں ابھی بہت وقت تھا اور فی الحال اس جگہ پر کام کرنے والے چند آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔
اب اس جگہ پر چائے اور برگر اتنے برے نہیں تھے جتنے اس وقت تھے۔ پریزنٹیشن بھی بہت بہتر تھی' لیکن ان دونوں میں سے کوئی نہ ذائقے کو دیکھ رہا تھا نہ پریزنٹیشن کو۔ وہ دونوں اپنے اپنے ماضی کو زندہ کررہے تھے۔ یہ چند گھونٹ اور چند لقموں کی بات نہیں تھی' زندگی کی بات تھی جو نجانے ریل کی پٹڑیوں کی طرح کہاں کہاں سے گزر کر ایک اسٹیشن پر لے آئی تھی۔ وہ اس مقام پر کھڑے تھے' جہاں ان پٹڑیوں کا کانٹا بدلا تھا۔ وہ قریب۔ ایک دوسرے کے ہم قدم۔ اور اب ایک دوسرے کے ساتھ۔
اس راستے پر کچھ نئی یادیں بنی تھیں۔ ان کی شادی کے بعد سڑک کے راستے ان کا پہلا سفر اور ان نئی یادوں نے پرانی یادوں کو دھندلانے کے عمل کا آغاز کردیا تھا۔
ٹیبل پر بل کے پیسے رکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امامہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ آئی تھی۔
"امامہ! وہ پسٹل کہاں ہے؟"
وہ عمارت سے باہر آتے ہوئے اس کے سوال پر چونکی۔ اسے کیا یاد آیا تھا' وہ ہنس پڑی۔
"ابو کے پاس ہے۔" اس نے سالار سے کہا۔
"تم واقعی چلا سکتی تھیں؟" سالار نے پتا نہیں کیا یقین دہانی چاہی۔
"ہاں۔" امامہ نے سرہلایا۔
"لیکن اس میں گولیاں نہیں تھیں۔" وہ اس کے اگلے جملے پر بے اختیار ٹھٹکا۔ "میرے پاس بس پسٹل ہی تھا۔" وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔
اس نے بے اختیار سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں وہ ہول اس نے جھونکی تھی یا اللہ نے' وہ اندازہ نہیں کرسکا۔ اس پسٹل نے اسے جتنا شاک اور غصہ دلایا تھا اگر اسے اندازہ ہوجاتا کہ وہ فلمی کے بغیر تھا تو سالار اس دن امامہ کو پولیس کے ہاتھوں ضرور اریسٹ کرواکر آتا۔ وہ پسٹل ہاتھ میں لیے کھڑا اتنی پراعتماد نظر آئی تھی اسے۔ یہ

اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔

"تم ڈر گئے تھے۔" امامہ ہنس رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ڈرا تو نہیں تھا، مگر شاکڈ رہ گیا تھا۔ تم سارا راستہ روتی رہی تھیں۔ میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم مجھ پر پسٹل نکال لوگی۔ تمہارے آنسوؤں نے دھوکا دیا مجھے۔"

وہ اب کچھ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ دونوں اب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ بیٹھنے کے بعد بھی جب وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بجائے ونڈ سکرین سے باہر دیکھتا رہا تو امامہ نے اس سے کہا۔

"گاڑی کیوں نہیں اسٹارٹ کر رہے؟"

"مجھے کیوں یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا پسٹل خالی بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ کیوں خیال نہیں آیا۔۔۔؟" وہ جیسے بڑبڑاتا ہوا ایک بار پھر کراہا۔

"اب رونا مت۔" امامہ نے اسے چھیڑا۔ "ویسے کیا کرتے تم اگر تمہیں یہ پتا چل جاتا؟"

"میں سیدھا جا کر پولیس کے حوالے کرتا تمہیں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شرم نہ آتی؟" امامہ بگڑی۔

"تمہیں آئی تھی جب تم نے مجھ پر پسٹل نکال لیا تھا۔ میں محسن تھا تمہارا۔" سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"محسن تھے۔۔۔ تم مجھے دھمکا رہے تھے۔"

"جو بھی تھا، کم از کم میں یہ ڈیزرو نہیں کرتا تھا کہ تم گن پوائنٹ پر رکھ لیتیں مجھے۔"

"لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔" امامہ نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"تو میں نے کون سا نقصان پہنچایا تھا؟" گاڑی اب دوبارہ مین روڈ پر تھی۔

لاہور کی حدود میں داخل ہونے تک امامہ اس سے ایک بار پھر خفا ہو چکی تھی۔



وہ اگلے دو تین دن تک اسلام آباد کے ٹرانس میں ہی رہی۔۔۔ وہاں جانے سے، جتنی خوفزدہ تھی اب وہ خوف یک دم کچھ ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ اب اسلام آباد کے اگلے دورے کی منتظر تھی۔ اس گیسٹ روم کی کھڑکی میں کھڑے سارا دن کس کو کس وقت دیکھا تھا، وہ اگلے دو تین دن سالار کو بھی بتاتی رہی اور تیسرے دن اس کی تان ایک جملے پر آ کر ٹوٹی تھی۔

"سالار! ہم اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے؟"

سالار بیڈ پر بیٹھا لیپ ٹاپ گود میں رکھے کچھ ای میلز کرنے میں مصروف تھا جب امامہ نے اس سے پوچھا۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس سے صرف اسلام آباد کی ہی باتیں کر رہی تھی اور سالار بے حد تحمل سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا جواب بھی دے رہا تھا۔

"نہیں۔" اپنے کام میں مصروف سالار نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میری جاب یہاں ہے۔"

"تم جاب بدل لو۔"

"نہیں بدل سکتا۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔
"میں اسلام آباد میں نہیں رہ سکتی؟"
اس بار سالار نے بالآخر اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔
"اس بات کا کیا مطلب ہے؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
"میرا مطلب ہے کہ میں وہاں رہوں گی تم ویک اینڈ پر آجایا کرنا۔"
ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ وہ مذاق کر رہی ہے لیکن وہ مذاق نہیں تھا۔
"میں ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد نہیں جا سکتا۔" اس نے بے حد تحمل سے اسے بتایا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔
سالار دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"تو تم مہینے میں ایک دفعہ آجایا کرو۔"
وہ اس کے جملے سے زیادہ اس کے اطمینان پر ٹھٹکا تھا۔
"بعض دفعہ میں مہینے میں ایک بار بھی نہیں آسکتا۔" اس نے کہا۔
"تو کوئی بات نہیں۔"
"یعنی تمہیں فرق نہیں پڑتا؟" وہ ای میلز کرنا بھول گیا تھا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" امامہ نے بے ساختہ کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے احساسات کو اتنی صفائی سے زبان دے گا۔
"پاپا اور ممی اکیلے ہوتے ہیں وہاں اس سے" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"وہ وہاں اکیلے نہیں ہوتے۔ عمار اور یسریٰ ہوتے ہیں ان کے پاس' وہ دونوں آج کل پاکستان سے باہر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پاپا اور ممی بڑی سوشل لائف گزار رہے ہیں۔ ان کو تمہاری سروسز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مجھے ہے۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔
وہ کچھ دیر خاموش اس کی گود میں پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھورتی رہی' پھر بڑبڑائی۔
"میں اسلام آباد میں خوش رہوں گی۔"
"یعنی میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟" وہ جزبز ہوا۔
"وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔" وہ اب بالآخر صاف صاف اپنی ترجیحات بتا رہی تھی۔
"پاپا ٹھیک کہتے تھے مجھے تمہیں اسلام آباد نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ ماں باپ کی بات سننی چاہیے۔" وہ بے اختیار پچھتایا۔ "دیکھو! اگر میں تمہیں اسلام آباد بھیج دیتا ہوں تو کتنی دیر رہ سکتی ہو تم وہاں' ہمیں اگلے سال پاکستان سے چلے جانا ہے۔" وہ اسے پیار سے سمجھانے کی ایک اور کوشش کر رہا تھا۔
"تو کوئی بات نہیں ہم پاکستان تو آیا کرو گے نا۔"
سالار کا دل خون ہوا۔ زندگی میں آج تک کسی نے اس کی ذات میں اتنی عدم دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔
"میں امریکا میں رہوں اور میری بیوی یہاں ہو' اتنا ابنارمل لائف اسٹائل نہیں رکھ سکتا میں۔"
اس نے اس بار دوٹوک انداز میں کہا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر چند لمحوں کے بعد سالار نے اس کے کندھے پر بے حد محبت اور ہمدردی سے اپنا ہاتھ رکھا۔
"سالار! تم دوسری شادی کر لو اور دوسری بیوی کو ساتھ لے جانا۔"
اس بار جیسے اس کے حواس غائب ہوئے۔ اگر یہ مذاق تھا۔ تو بے ہودہ تھا اور اگر واقعی تجویز تھی تو بے حد

سنگدلانہ تھی۔ وہ کئی لمحے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ شادی کے تیسرے ہفتے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھی تاکہ وہ اپنے ماں باپ کے قریب رہ سکے۔

"سنو! میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔" امامہ نے اس کے تاثرات سے کچھ نروس ہوتے ہوئے اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ سالار نے بڑی بے رخی سے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"خبردار! آئندہ میرے سامنے تم نے اسلام آباد کا نام بھی لیا اور اپنے احمقانہ مشورے اپنے پاس رکھو۔ اب میرا دماغ چاٹنا بند کرو اور سو جاؤ۔" وہ بری طرح بگڑا تھا۔

اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر وہ بے حد خفگی کے عالم میں بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ اس وقت اسے واقعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اپنے ماں باپ کی محبت میں وہ کتنے احمقانہ انداز میں سوچنے لگی تھی۔

لائٹس آف کر کے اس نے کچھ دیر کے لیے سونے کی کوشش کی' لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ اسے بار بار اب سالار کا خیال آ رہا تھا۔ چند لمحے لیٹے رہنے کے بعد وہ یک دم اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ لاؤنج کا ہیٹر آن کیے قریب پڑے صوفے پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ٹھٹکا تھا۔

"اب کیا ہے؟" امامہ کو دیکھتے ہی اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

"کچھ نہیں' میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔" وہ اس کے تختی سے پوچھنے پر کچھ جز بز ہوئی۔

"کافی بنا دوں تمہیں؟" وہ مصالحانہ انداز میں بولی۔

"مجھے ضرورت ہوگی تو میں خود بنا لوں گا۔" وہ اسی انداز میں بولا۔

وہ اس کے قریب صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ کہے بغیر اس نے سالار کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔ یہ ندامت کا اظہار تھا۔ سالار نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ پر اپنا کام کرتا رہا' لیکن یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے اتنے قریب بیٹھی ہو اور وہ اسے نظر انداز کر دے... کر دیتا اگر صرف اس کی بیوی ہوتی... یہ "امامہ" تھی۔ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیاں تھمنے لگیں پھر ایک گہرا سانس لے کر وہ سیدھا ہوا۔

"اب اس طرح بیٹھو گی تو میں کام کیسے کروں گا؟"

"تم مجھے جانے کا کہہ رہے ہو؟" امامہ نے برا مانا۔

"میں تمہیں جانے کا کہہ سکتا ہوں؟" اس نے اس کا سر چوما۔ "بہت احمقانہ بات کی تھی تم نے مجھے۔"

"ایسے ہی کہا تھا' مجھے کیا پتا تھا تم اتنی بد تمیزی کرو گے میرے ساتھ؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"بد تمیزی۔ کیا بد تمیزی کی ہے میں نے؟ تمہیں ایکسکیوز کرنا چاہیے جو کچھ تم نے مجھ سے کہا۔"

وہ سمجھا' وہ ندامت کا اظہار کرنے آئی ہے' لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی سے اس کے کندھے سے اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔

"اب میں ایکسکیوز کیا کروں تم سے...؟"

سالار نے اس کی اٹھی ہوئی ٹھوڑی دیکھی۔ کیا مان تھا... کیا غرور تھا...؟ جیسے وہ اس سے یہ تو کرا ہی نہیں سکتا تھا۔

"ایکسکیوز کروں تم سے؟" خفا سی آنکھوں اور اٹھی ٹھوڑی کے ساتھ وہ پوچھ رہی تھی۔

سالار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جھک کر اس کی ٹھوڑی کو چوما' یہ مان اسے ہی رکھنا تھا۔ وہ اس کا سر جھکا

دیکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔
"نہیں' تم سے ایکسکیوز کروا کر کیا کروں گا میں۔"
وہ بے حد نرمی سے اس کی ٹھوڑی کو دوبارہ چومتے ہوئے بولا۔
امامہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ کیا غرور تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ ہاں' وہ کیسے اس سے یہ کہہ سکتا تھا۔ اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔
"اچھا اب تم ایکسکیوز کرو مجھ سے' کیونکہ تم نے بدتمیزی کی ہے۔"
وہ اب اطمینان سے مطالبہ کر رہی تھی' وہ مسکرا دیا۔ وہ معترف سے اعتراف چاہتی تھی۔
"آئی ایم سوری۔" سالار نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔
"کوئی بات نہیں' اب آئندہ تم یہ نہ کہنا کہ میں اسلام آباد کی بات نہ کروں۔" وہ بے حد فیاضانہ انداز میں اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے بولی۔
سالار کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلی تو سارا مسئلہ اسلام آباد کا تھا۔ اسے شاید یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ وہ دوبارہ اسے وہاں نہیں لے کر جائے گا اور وہ اسی خدشے کے تحت اس کے پاس آئی تھی۔ کیا اندازِ دلبری تھا' وہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جو بھی تھا' کسی کے طفیل تھا۔ وہ ہنس پڑا۔
"کیا ہوا؟" اس نے الجھ کر سالار کو دیکھا۔
"کچھ نہیں۔" سالار نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے بڑی نرمی اور محبت سے اسے اس طرح گلے لگا کر اس کا سر اور ماتھا چوما جس طرح وہ روز آفس سے آنے کے بعد دروازے پر اسے دیکھ کر کرتا تھا۔
"گڈ نائٹ۔" وہ اب اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔
"گڈ نائٹ۔" وہ اپنی شال لپیٹتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ الوداعیہ انداز میں مسکرا دی' وہ بھی جواباً" مسکرایا تھا۔ امامہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ بہت دیر تک اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔
یہ عورت جس مرد کی زندگی میں بھی ہوتی' وہ خوش قسمت ہوتا لیکن وہ خوش قسمت نہیں تھا۔ "خوش قسمتی" کی ضرورت کہاں رہ گئی تھی اسے!

☆ ☆ ☆

"حبیب صاحب کی بیوی نے کئی چکر لگائے میرے گھر کے۔۔۔ ہر بار کچھ نہ کچھ لے کر آتی تھیں آمنہ کے لیے۔ کہتی تھیں' ہمیں جہیز نہیں چاہیے' بس آمنہ کا رشتہ دے دیں۔ کہتی کیا تھیں بلکہ منتیں کرتی تھیں۔۔۔ امامہ کے دفتر اپنے بیٹے کو بھی لے گئیں ایک دن۔۔۔ بیٹا بھی خود آیا ماں کے ساتھ ہمارے گھر۔ بچپن سے پلا بڑھا تھا میری نظروں کے سامنے۔"
وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھا سر جھکائے' سرخ اینٹوں کے فرش پر نظر جمائے' سعیدہ اماں کی گفتگو پچھلے آدھے گھنٹے سے اسی خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اس کی خاموشی سعیدہ اماں کو بری طرح تپا رہی تھی۔ کم بخت نہ ہوں نہ ہاں' کچھ بولتا ہی نہیں۔ مجال ہے ایک بار ہی کہہ دے کہ آپ نے اپنی بچی کی شادی میرے ساتھ کر کے میری بڑی عزت افزائی کی یا یہی کہہ دے کہ بہت گنوں والی ہے آپ کی بچی۔ وہ باتوں کے دوران مسلسل کھول رہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا اور وہ امامہ کے ساتھ صبح باقی کا سامان ٹھکانے لگانے آیا تھا۔ وہ الیکٹرونکس اور دوسرے سامان کو کچھ چیریٹی اداروں میں بھجوانے کا انتظام کرکے آیا تھا۔ امامہ نے اس بار اعتراض نہیں کیا تھا لیکن سعیدہ اماں کو ان دونوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ سامان ان کے گھر نہیں' کہیں اور بھجوایا جا رہا ہے۔

سہ پہر ہو رہی تھی اور وہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہیں دھوپ میں صحن میں بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ امامہ اندر کچن میں افطاری اور کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ انہیں آج افطاری وہیں کرنی تھی۔

دھوپ کی وجہ سے سالار نے اپنا سویٹر اتار کر چارپائی کے ایک کونے پہ رکھ دیا تھا۔ جینز کی جیب میں رکھا ایک رومال نکال کر اس نے چہرے پر آئی ہلکی سی نمی کو پونچھا۔ یہ امامہ کے رشتے کی جو داستان تھی' جو وہ سن رہا تھا۔

بیسن کو برتن میں گھولتے ہوئے امامہ نے صحن میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے' سالار کو دیکھا اسے اس پر ترس آیا۔ وہ کچن میں سعیدہ اماں کی ساری گفتگو سن سکتی تھی اور وہ گفتگو کس حد تک "قابل اعتراض" ہو رہی تھی' وہ اس کا اندازہ کر رہی تھی۔ تین دفعہ اس نے مختلف بہانوں سے سعیدہ اماں کو اندر بلانے کی کوشش کی' گفتگو کا موضوع بدلا لیکن جیسے ہی وہ کچن میں آتی' باہر صحن میں پھر وہی گفتگو شروع ہو جاتی۔

"اونچا لمبا جوان ہے۔ قد تم سے کچھ آدھ فٹ زیادہ ہی ہوگا۔"

حبیب صاحب کے بیٹے کا حلیہ بیان کرتے ہوئے سعیدہ اماں مبالغے کی آخری حدوں کو چھو رہی تھیں۔ سالار کا اپنا قد چھ فٹ دو انچ کے برابر تھا اور آدھ فٹ ہونے کا مطلب تقریباً" پونے سات فٹ تھا' جو کم از کم لاہور میں پایا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

"اماں! زیرہ نہیں مل رہا مجھے۔" امامہ نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سعیدہ اماں کو کہا۔

اس کے علاوہ اب اور کوئی بھی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اندر بلا لیتی۔

"ارے بیٹا! ادھر ہی ہے جدھر ہمیشہ ہوتا ہے۔ زیرے نے کہاں جانا ہے۔" سعیدہ اماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

امامہ نے زیرے کی ڈبیا کو سبزی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر اس نے سعیدہ اماں کو زیرے کی تلاش میں مصروف رکھنا تھا' پھر بعد میں کچھ اور کام سونپ دیتی انہیں' وہ پلان کر رہی تھی۔

"مولوی صاحب سے دم والا پانی لا کر دوں گی تمہیں۔ وہی پلانا۔ اس سے دل موم ہوگا اس کا۔"

سعیدہ اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے جو کچھ کہا' وہ نہ صرف امامہ نے' بلکہ باہر صحن میں بیٹھے سالار نے بھی سنا تھا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔؟" امامہ نے چونک کر پوچھا۔ وہ آلو کاٹ کر بیسن میں ڈال رہی تھی۔

"کیسا پتھر دل ہے اس کا۔ مجال ہے کسی بھی بات میں ہاں میں ہاں ملائے۔" وہ دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔

"اماں! اب آپ اس طرح کی باتیں کریں گی تو وہ کیسے ہاں میں ہاں ملائے گا۔ آپ نہ کیا کریں اس طرح کی باتیں' اسے برا لگتا ہوگا۔" امامہ نے دبی آواز میں سعیدہ اماں کو منع کیا۔

"کیوں نہ کروں' اسے بھی تو پتا چلے کوئی فالتو چیز نہیں تھی ہماری بچی۔ لاکھوں میں ایک' جسے ہم نے بیاہا ہے اس کے ساتھ۔۔۔ یہ زیرہ کہاں گیا۔؟" سعیدہ اماں بات کرتے ہوئے ساتھ زیرے کی ڈبیا کی گمشدگی پر پریشان ہونے لگیں۔

"میں نے آپ سے کہا ہے نا! اب وہ ٹھیک ہے میرے ساتھ۔" امامہ نے اماں کو سمجھایا۔

"تو بڑی صابر ہے بیٹا۔ میں جانتی نہیں ہوں کیا۔ بات تو کرتا نہیں میرے سامنے تجھ سے۔ بعد میں کیا کرتا ہوگا۔" سعیدہ اماں قائل نہیں ہوئی تھیں۔

صحن میں چارپائی پر بیٹھے سالار نے جوتے اتار دیے۔ سویٹر کو سر کے نیچے رکھتے ہوئے وہ چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ اندر سے امامہ اور سعیدہ اماں کی باتوں کی آواز اب بھی آرہی تھی لیکن سالار نے ان آوازوں سے توجہ ہٹالی۔ وہ سرخ اینٹوں کی دیوار پر چڑھی سبز پتوں والی بیلیں دیکھ رہا تھا۔ دھوپ اب ڈھلنے لگی تھی مگر اس میں اب بھی تمازت تھی۔ برابر کے کسی گھر کی چھت سے چند کبوتر اڑ کر صحن کے اوپر سے گزرے۔ لان میں سے ایک کبوتر کچھ دیر کے لیے صحن کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس نے دھوپ میں ایسا سکون پایا تھا۔ دھوپ میں سکون نہیں تھا' زندگی میں سکون تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بڑے غیر محسوس انداز میں اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"گردن تھک جاتی اس طرح تمہاری۔" اس نے سالار کا سویٹر نکالتے ہوئے کہا۔

سالار نے کچھ کہے بغیر تکیہ سر کے نیچے لے لیا۔ وہ اس کا سویٹر تہہ کرتے ہوئے۔ اپنے بازو پر ڈالتے اندر چلی گئی۔ ایسی ناز برداری کا کہاں سوچا تھا اس نے۔۔۔ اور وہ ایسی ناز برداری چاہتا بھی کہاں تھا اس سے۔۔۔ ساتھ کی خواہش تھی جو مل گیا تھا۔۔۔ کچھ اور ملتا نہ ملتا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"سو گیا ہے کیا؟" سعیدہ اماں نے کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے اندر آتی امامہ سے پوچھا۔

"جی' سو رہا ہے۔"

"اچھا' میں نے تو سوچا تھا ابھی اور تھوڑا سا سمجھاؤں گی اسے' یہ سو کیوں گیا؟"

سعیدہ اماں کو مایوسی اور تشویش ایک ساتھ ہوئی تھی۔

"تھک گیا ہے اماں۔۔۔ آپ نے دیکھا تو ہے کتنا کام کیا ہے اس نے۔۔۔ مزدوروں کے ساتھ مل کر سامان اٹھوایا' کل بھی گھر میں کام کرواتا رہا ہے۔ آج کل بینک میں بھی بہت مصروف رہتا ہے۔" امامہ مدھم آواز میں اماں کو بتاتی گئی۔

اس نے کچن کی کھڑکی بند کردی تھی۔ سالار کی نیند کتنی کچی تھی' اسے اندازہ تھا۔

"ہاں! لیکن۔۔۔" امامہ نے بے اختیار سعیدہ اماں کو آہستہ سے ٹوکا۔

"اماں! آہستہ بات کریں' وہ اٹھ جائے گا پھر۔"

"دیکھ' تجھے کتنا خیال ہے اس کا۔ اور ایک وہ ہے۔" سعیدہ اماں رنجیدہ ہوئیں۔

امامہ اب بری طرح پچھتا رہی تھی۔ سالار کے بارے میں وہ سعیدہ اماں سے اس طرح کی غیبت نہ کرتی تو سعیدہ اماں اسے "قابل اعتبار" سمجھتیں۔ اب مسئلہ یہ ہورہا تھا کہ سعیدہ اماں کو اس کی لاکھ یقین دہانیوں کے باوجود بیٹھے بٹھائے سالار کی پہلی بیوی کے حوالے سے پتا نہیں کیا کیا خدشات ستاتے رہتے' انہیں جیسے یقین تھا کہ امامہ ان سے ضرور کچھ چھپانے لگی ہے۔ وہ سالار کے ساتھ اتنی خوش نہیں تھی' جتنا وہ ظاہر کرتی تھی' اور اس تاثر کی بنیادی وجہ سالار کی وہ مکمل خاموشی تھی' جو وہ سعیدہ اماں کی امامہ کے سلسلے میں کی جانے والی باتوں پر اختیار کرتا تھا۔ سالار کی خاموشی کی وجہ اس گفتگو کی نوعیت تھی' جو سعیدہ اماں اس سے کرتی تھیں۔

ایک چیز جو امامہ نے اس ساری صورت حال میں سیکھی تھی' وہ یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر کے بارے میں' کبھی کسی دوسرے سے کوئی شکایت نہیں کرنی۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے کچھ لفظ اب اس پر بہت بھاری پڑ رہے تھے۔

"بس افطار اور کھانے کے لیے ہی کچھ۔۔۔ میں نے کتنا سامان منگوایا ہے۔ بیٹا! دو چار کھانے تو بناؤ' میں نے کہا

بھی تھا ساتھ والوں کی نبیلہ کو بلا لو۔" امامہ نے سعیدہ اماں کو ٹوکتے ہوئے کہا جو کچن میں کھانے کے سامان کو تیار ہوتا دیکھ کر چونکیں۔ وہاں مہمان داری کے کوئی انتظامات نظر نہیں آرہے تھے۔

"اماں! سالار نے منع کیا ہے۔ وہ نہیں کھاتا یہ چیزیں۔" امامہ نے چاول نکالتے ہوئے کہا۔

"پہلے اس کو کوئی پکا کر دینے والا نہیں تھا لیکن اب ہے نا۔"

"پکا کر دینے والا ہوتا تو تب بھی نہ کھاتا۔ اماں وہ کھانے پینے کا شوق نہیں ہے۔"

"کسی بھی چیز کا شوق نہیں ہے اسے؟"

"کسی بھی چیز...؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اماں، جھینگے وغیرہ پسند ہیں اسے لیکن اب اس وقت وہ تو نہیں کھلا سکتی نا میں اسے۔ آپ کو تو پتا ہے مجھے کتنی گھن آتی ہے اس طرح کی چیزوں سے۔" امامہ نے اماں کو بتایا۔

"لیکن اگر اسے پسند ہے تو بنا دیا کر بیٹا!" امامہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ "ہاں" آسان نہیں تھی اور "نہ" کا مطلب سعیدہ اماں کا ایک لمبا لیکچر سننا تھا۔



خون کہاں سے نکل رہا تھا، وہ اندازہ نہیں کر سکا لیکن اس کے ہاتھوں پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ ہتھیلیوں کو تکلیف اور خوف کے عالم میں دیکھ رہا تھا، پھر اس نے جھک کر اپنے سفید لباس کو دیکھا۔ اس کا لباس بے داغ تھا۔ پھر ہاتھوں پر لگا ہوا خون... اور جسم میں ہونے والی یہ تکلیف... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیوں سے خون کے چند قطرے اس کی سفید قمیص کے دامن پر گرے۔

"سالار! عصر کا وقت جا رہا ہے نماز پڑھ لو۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

امامہ اس کے پاس کھڑی اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہی تھی۔

سالار نے چاروں طرف دیکھا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو، اس کی ہتھیلیاں صاف تھیں۔ اس کا سانس بے ترتیب تھا۔ امامہ اس کا کندھا ہلا کر چلی گئی تھی۔ سالار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خواب تھا، جو وہ دیکھ رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے، اس نے خواب کو یاد کرتے ہوئے کچھ آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ بہت عرصے کے بعد کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ صحن کی دھوپ اب ڈھل چکی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنی گھڑی پر وقت دیکھا، عصر کی جماعت کا وقت نکل چکا تھا۔ اسے اب گھر میں ہی نماز پڑھنی تھی۔ اپنی جرابیں اتارتے ہوئے بھی وہ خواب کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا۔ امامہ تب تک اس کا سوئٹر اور وضو کرنے کے لیے اندر سے چپل لے آئی تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" اسے سوئٹر دیتے ہوئے امامہ نے پہلی بار اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے کچھ سرخ لگا تھا۔ اس نے سالار کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کا ٹمپریچر چیک کیا۔

"بخار نہیں ہے، دھوپ میں سونے کی وجہ سے لگا ہو گا۔"

سالار نے سوئٹر پہنتے ہوئے اس سے کہا۔ امامہ کو وہ کسی گہری سوچ میں لگا۔



بیت العنکبوت

وہ اس ہفتے پھر اسے اپنے ساتھ کراچی لے کر گیا لیکن اس بار وہ رات کی فلائٹ سے واپس آگئے تھے۔ پہلے کی

طرح اس بار بھی وہ اسی ہوٹل میں رہے۔ سالار اپنے آفس میں مصروف رہا، جبکہ وہ انیتا کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔

سالار سے اس کی دوبارہ ملاقات اسی طرح رات فلائٹ سے پہلے ہوئی تھی، وہ کچھ چپ چپ تھی۔ سالار نے نوٹس کیا تھا مگر اس کے ساتھ اس فلائٹ میں اس کے بینک کے کچھ غیر ملکی عہدے داران بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ لاؤنج میں ان کے ساتھ مصروف رہا۔ فلائٹ میں بھی وہ سیٹ بدل کر ان کے پاس چلا گیا۔

امامہ سے اس کو بات کرنے کا موقع ایئرپورٹ سے واپسی پر ملا تھا۔ کار پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے امامہ سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"تم اتنی خاموش کیوں ہو؟"

"کس سے باتیں کروں۔ اپنے آپ سے؟ تم تو مصروف تھے۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"چلو، اب بات کرو۔" سالار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کیسا رہا آج کا دن؟"

"بس ٹھیک تھا۔"

"بس ٹھیک تھا۔ کہاں گئی تھیں آج تم؟"

اس نے سالار کو ان دو تین جگہوں کے نام بتائے، جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی مگر سالار کو اس کے انداز میں جوش کا وہ عنصر نظر نہیں آیا تھا جو پچھلی بار تھا۔

"تمہاری پے کتنی ہے سالار؟" وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔ فوری طور پر اس سوال کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"تو کنسنس۔"

"میں سیریس ہوں۔"

"میں بھی سیریس ہوں۔ میں شوہر ہوں تمہارا، لیکن بے وقوف نہیں ہوں۔"

"جس اپارٹمنٹ میں ہم رہ رہے ہیں، وہ تمہارا ذاتی ہے؟"

اگلے سوال نے سالار کو اور حیران کیا تھا۔ وہ اب بھی بے حد سنجیدہ تھی۔

"نہیں، یہ رینٹڈ ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب کچھ۔۔۔؟"

اپنے جواب پر اسے امامہ کے چہرے پر مایوسی اتنی صاف نظر آئی کہ وہ بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی، تمہارا اپنا ہو گا۔"

وہ اب اسے کچھ سوچتی ہوئی لگی۔ سالار بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم نے مجھے جو پیسے دیے ہیں، اس سے کوئی پلاٹ لے لیں۔"

"امامہ۔۔۔ کیا پرابلم ہے؟" سالار نے اس بار اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے، اپنا گھر تو بنانا چاہیے نا ہمیں۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"تم انیتا کا گھر دیکھ کر آئی ہو؟" ایک جھماکے کی طرح سالار کو ایک خیال آیا تھا۔ انیتا کچھ عرصے تک اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والی تھی اور ان دنوں اس کے گھر کا انٹیریئر ہو رہا تھا۔

"ہاں۔" امامہ نے سر ہلایا، سالار نے گہرا سانس لیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔

"بہت اچھا گھر ہے نا اس کا؟" وہ اب سالار سے کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بے حد اشتیاق تھا۔

"ہاں اچھا ہے۔" سالار نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
چار کنال پر محیط انیتا کے گھر کو کراچی کے ایک معروف آرکیٹیکچر نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس کے برے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
"تم نے سوئمنگ پول کی بوٹ دیکھی ہے؟"
"نہیں میں نے کئی مہینوں پہلے اس کا گھر دیکھا تھا تب اتنا ئیر شروع نہیں ہوا تھا۔"
"ویسے سوئمنگ پول میں بوٹ کا کیا کام؟"
"اصلی والی نہیں ہے 'چھوٹی سی ہے' لکڑی کی لگتی ہے لیکن کسی اور میٹیریل کی ہے۔ اس پر ایک چھوٹی سی ونڈمل ہے اور وہ اسے اس سارے سوئمنگ پول میں حرکت کرتی رہتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھتا اس کی بات سنتا رہا۔ وہ اسے اس کشتی کی ایک ایک چیز بتا رہی تھی۔
"انیتا نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔" اس کے خاموش ہونے پر سالار نے کہا۔
"کیوں؟" وہ چونکی۔
"میری شادی کے تیسرے ہی ہفتے میری بیوی کو اپنا گھر دکھا دیا۔" وہ بڑبڑایا۔
"کہیں زمین خرید لیتے ہیں سالار!" امامہ نے اس کی بات نظر انداز کی۔
"امامہ! میرے پاس دو پلاٹ ہیں 'پاپا نے دیے ہیں۔ اسلام آباد میں تو گھر بنانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جب بنانا ہو گا' بنالیں گے۔" سالار نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
وہ یک دم پرجوش ہوئی۔ "کتنے بڑے پلاٹ ہیں؟"
"دس دس مرلے کے ہیں۔"
"بس... ؟ کم از کم ایک' دو کنال تو ہونا چاہیے۔" وہ مایوس سی ہوئی تھی۔
"ہاں' دس مرلے کم ہے۔ دو کنال تو ہونا ہی چاہیے۔" سالار نے تائید کی۔
"نہیں' دو نہ ہو۔ ایک ہی ہو جائے۔ ایک بھی بہت ہے... اس میں ایک سبزیوں کا فارم بنائیں گے' جانور بھی رکھیں گے۔ ایک گرین ہاؤس بنائیں گے' ایک گزیبو بنائیں گے اور ایک فش فارم بھی بنالیں گے۔"
سالار کو لگا کہ امامہ کو جگہ کا اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی تھی۔
"ایک کنال میں یہ سب کچھ نہیں بن سکتا امامہ!" اس نے مدھم آواز میں اس سے کہا' وہ چونکی۔
"لیکن میں تو ایکڑز کی بات کر رہی تھی۔"

وہ چند لمحے بھونچکا سا رہ گیا۔
"اسلام آباد میں' تمہیں ایکڑز میں زمین کہاں سے ملے گی؟" چند لمحوں کے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔
"اسلام آباد سے باہر تو مل سکتی ہے نا؟" امامہ سنجیدہ تھی۔
"تم پھر گھر نہ کہو' یہ کہو کہ فارم ہاؤس بنانا چاہتی ہو تم۔"
"نہیں' فارم ہاؤس نہیں' ایک بڑی سی کھلی سی جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر... جیسے کوئی وادی... اس طرح کی وادی میں گھر۔"
"پاپا کا بھی ایک فارم ہاؤس ہے' کبھی کبھار جاتے ہیں ہم لوگ... تمہیں بھی لے جاؤں گا وہاں۔" سالار نے اسے پھر ٹالا۔
"میں فارم ہاؤس کی بات نہیں کر رہی' اصلی والے گھر کی بات کر رہی ہوں۔" امامہ اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"جس طرح کا میرا پروفیشن ہے امامہ! اس میں میں فارم ہاؤس یا شہر سے باہر رہائش رکھنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ کم از کم جب تک میں کام کر رہا ہوں' تب تک مجھے بڑے شہروں میں رہنا ہے اور بڑے شہروں میں اب بہت مشکل ہے ایکڑز میں شہر کے اندر کوئی گھر بنانا۔ یہ تمہارے ان رومانٹک ناولز میں ہو سکتا ہے' لیکن رئیل لائف میں نہیں' جو چیز ممکن اور پریکٹیکل ہے وہ یہ ہے کہ چند سالوں کے بعد کوئی لگژری فلیٹ لے لیا جائے یا دو چار کنال کا کوئی گھر بنا لیا جائے یا چلو پانچ چھ کنال بھی ہو سکتا ہے' لیکن کسی اچھی جگہ پر اس سے بڑا گھر افورڈ ایبل نہیں ہو گا۔ ہاں! یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ پانچ دس سال بعد لاہور یا اسلام آباد سے باہر کہیں ایک فارم ہاؤس بنا لیا جائے' لیکن میں جانتا ہوں' بیس یا تیس سال میں ہم دس یا بیس بار سے زیادہ نہیں جا پائیں گے وہاں' وہ بھی چند دنوں کے لیے' لیکن وہ ایک سفید ہاتھی ثابت ہو گا ہمارے لیے' جس پر ہر ماہ ہمارے اخراجات ہوں گے۔"

سالار کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی صاف گوئی کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ امامہ کا رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ وہ حقیقت تھی' جو وہ اسے دکھا رہا تھا۔ سالار نے اسے دوبارہ بولتے نہیں دیکھا۔ گھر پہنچنے تک وہ خاموش رہی اور پورا راستہ اس کی خاموشی اسے چبھی تھی۔

"اچھا ہم گھر کا ایک اسکیچ بناؤ' میں دیکھوں گا اگر فیزیبل ہوا تو بنایا جا سکتا ہے۔"

یہ اس نے سونے سے پہلے سرسری انداز میں امامہ سے کہا تھا اور ایک سیکنڈ میں امامہ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی بات اسے اتنا خوش کر دے گی' اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سحری کے وقت وہ جب الارم کی آواز پر اٹھا تو وہ بستر میں نہیں تھی۔

"تم آج پہلے اٹھ گئیں۔"

وہ کچن میں کام کر رہی تھی' جب سالار سحری کے لیے وہاں گیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے مسکرائی تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی' آج اس نے سحری ختم کرنے میں بڑی عجلت دکھائی تھی اور کیوں دکھائی تھی' یہ راز زیادہ دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اپنی اسکیچ بک اٹھا لائی تھی۔

"یہ میں نے اسکیچ کر لیا ہے' جس طرح کا گھر میں کہہ رہی تھی۔"

سحری کرتے ہوئے سالار بری طرح چونکا تھا۔ وہ اپنی کسی ہدایت پر اتنے فوری عمل درآمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ اسکیچ بک اس کے سامنے کھولے بیٹھی تھی۔ ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس اسکیچ بک کو تھامے سالار نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوسری اس گھر پر' جو سامنے اسکیچ میں نظر آ رہا تھا۔ گھر سے زیادہ اسے ایک اسکیچ کتنا زیادہ بہتر تھا۔ اس نے گھر میں ہر وہ چیز شامل کی تھی جس کا ذکر اس نے اس سے رات کو کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے وہ اسے زبانی بتا رہی تھی' اب وہی سب کچھ ایک ڈرائنگ کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔

پہاڑوں کے دامن میں' کھلے سبزے میں' ایک چھوٹا سا گھر' جس کے سامنے ایک جھیل تھی اور اس کے اردگرد وہ چھوٹے چھوٹے اسٹرکچرز تھے جس کا وہ ذکر کر رہی تھی' گزیبو اور سمر ہاؤس۔ اس نے اپنے اسکیچز کو کلر بھی کیا ہوا تھا۔

"اور یہ آگے بھی ہے۔" اس نے سالار کو اسکیچ بک بند کرتے دیکھ کر جلدی سے اگلا صفحہ پلٹ دیا۔

وہ اس کے گھر کا یقیناً "عقبی حصہ" تھا' جہاں پر ایک اصطبل اور پرندوں کی مختلف قسم کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ اس میں وہ فش فارم بھی تھا جس کا وہ رات کو ذکر کر رہی تھی۔

"تم رات کو سوئی نہیں؟" اسکیچ بک بند کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔

وہ اسکیچز گھنٹوں کی محنت کے بغیر نہیں بن سکتے تھے۔ امامہ کو اس تبصرے نے جیسے مایوس کیا۔ وہ اسکیچز دیکھنے پر سالار سے کسی اور بات کے سننے کی توقع کر رہی تھی۔

"اچھا ہے: ؟" اس نے سالار کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔
کانٹا ہاتھ میں لیے وہ بہت دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جو اس کے لیے گھر تھا' وہ اس کے لیے اب بھی فارم ہاؤس ہی تھا اور آسان نہیں تھا لیکن وہ ایک بار پھر اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"بہت اچھا ہے۔" ایک لمبی سی خاموشی کے بعد کہے جانے والے اس جملے پر وہ بے اختیار کھل اٹھی تھی۔
"تمہارے دونوں پلاٹس بیچ کر ہم کسی جگہ پر ذرا بڑی جگہ۔۔۔"
"ذرا بڑی' بلکہ۔۔۔ ؟ ایک ایکڑ کی بات کر رہی ہو کم از کم تم۔۔۔ اور زمین تو چلو کسی نہ کسی طرح آ ہی جائے گی لیکن اس گھر کی مینٹیننس کے اخراجات۔۔۔ ویل۔۔۔ مجھے کم از کم کروڑ پتی ہو کر مرنا پڑے گا اگر رب پتی نہیں تو۔۔۔"
سالار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
امامہ نے بے حد خفگی سے اسکیچ بک بند کر دی۔
"ٹھیک ہے، میں نہیں کروں گی اب گھر کی بات۔"
وہ پلک جھپکتے میں اٹھ کر اپنی سکیچ بک کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔
وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہ گیا۔ یہ ایک بے حد مضحکہ خیز صورت حال تھی جس کا وہ سامنا کر رہا تھا۔ سالار سحری ختم کر کے بیڈ روم میں آ گیا۔ امامہ صوفے پر اسکیچ بک کھولے بیٹھی تھی۔ سالار کو دیکھ کر اس نے اسکیچ بک بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔
"اگر تمہیں فوری طور پر گھر چاہیے تو میں خرید دیتا ہوں تمہیں۔"
اس نے بے حد سنجیدگی سے اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"مجھے اس طرح کا گھر چاہیے۔" اس نے پھر اسکیچ بک اٹھالی۔
"ایک ایکڑ ہو یا نہ ہو' لیکن ایسا ایک بنا دوں گا میں تمہیں۔۔۔ وعدہ۔ لیکن اب یہ ہوم مینیا کو اپنے سر سے اتار دو۔"
وہ امامہ کا کاندھا تھپکتے ہوئے اٹھ گیا۔
وہ بے اختیار مطمئن ہو گئی۔۔۔ وعدہ کا لفظ کافی تھا فی الحال اس کے لیے۔۔۔ "وعدہ" کو "گھر" بنانا زیادہ مشکل نہ ہوتا اس کے لیے۔



ماہ رمضان کے باقی دن بھی اسی طرح گزرے تھے۔ عید کے فوراً" بعد سالار کا بینک کوئی نیا انویسٹمنٹ پلان لانچ کرنے والا تھا اور وہ ان دنوں اسی سلسلے میں بے حد مصروف رہا تھا۔ امامہ کے لیے مصروفیت کا دائرہ گھر سے شروع ہو کر گھر پر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ وہ اسے دن میں دو تین بار بینک سے چند منٹ کے لیے کال کر کے حال احوال پوچھتا اور فون رکھ دیتا۔
امامہ کا خیال تھا' وہ وقتی طور پر مصروف ہے' اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ وقتی طور پر اپنی مصروفیت کو حتی الامکان کم کیے ہوئے تھا۔
بازاروں میں عید کی تیاریوں کی وجہ سے رش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود اسے رات کو ایک آدھ گھنٹے کے لیے باہر لے جایا کرتا تھا۔ وہ دونوں کافی پیتے' بعض دفعہ گاڑی میں بیٹھے' پھرتے یا ونڈو شاپنگ کرتے' بے مقصد باتیں کرتے۔ وہ روزانہ رات کو اس ایک گھنٹے کا انتظار کرتی تھی۔۔۔ وہ ایک گھنٹہ اس کی زندگی کی وہ کھڑکی تھی، جس سے باہر جھانکنا اسے پسند تھا اور سالار اس سے واقف تھا۔
وہ دنیا جس پر وہ سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا تھا' وہ امامہ کے لیے اتنے سالوں کے بعد ایک فینٹسی ورلڈ کی

حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ لاہور کی سڑکوں' چوکوں اور مارکیٹوں میں پہلے کیا تھا اور اب کیا نہیں ہے۔ سالار نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا اور وہ ہر بار کسی نئی چیز کو دیکھ کر بڑے نوسٹیلجک انداز میں اس کو بتاتی کہ کئی سال پہلے جب وہ وہاں آئی تھی تو وہاں کون سی چیز کیسے ہوا کرتی تھی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتا' خاموشی سے اس کی باتیں سنتا تھا۔ وہ جیسے اس سے زیادہ خود کو بتا رہی ہوتی تھی۔ کولمبس کی طرح وہ پہلے سے موجود دنیا کو پھر سے دریافت کر رہی تھی اور وہ خوش تھی کہ کہیں نہ کہیں خوشی کا ایک احساس اب اس کے ہمراہ رہنے لگا ہے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ وہ سالار کے ساتھ کیونکر خوش ہے اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ؟

اس کے لیے اسے اتنی جلدی قبول کرنا' اتنا آسان کیسے ہو گیا تھا۔ اتنی جلدی سب کچھ بھول جانا اور اس سے آگے وہ اپنی سوچ کے سارے دروازے بند کر لیتی تھی۔ جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی' وہ اب اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم ابھی کچھ عرصے کے لیے تو نہیں۔ کچھ عرصہ وہ زندگی کو بے بسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خوشی کے احساس کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔

وہ عید سے دو دن پہلے اسلام آباد آ گئے تھے۔ کامران اور معیز اپنی فیملیز کے ساتھ عید کے لیے پاکستان آئے تھے۔ عمار اور اس کی فیملی بھی واپس آ چکی تھی۔ وہ ان سے فون پر بات کر چکی تھی' لیکن سالار کی بیوی کے طور پر ان سب سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ جتنی پریشان سالار کے والدین سے پہلی ملاقات کے وقت تھی' اب اتنی نہیں تھی۔ وہ سب بھی اس سے بے حد دوستانہ انداز میں ملے تھے۔ وہ کون تھی؟ وہ سب پہلے ہی سے جانتے تھے۔ لہٰذا اس پر سوالات کی بوچھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایک فی الحال محتاط تھا۔

وہ سکندر عثمان کے وسیع و عریض سٹنگ ایریا میں بیٹھی' وہاں موجود تمام لوگوں کی گپ شپ سن رہی تھی اور ادھر ادھر بھاگتے' دوڑتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ سالار کے تینوں بھائیوں کی سسرال اسلام آباد میں ہی تھی اور اس وقت موضوع گفتگو تینوں بھائیوں کی سسرال کی طرف سے آئے ہوئے وہ بیش قیمت تحائف تھے' جو عید پر ان کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کی سسرال کی طرف سے نہ صرف بیٹی' داماد اور ان کے بچوں کے لیے تحائف بھیجے گئے تھے بلکہ سکندر اور طیبہ کے لیے بھی چیزیں بھیجی گئی تھیں۔ وہ لوگ ڈنر کے بعد وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور گفتگو کا موضوع فی الحال وہی تحائف ہی تھے۔ وہاں بیٹھے ان باتوں کو سنتے ہوئے امامہ کو شدید احساس کمتری ہوا۔ اس کے اور سالار کے پاس وہاں کسی دوسرے سے کسی تحفے کی تفصیلات شیئر کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اسلام آباد آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی' سعیدہ اماں اور فرقان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹیوں نے بھی اس کے لیے کچھ کپڑے بھجوائے تھے' لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز اس کے اپنے ماں باپ کے گھر سے نہیں آئی تھی' وہ دوسروں کی طرف سے آنے والے تحائف تھے۔ کچھ چیزوں کی کمی اس کی زندگی میں ہمیشہ رہنی تھی اور یہ ان ہی میں سے ایک چیز تھی۔ معمولی تھی لیکن بھول جانے والی نہیں تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح کے شدید احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی اور اس احساس کو یہ خیال اور بھی بڑھا رہا تھا کہ سالار بھی اسی طرح کی باتیں سوچ رہا ہوگا۔ اگر وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرتا تو آج اس کے پاس بھی بات کرنے کے لیے تحائف کی لمبی لسٹ ہوتی یا ان چیزوں کی تفصیلات ہوتیں' جو اس نے سسرال سے آنے والی عید کی رقم سے خریدی ہوتیں۔ سالار چائے پیتے ہوئے خاموش بیٹھا وہاں ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اور وہ اس کی خاموشی کو اپنی مرضی کا مفہوم دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم نے کیا بنوایا ہے عید کے لیے؟" کامران کی بیوی زوبانے اچانک اس سے پوچھا۔

"میں نے...؟" وہ گڑبڑائی۔

چند لمحوں کے لیے سب کی نظریں اس پر جم گئی تھیں۔

"سالار نے کپڑے لے کر دیے ہیں مجھے۔ قمیص شلوار ہی ہے۔"

وہ خود نہیں سمجھ پائی کہ اسے یہ بتاتے ہوئے اتنی ندامت کیوں ہوئی تھی۔

"امامہ کے لیے تو عید کے کپڑے میں نے بھی بنوائے ہیں۔ یہ پہلی عید ہے اس کی۔ تم عید پر تو میرے والے کپڑے ہی پہننا۔" طیبہ نے مداخلت کرتے ہوئے اسے بتایا۔

امامہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کندھوں کے بوجھ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔



"صبح تم چل رہی ہو میرے ساتھ؟"

سالار نائٹ ڈریس میں ملبوس چند لمحے پہلے واش روم سے نکلا تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ اسی کھڑکی کے آگے کھڑی تھی۔

"ہاں۔" اس نے سالار کو دیکھے بغیر کہا۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے امامہ کو غور سے دیکھا۔ اسے اس کا لہجہ بے حد بجھا ہوا لگا تھا۔

"ہاں۔" اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

سالار کمبل کھینچتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ امامہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنے سیل پر الارم سیٹ کر رہا تھا اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف آگئی۔ بیڈ کے قریب آنے پر الارم سیٹ کرتے ہوئے سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ حیران ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی' یہ پوچھنے کے لیے اب اسے اس سے تصدیق کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کا چہرہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اس کی اداسی کو اسلام آباد آنے کا نتیجہ سمجھا تھا۔ لیٹے لیٹے سالار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کی گرفت میں اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی' پھر اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔

"تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ چند لمحوں کے لیے بھونچکا سا رہ گیا تھا۔

"پھر کس سے شادی کرنی چاہیے تھی؟" وہ حیران ہوا۔

"کسی سے بھی۔ میرے علاوہ کسی سے بھی۔"

"اچھا مشورہ ہے لیکن دیر سے ملا ہے۔" اس نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم پچھتا رہے ہو نا اب؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں کیوں پچھتاؤں گا؟" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہوگا۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سالار نے اسے روکا۔

"نہیں' مجھے نہیں پتا' تم بتاؤ۔" وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔

"تمہارا بھی دل چاہتا ہوگا کہ کوئی تمہیں بھی کپڑے دے.... تحائف دے اور۔" وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ اس کی آواز پہلے بھرائی' پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔

وہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی' وہ اس کے لیے احساس جرم بن

رہی تھی۔
"میرے خدا! امامہ! تم کیا کیا سوچتی رہتی ہو؟" وہ واقعی ششدر رہ گیا تھا۔
وہ اپنی آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کرتی ہوئی بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔
آنکھیں آنسو بہانا جانتی ہیں" آنسوؤں کو روکنا نہیں جانتیں۔
"بس تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"
یہ اس نے آنسو روکنے اور آنکھیں رگڑنے کی جدوجہد میں کہا تھا۔ وہ بہت دل برداشتہ تھی۔ بات تحفوں کی نہیں تھی ہی سکی۔ کے اس احساس کی تھی جو لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھے اس نے ان چند گھنٹوں میں محسوس کیا تھا۔ سالار نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اسے گلے لگا کر تسلی دینے والے انداز میں تھپکا۔ اسے تسلی نہیں ہوئی' وہ اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے تک واش روم میں آنسو بہاتے رہنے کے بعد' اس کے دل کا بوجھ تو ہلکا نہیں ہوا' البتہ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ جب واپس کمرے میں آئی تو وہ کمرے کی لائٹ آن کیے اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ امامہ کو کچھ شرمندگی ہوئی۔ وہ اس سے کچھ نہ ہی کہتی تو ٹھیک تھا۔ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بیڈ کی دوسری طرف جا کر لیٹ گئی۔ وہ بھی لائٹس آف کر کے لیٹ گیا۔ اس نے امامہ کو مخاطب نہیں کیا تھا اور یہ جیسے اس کے لیے نعمت مترقبہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"امامہ بی بی! آپ اتنی عقل مند ہیں نہیں' جتنا میں آپ کو سمجھتا تھا۔ بہت ساری چیزیں ہیں جن میں آپ خاصی حماقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔"
اگلی صبح گاؤں جاتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران وہ بے حد سنجیدگی سے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ اسے فی الحال خود کو عقل مند ثابت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"کیا ہو جاتا ہے تمہیں بیٹھے بٹھائے؟ کیوں اس طرح کی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو؟"
وہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔ امامہ کا رویہ اسے بعض دفعہ واقعی حیران کر دیتا تھا۔
"تم اب مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ کرو۔ تم مجھے اپ سیٹ کر رہے ہو۔"
اس نے سالار کی بات کا جواب دینے کے بجائے بے حد بے زاری سے اس سے کہا۔
"میں بات کروں گا۔" اس نے جواباً" اسے ڈانٹا تھا۔

"مجھے سسرال کے کپڑوں اور تحائف میں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں عید پر اپنے خریدے ہوئے کپڑوں کے بجائے بیوی کے گھر سے آئے ہوئے کپڑے پہنوں گا؟ کامران' معیز اور عمار' ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنتا سسرال کی طرف سے آئے ہوئے کپڑے۔ اپنے کپڑے خود لیتے ہیں وہ سب۔ ہاں البتہ تمہیں اگر اس بات کا دکھ ہے کہ تمہیں تحائف نہیں ملے تو ـــ"
امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں اس کی بات کاٹی۔
"ہاں ہے مجھے اس بات کا دکھ... پھر ـــ؟"
"تو پھر یہ ہے کہ میں لے دیتا ہوں تمہیں یہ سب کچھ' پہلے بھی لے کر دیے ہیں' اب اور لے دیتا ہوں۔" سالار کا لہجہ اس بار کچھ نرم پڑا تھا۔
"تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے۔" امامہ نے اسی انداز میں کہا۔
"ہاں' ہو سکتا ہے لیکن تم بھی یہ بات سمجھ لو کہ کچھ چیزیں تم نہیں بدل سکتیں' تمہیں انہیں قبول کرنا ہے۔"

"دم کیا تو ہے۔"

"تو پھر اتنا رونا کیوں؟"

"سب نے محسوس کیا ہوگا کہ میری فیملی نے۔۔۔" اس نے رنجیدہ ہوتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم سے کسی نے کچھ کہا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"کہا نہیں' پھر بھی دل میں تو انہوں نے سوچا ہوگا؟"

"تم ان کے دلوں تک مت جاؤ' جو بات میں کہہ رہا ہوں تم صرف وہ سنو۔" سالار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"یہ بے معنی چیزیں ہیں۔ ایک نارمل ارینج میرج ہوئی ہوتی تو بھی میں سسرال سے کوئی تحائف لینا پسند نہ کرتا۔ میں جن کسٹمز (رواج) کو پسند نہیں کرتا' ان کی وجہ سے کوئی حسرت اور پچھتاوے بھی نہیں ہیں مجھے۔"

"تم سے زیادہ قیمتی کوئی گفٹ ہو سکتا ہے میرے لیے؟" وہ اسے اب بڑی رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سے متاثر نہیں ہو رہی ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا' اس کے لیے بھی بات تحائف کی نہیں تھی' اس احساس محرومی کی تھی جو اسے ہو رہا تھا اور جس کے لیے فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے امامہ سے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔



اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ اور اس کے اندر موجود چھوٹی بڑی عمارتوں نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے سالار سے اس اسکول اور دوسرے پروجیکٹس کے بارے میں سرسری سا تذکرہ سنا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنا منظم اور اس سطح پر ہو رہا ہے۔

کمپاؤنڈ میں آج صرف ڈسپنسری کھلی تھی اور اس وقت بھی وہاں مریضوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ باقی عمارتوں میں لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ یہ عید کی تعطیلات تھیں۔

سالار کی گاڑی کو کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے کمپاؤنڈ میں ہلچل سی مچی تھی۔ کیئرٹیکر اسٹاف یک دم الرٹ ہو گیا تھا۔ وہاں کام کرنے والے افراد کی اکثریت آج چھٹی پر تھی اور جو وہاں موجود تھے انہوں نے کمپاؤنڈ کے آخری کونے میں انیکسی کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد سالار کے ساتھ گاڑی سے نکلنے والی چادر میں

ملبوس اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

انیکسی کا چوکیدار وہ پہلا آدمی تھا جسے سالار نے اپنی "بیوی" سے متعارف کرتے ہوئے اپنی شادی کے بارے میں مطلع کیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے سالار جانتا تھا کہ جب تک وہ عمارت کے دوسرے حصوں کی طرف جائیں گے تب تک اس کی شادی کی خبر ہر طرف پھیل چکی ہوگی۔

انیکسی کے سامنے موجود لان سے گزرتے ہوئے امامہ نے بڑی دلچسپی سے اپنے قرب و جوار میں نظر دوڑائی۔ وہ انیکسی' مرکزی عمارت سے بہت فاصلے پر تھی اور وہاں بیٹھے ہوئے شاید ان دنوں میں بھی دوسری عمارتوں کے شور سے بچا جا سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی باڑ کے ساتھ لان اور انیکسی کی حد بندی کی گئی تھی۔ لان کا ایک حصہ سبزیوں کی کاشت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ دھوپ پوری طرح نہیں پھیلی تھی اور خنکی کا احساس بے حد شدید ہونے کے باوجود' امامہ کا دل کچھ دیر کے لیے کھلتی ہوئی دھوپ والے اس لان میں پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کو چاہا تھا جو رات کی اوس سے بھیگی ہوئی تھیں۔

بہت عرصے کے بعد وہ ایسی کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اداسی کی ہر کیفیت کو اس نے غائب ہوتے ہوئے محسوس کیا۔
"ہم یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔"
انیکسی کے برآمدے میں پہنچتے ہی اس نے سالار سے کہا جو چوکیدار سے دروازہ کھلوا رہا تھا۔
"نہیں، یہاں، کچھ دیر بعد تمہیں سردی لگے گی۔ اندر لاؤنج میں بیٹھ کر بھی تمہیں باہر سب کچھ اسی طرح نظر آئے گا۔ فی الحال میں ذرا ڈسپنسری کا ایک راؤنڈ لوں گا، تمہیں اگر یہاں بیٹھنا ہے تو بیٹھ جاؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔
"نہیں میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے فوراً کہا تھا۔
انیکسی فرنشڈ تھی اور اس کے اندر داخل ہونے پر چند لمحوں کے لیے امامہ کو جیسے اس کے ساؤنڈ پروف ہونے کا احساس ہوا۔ اندر کچھ ایسی ہی خاموشی اسے محسوس ہوئی تھی۔
"کبھی ہم بھی یہاں رہنے کے لیے آئیں گے۔" اس نے بے اختیار کہا تھا۔
"اچھا۔" امامہ کو لگا وہ اسے بہلا رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ اتنا ہی عدم دلچسپی لیے ہوئے تھا۔
دس منٹ بعد وہ اسے مرکزی عمارت اور اس سے منسلک دوسرے حصے دکھا رہا تھا۔ وہ عمارت اسے دکھانے کے ساتھ ساتھ وہاں موجود اسٹاف کو کچھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس جگہ کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر ہیں۔
"وہ سب لوگ کہہ رہے ہیں مٹھائی کھلائیں جی۔" چوکیدار نے سالار کو دوسرے لوگوں کی فرمائش پہنچائی۔
"چلیں! ٹھیک ہے، آج افطار اور افطار ڈنر کا انتظام کرلیں۔ میں اکاؤنٹنٹ کو بتا دیتا ہوں۔" سالار نے مسکرا کر اسے کہا۔
امامہ نے نوٹس کیا تھا کہ وہ وہاں کام کرنے والے ہر شخص کے نام کے ساتھ صاحب لگا کر مخاطب کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ سنجیدہ لیکن قابل احترام بھی تھا۔ یہ تبدیلی عمر نے کر دی تھی یا سوچ نے، اسے اندازہ نہیں ہوا۔
دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد وہ جب اس کے ساتھ وہاں سے نکلی تو پہلی بار وہ اپنے دل میں اس کے لیے عزت کے کچھ جذبات بھی لیے ہوئے تھی۔
"یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟" اس نے راستے میں اس سے پوچھا تھا۔
"اپنی بخشش کے لیے۔" جواب غیر متوقع تھا مگر جواب دینے والا ابھی تو سالار سکندر تھا۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے رحم دل ہو۔" چند لمحے خاموش رہ کر امامہ نے اس سے کہا۔
"نہیں، رحم دل نہیں ہوں، نہ ترس کھا کر کسی کے لیے کچھ کر رہا ہوں، ذمہ داری سمجھ کر کر رہا ہوں۔ رحم دل ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔" آخری جملہ جیسے اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"کیسے شروع کیا یہ سب کچھ؟"
وہ اسے فرقان سے اپنی ملاقات اور اس پروجیکٹ کے آغاز کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ اس کے خاموش ہونے پر اس نے جیسے سراہنے والے انداز میں کہا "بہت مشکل کام تھا۔"
"نہیں، لائف اسٹائل بدلنا زیادہ مشکل تھا جو میرا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ سب کچھ آسان تھا۔"
وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس کا اشارہ جس طرف تھا، وہ سب کچھ یاد کرنا تکلیف دہ تھا۔
"ہر کوئی اس طرح کا کام نہیں کر سکتا۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا۔ سروس آف ہیومینٹی کسی کی چیک لسٹ پر نہیں ہوتی' میری چیک لسٹ پر بھی نہیں تھی۔ میں خوش قسمت تھا کہ آگئی۔" وہ ہنسا۔

"تم بہت بدل گئے ہو۔" امامہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا' وہ مسکرایا۔

"زندگی بدل گئی تھی' میں کیسے نہ بدلتا۔ نہ بدلتا تو سسرال سے آنے والے عید کے تحائف کے انتظار میں بیٹھا ہوتا۔" اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

امامہ نے اس کے طنز کا برا نہیں مانا۔

"میں مانتی ہوں کہ میں بہت ٹیپکل ہوں۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"ٹیپکل نہیں ہو' زندگی کو دیکھا نہیں ہے ابھی تم نے۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"کم از کم یہ تو نہ کہو' مجھے زندگی نے بہت کچھ دکھا اور سکھا دیا ہے۔" امامہ نے کچھ رنجیدگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"مثلاً" کیا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کیا نہیں سکھایا زندگی نے؟ گنوا نہیں سکتی میں بہت سبق سکھائے ہیں زندگی نے مجھے۔"

"سبق سکھائے ہوں گے۔ گر نہیں۔"

امامہ نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ سیدھی باتیں کبھی بھی نہیں کرتا تھا' لیکن وہ ایسی ٹیڑھی باتیں کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔

"اچھا لگ رہا ہوں کیا؟" سڑک پر نظریں جمائے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا؟" وہ اسے دیکھتے ہی بری طرح گڑبڑائی۔

"تم مجھے دیکھ رہی ہو' اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر بے اختیار ہنس پڑی۔ اس شخص میں کوئی بات ایسی تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ کئی سال پہلے آئی تھی' نہ اب آرہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اسے واقعی بے حد اچھا لگا تھا۔



عید کے چاند کا اعلان عشاء سے کچھ دیر پہلے ہوا تھا اور اس اعلان کے فوراً" بعد سکندر نے ان دونوں کو ایک دو گھنٹے کے اندر اندر اپنی شاپنگ مکمل کرکے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ ان کا خیال تھا' چند گھنٹوں کے بعد کی نسبت اس وقت شاپنگ کرنا ان دونوں کے لیے زیادہ محفوظ رہے گا۔ انہوں نے شاپنگ نہیں کی تھی بلکہ ایک ریسٹورنٹ سے ڈنر کیا۔ اس کے بعد مہندی لگوا کر اور چوڑیاں خرید کر وہ واپس آگئی تھی۔ سالار کم از کم آج رات واقعی محتاط تھا اور سکندر کی ہدایات کو نظرانداز نہیں کر رہا تھا' کیونکہ امامہ کے گھر میں مسلسل گاڑیوں کا آنا جانا لگا تھا اور وہ لوگ بھی ان ہی مارکیٹس میں جاتے تھے' جہاں پر سالار کی فیملی جاتی تھی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب وہ گھر پر تھے اور اس وقت گھر پر کوئی موجود نہیں تھا۔ سکندر' طیبہ کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر پر تھے اور باقی سب لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔

سالار پچھلے دو گھنٹے سے مسلسل مختلف لوگوں کی فون کالز سن رہا تھا۔ یہ سلسلہ گھر آنے تک جاری تھا۔ امامہ بے زار ہونے لگی تھی۔ اس نے خود گھر سے نکلنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی' ان کی بیٹیوں اور سعیدہ اماں کو کال کی تھی اور اس کے بعد اس کی کالز آنا بند ہو گئی تھیں۔ سالار نے البتہ فرقان اور انیتا سے بات کرتے ہوئے اس کی بات بھی ان لوگوں سے کروائی تھی۔

"چلو کافی بناتے ہیں اور پھر فلم دیکھتے ہیں۔" سالار نے بالآخر اس کی بے زاری کو محسوس کر لیا تھا۔
"میں ہاتھ دھولوں؟" امامہ نے ہاتھوں پر لگی مہندی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔۔۔ میں بناؤں گا کافی تم بس میرے ساتھ کچن میں آجاؤ۔"
"تم بنالو گے؟"
"بہت اچھی۔" اس نے اپنا سیل آف کرتے ہوئے ٹیبل پر رکھا۔
مہندی لگے ہوئے دونوں ہاتھ کچن کی ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے وہ اسے کافی بناتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کچن میں رکھے بلیک کرنٹ اور چاکلیٹ فج کیک کے دو ٹکڑے لے کر وہ کافی ٹرے میں رکھنے لگا تو امامہ نے کہا۔ "کچھ فائدہ ہوا میرے کچن میں آنے کا؟"
"ہاں تم نے مجھے کمپنی دی۔" اس نے ٹرے اٹھا کر اس کے ساتھ کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"تم اکیلے بھی بنا سکتے تھے خوامخواہ مجھے ساتھ لائے۔"
"تمہیں دیکھتے ہوئے زیادہ اچھی بنی ہے۔" وہ اس کی بات پر ہنسی۔
"یہ بڑی چیپ بات ہے۔"
"اوہ رئیلی۔۔۔ یہ تمہارے رومانٹک ناولز میں بھی تو ہیرو ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" اس نے امامہ کے چہرے پر غائب ہوتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر فوراً" اپنے جملے کی تصحیح کی۔
"تم میری بکس کی بات کیوں کرتے ہو؟" وہ بگڑی۔
"اوکے۔۔۔ اوکے، سوری۔" سالار نے ساتھ چلتے ہوئے ٹرے سے ایک ہاتھ ہٹا کر اس کے گرد ایک لمحہ کے لیے حمائل کیا۔
"کون سی موویز لی تھیں تم نے؟" بیڈروم میں آکر امامہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔
سالار نے مارکیٹ سے آتے ہوئے ایک مووی شاپ سے کچھ سی ڈیز لی تھیں۔ سی ڈی پلیئر پر مووی لگاتے ہوئے سالار نے ان موویز کے نام دہرائے۔ ریموٹ کنٹرول پکڑے وہ بیڈ سے کمبل اٹھا کر خود بھی صوفے پر آگیا تھا۔ اس کی اور اپنی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر اس نے کارنر ٹیبل پر پڑا کافی کا مگ اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھایا۔
"تم یہ پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے امامہ کو مہندی والے ہاتھوں سے مگ پکڑنے کی کوشش سے روکا۔
اسکرین پر فلم کے کریڈٹس چل رہے تھے۔ امامہ نے کافی کا گھونٹ لیا۔

"کافی اچھی ہے۔" اس نے ستائشی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔
"تھینک یو!" سالار نے کہتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا مگ اٹھا لیا۔
وہ اب اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ جہاں چارلیز تھیرون نظر آرہی تھی۔ امامہ نے اس کا انہماک محسوس کیا تھا۔ وہ کچھ بے چین ہوئی۔ وہ اس ایکٹریس کے نام سے واقف نہیں تھی۔
"یہ کون ہے؟" امامہ نے اپنا لہجہ حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
"تم نہیں جانتیں؟" سالار اب کانٹے کے ساتھ کیک کا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال رہا تھا۔
"نہیں۔"
"چارلیز تھیرون ہے۔ میرے نزدیک دنیا کی سب سے خوب صورت عورت۔ ہے۔" کیک امامہ کو کڑوا لگا تھا۔ وہ پھر اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔
"خوب صورت ہے نا؟" کیک کھاتے ہوئے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر اس نے امامہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے بس۔" اس نے سردمہری سے کہا۔
"مجھے تو خوب صورت لگتی ہے۔" اسکرین پر نظریں جمائے وہ بڑبڑایا۔
امامہ کی دلچسپی اب فلم سے ختم ہو گئی تھی۔
"خوب صورت ہے لیکن بری ایکٹریس ہے۔" چند سین گزرنے کے بعد اس نے کہا۔
"ایکٹریس چکی ہے۔" ابھی تک اس کی نظریں اسکرین پر ہی جمی تھیں۔ امامہ کو چار لیٹر اور بری لگی۔
"مجھے اس کی ناک اچھی نہیں لگ رہی۔" چند لمحے مزید گزرنے پر امامہ نے کہا۔
"ناک کو کون دیکھتا ہے؟" وہ اسی انداز میں بڑبڑایا۔ امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سالار سنجیدہ تھا۔
"پھر۔؟"
"مجھے بال پسند ہیں اس کے۔" امامہ دوبارہ اسکرین کو دیکھنے لگی۔
سالار کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے امامہ کو ساتھ لگایا۔
"تم ذرا بھی ذہین نہیں ہو۔"
"کیا ہوا؟" امامہ کو اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔
"کچھ نہیں ہوا۔ موی دیکھو۔" کیک کا آخری ٹکڑا اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔
امامہ نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر سی ڈی پلیئر بند کر دیا۔
"کیا ہوا؟" وہ چونکا۔
"فضول موی ہے بس تم باتیں کرو مجھ سے۔" امامہ نے جیسے اعلان کیا۔
"باتیں ہی تو کر رہا ہوں۔ مہندی خراب ہوئی ہو گی۔" سالار نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں سوکھ گئی ہے میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" وہ ریموٹ کنٹرول رکھتے ہوئے چلی گئی۔
چند منٹوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو موی دوبارہ آن تھی۔ امامہ کو آتے دیکھ کر اس نے موی آف کر دی۔
وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کافی پیتے ہوئے سالار نے اس کی مہندی والے ہاتھ باری باری پکڑ کر دیکھے۔
مہندی کا رنگ گہرا تو نہیں تھا لیکن بہت کھلا ہوا تھا۔
"تمہارے ہاتھوں پر مہندی بہت اچھی لگتی ہے۔"
اس کی ہتھیلی اور کلائی کے نقش و نگار پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ بلاوجہ مسکرا دی۔
"چوڑیاں کہاں ہیں؟" سالار کو یاد آیا۔
"پہنوں۔؟" وہ پُرجوش ہوئی۔
"ہاں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل پر کچھ دیر پہلے بازار سے خرید کر رکھی چوڑیاں دونوں کلائیوں میں پہن کر دوبارہ اس کے پاس آ گئی۔ اس کی کلائیاں یک دم سرخ چوڑیوں کے ساتھ سج گئی تھیں۔ اپنی کلائیاں سالار کے سامنے کر کے اس نے اسے چوڑیاں دکھائیں۔
"پرفیکٹ۔" وہ نرمی سے مسکرا دیا۔
کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کو چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک پانی کے ارتعاش کی طرح توڑنے لگی تھی۔ وہ اب اس کی چوڑیوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔
"معجزہ لگتا ہے یہ۔!" چند لمحوں بعد اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
اپنا بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس نے امامہ کو خود سے قریب کیا۔ سویٹر سے نکلے اس کی سفید شرٹ

کے کالر کو ٹھیک کرتے ہوئے امامہ نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس شخص سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن بار بار اس کی قربت میں ایسے ہی سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وجہ وہ رشتہ تھا جو ان دونوں کے درمیان تھا یا وہ زندگی جو وہ گزار کر آئی تھی یا کچھ اور۔۔۔؟ وہ نہیں جانتی تھی لیکن ہر بار اپنے گرد اس کا بازو اسے دیوار کی طرح محسوس ہوتا تھا جو وہ اس کے گرد کھڑی کر دیتا تھا۔

"ایک بات مانو گی؟" سالار نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے لاانعت سے کہا۔

"کیا؟" اس کے سینے پر سر رکھے امامہ نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔

"وعدہ کرو پہلے۔"

"او کے۔" امامہ نے بے اختیار وعدہ کیا۔

"فلم دیکھنے دو مجھے۔" وہ بے حد خفا ہو کر اس سے الگ ہوئی۔

"میں دیکھنے کے لیے لے کر آیا ہوں امامہ!" وہ سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"تم دوسری موویز بھی لے کر آئے ہو ان میں سے دیکھ لو کوئی۔"

"او کے ٹھیک ہے۔" امامہ حیران ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کیسے مان گیا تھا۔

سی ڈی پلیئر میں مووی تبدیل کر کے وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب خوش؟" اس نے امامہ سے پوچھا۔

وہ مطمئن انداز میں مسکا کر دوبارہ اس کے قریب ہو گئی۔ اس کے سینے پر سر ٹکائے اس نے فلم کے کریڈٹس چلتے دیکھے۔ وہ کریڈٹس پر غور کیے بغیر دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا۔ امامہ کو نیند آنے لگی اور اس کی آنکھ لگ جاتی اگر تیسرے سین میں اسے چارلیز تھیرن اسکرین پر نظر نہ آجاتی۔

کچھ کہے بغیر اس نے سر اٹھا کر سالار کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری تینوں موویز اسی کی ہیں۔" اس نے ایک شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دیکھنے دو یار۔" اس نے جیسے التجا کی تھی۔

امامہ نے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اسکرین کو دیکھا۔

"تعریف نہیں کرو گے تم اس کی۔"

"آئی پرامس۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"وہ خوب صورت نہیں ہے۔" امامہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سالار نے سنجیدگی سے تائید کی۔

"اور بری ایکٹریس ہے۔"

"بے حد۔" امامہ کو اس کی تائید سے تسلی ہوئی۔

"اور تم اسے اس طرح اب کبھی نہیں دیکھو گے جیسے پہلے دیکھ رہے تھے۔" اس بار سالار ہنس پڑا۔

"کس طرح دیکھتا ہوں میں اسے؟"

"تم دیکھتے نہیں گھورتے ہو اسے۔"

"کون ایسا نہیں کرے گا؟ وہ اتنی۔۔۔" سالار روانی میں کہتے کہتے رک گیا۔

"کم رو ناک خوب صورت ہے۔" امامہ نے اس کی بات مکمل کی۔

"میں تمہارے لیے اس کو بہن نہیں بنا سکتا۔"

"تو صرف ایکٹریس سمجھو اسے۔"

"ایکسٹرالیس ہی تو سمجھ رہا ہوں یار۔ چھوٹے میں نہیں دیکھتا۔ آدھی مووی تو ویسے ہی گزر گئی ہے۔" سالار نے اس بار کچھ خفا ہو کر ریموٹ کنٹرول سے مووی آف کی۔

امامہ بے حد مطمئن انداز میں صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب صوفے سے چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"کمبل لے آؤ گے نا تم؟" واش روم کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔

"جی لے آؤں گا میں کوئی اور حکم ہو تو وہ بھی دے دیں۔"

وہ کمبل اٹھاتے ہوئے خفگی سے بڑبڑایا تھا۔



سکندر نے عید کے تحفے کے طور پر اسے ایک بریسلیٹ دیا تھا اور سوائے سالار کے تقریباً" سب نے ہی اسے کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ امامہ کا خیال تھا' وہ اس بار ضرور اسے زیور میں کوئی چیز تحفے میں دے گا۔ اسے لاشعوری طور پر جیسے انتظار تھا کہ وہ اسے کچھ دے۔ اس نے اس بار بھی اسے کچھ رقم دی تھی۔ وہ کچھ مایوس ہوئی' لیکن اس نے سالار سے شکایت نہیں کی۔ اسے عجیب لگ رہا تھا کہ وہ خود اس سے کوئی تحفہ مانگے اور اسے حیرانی تھی کہ سالار کو خود اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔

عید کی رات، شہر کے نواح میں واقع سکندر عثمان کے فارم ہاؤس میں ایک فیملی ڈنر تھا۔ وہاں سالار کی بیوی کی حیثیت سے پہلی بار وہ متعارف ہوئی تھی اور طیبہ کے تیار کرائے ہوئے سرخ لباس میں وہ واقعی ایک نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ ڈیڑھ' دو سو کے قریب وہ سب افراد سالار کی ایکسٹینڈڈ فیملی تھے۔ امامہ کو اب احساس ہوا تھا کہ سالار کا اسے اسلام آباد لانے اور اس کی شناخت کو نہ چھپانے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اسے اس عزت و احترام کی اشد ضرورت تھی' جو اسے وہاں ملی تھی۔

اوپن ایریا میں ہارلیکیو ڈنر کے دوران اپنی پلیٹ لے کر وہ کچھ دیر کے لیے فارم ہاؤس کے برآمدے میں لکڑی کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک ہٹ کی طرح بنا ہوا فارم ہاؤس کا وہ حصہ اس وقت نسبتا" خاموش تھا۔ باقی افراد ٹولیوں کی صورت میں سامنے کھلے سبزے میں ڈنر کرتے ہوئے مختلف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

"تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئیں؟" امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔

"ایسے ہی... شال لینے آئی تھی... پھر یہیں بیٹھ گئی۔" وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پر رکھ دیا۔ امامہ لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے ایک گھٹنے پر کھانے کی پلیٹ ٹکائے' کھانا کھاتے ہوئے دور لان میں ایک کینوپی کے نیچے اسٹیج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی جو نئی غزل شروع کرنے سے پہلے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ سالار نے اس کا کانٹا اٹھا کر اس کی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ اب گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی نئی غزل شروع کر چکا تھا۔

"انجوائے کر رہی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پرنم ہے' محبت ہو گئی ہو گی
زباں پر قصہ غم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

وہ بھی سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے غزل سننے لگا تھا

کبھی ہنسنا' کبھی رونا' کبھی ہنس ہنس کر رو دینا
عجب دل کا یہ عالم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

"وہ چھا گا رہا ہے۔" امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔
سالار نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلا دیا۔

خوشی کا حد سے بڑھ جانا بھی اب اک بے قراری ہے
نہ غم ہونا بھی اک غم ہے محبت ہو گئی ہو گی

سالار سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے ہنس پڑا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا وہ جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔
"تمہیں کچھ دینا چاہ رہا تھا میں۔"
وہ جیکٹ کی جیب میں سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"بہت دنوں سے دینا چاہتا تھا میں لیکن۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔
اس کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی۔ امامہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تو بالآخر اسے اس کا خیال آ ہی گیا تھا۔ اس نے ڈبیا لیتے ہوئے سوچا اور اسے کھولا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ اندر ایئر رنگز تھے۔ ان ایئر رنگز سے تقریباً ملتے جلتے جو وہ اکثر اپنے کانوں میں پہنے رکھتی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔
"میں جانتا ہوں یہ اتنے ویلیو ایبل تو نہیں ہوں گے جتنے تمہارے فادر کے ہیں۔ لیکن مجھے اچھا لگے گا اگر کبھی کبھار تم انہیں بھی پہنو۔"
ان ایئر رنگز کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"تم نہیں پہننا چاہتیں تو بھی ٹھیک ہے۔ میں ریپلیس کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوں۔"
سالار نے اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتی نمی دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بہت ساری چیزیں پہلے ہی اپنی جگہ بدل چکی ہیں۔ اس کی خواہش اور ارادے کے نہ ہونے کے باوجود۔
کچھ کہنے کے بجائے امامہ نے اپنے دائیں کان میں لٹکتا ہوا جھمکا اتارا۔
"میں پہنا سکتا ہوں؟"
سالار نے ایک ایئر رنگ نکالتے ہوئے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔ سالار نے باری باری اس کے دونوں کانوں میں وہ ایئر رنگز پہنا دیے۔
وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ وہ بہت دیر تک مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔
"اچھی لگ رہی ہو۔"
وہ اس کے کانوں میں لٹکتے، ہلکورے کھاتے، موتی کو چھوتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔
"مجھ سے زیادہ کوئی تم سے محبت نہیں کر سکتا، کوئی مجھ سے زیادہ تمہاری پروا نہیں کر سکتا، مجھ سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتا تمہارا۔ میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔"
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اس سے کہہ رہا تھا، وعدہ کر رہا تھا یا یاددہانی کرا رہا تھا، کچھ جتا رہا تھا۔ وہ جھک کر اب اس کی گردن چوم رہا تھا۔
"مجھے نواز دیا ہے۔" سیدھا ہوتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔
"رومانس ہو رہا ہے؟" اپنے عقب میں آنے والی کامران کی آواز پر وہ ٹھٹکے تھے۔ وہ شاید شارٹ کٹ کی وجہ سے برآمدے کے اس دروازے سے نکلا تھا۔
"کوشش کر رہے ہیں۔" سالار نے پلٹے بغیر کہا۔
"گڈ لک۔" وہ کہتا ہوا ان کے پاس سے سیڑھیاں اترتا ہوا انہیں دیکھے بغیر چلا گیا۔
امامہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ جھینپ گئی تھی۔ سالار اور اس کی فیملی کم از کم ان معاملات میں بے حد

آزاد خیال تھے۔

کسی کو سامنے پاکر' کسی کے سرخ ہونٹوں پر
انوکھا سا تبسم ہے' محبت ہوگئی ہوگی

امامہ کو لگا کہ وہ زیر لب گلوکار کے ساتھ گنگنا رہا ہے۔

جہاں ویران راہیں تھیں' جہاں حیران آنکھیں تھیں
وہاں پھولوں کا موسم ہے' محبت ہوگئی ہوگی

لکڑی کی ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے' وہ خاموشی کو توڑتی' آس پاس کے پہاڑوں میں گونج کی طرح پھیلتی گلوکار کی سریلی آواز کو سن رہے تھے۔ زندگی کے وہ لمحے یادیں بن رہے تھے۔ دوبارہ نہ آنے کے لیے گزر رہے تھے۔

ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر لگنے والی ان دونوں کی پہلی اکٹھی تصویر اس فارم ہاؤس کی سیڑھیوں ہی کی تھی۔ سرخ لباس میں گولڈن کڑھائی والی سیاہ پشمینہ شال اپنے بازوؤں کے گرد اوڑھے' کھلے سیاہ بالوں کو کانوں کی لوؤں کے پیچھے کیے' خوشی اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک میں نہیں جھلک رہی تھی' بلکہ اس قرب میں تھی' جو اس کے اور سالار کے درمیان نظر آرہا تھا۔ سفید شرٹ اور سیاہ جیکٹ میں اسے اپنے ساتھ لگائے سالار کی آنکھوں کی چمک جیسے اس فوٹو گراف میں موجود ہر شے کو مات کررہی تھی۔ کوئی بھی کیمرے کے لیے بنائے ہوئے اس ایک پوز میں نظر آنے والے کپل کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ضرور ٹھٹکتا۔

سکندر نے اس فوٹو گراف کو فریم کروا کر انہیں ہی نہیں بھیجا تھا' بلکہ انہوں نے اپنے گھر کی فیملی وال فوٹوز میں بھی اس تصویر کا اضافہ کیا تھا۔



لاہور واپسی پر عید ڈنرز کا ایک لمبا سلسلہ تھا' جو شروع ہوگیا۔ وہ امامہ کو اپنے سوشل اور بزنس سرکل میں متعارف کروا رہا تھا اور وہ اس سرکل میں اچانک بہت حواس باختہ ہونے لگی تھی۔ وہ کارپوریٹ سیکٹر' بینکرز اور بزنس ٹائیکونز کی فیملیز پر مشتمل تھا۔ پاکستان کی امیر ترین اور شاید گمراہ ترین کلاس' ہائی کلاس پروفیشنلز۔۔۔ جو ایک کو دو اور دو کو چار نہیں کرتے تھے' بلکہ ایک کو سو اور سو کو لاکھ کرنے کے گر سے آگاہ تھے اور بینکنگ سیکٹر کی کریم۔۔۔ جن کی بیوی' منگیتر' گرل فرینڈ اور سیکریٹری میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ صرف وہ سروں کے لیے ہی نہیں خود ان کے اپنے لیے بھی' اپنے ساتھ لے کر آنے والی عورت سے اس کا رشتہ جو بھی ہوتا' ان فنکشنز میں ان عورتوں کا کام ایک ہی ہوتا تھا۔ وہ اپنی خوب صورتی' بے تکلفی اور گرم جوشی سے' اپنے نیم عریاں لباس' اپنی زبان اور آواز کی مٹھاس سے' اپنے بلند و بانگ قہقہوں سے اور اپنی اداؤں سے اپنے شوہر' منگیتر' بوائے فرینڈ یا باس کے بزنس کانٹیکٹس میں اضافہ کرتی تھیں۔ Trophy Wife والے شوہر کامیابی کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتے تھے۔

عید کے چوتھے دن وہ اسے پہلی بار اپنے ہی بینک کی طرف سے دیے گئے عید کے ڈنر میں لے کر گیا تھا اور ایک بڑے ہوٹل میں ہونے والے اس ڈنر میں جاتے ہی امامہ کو پسینہ آنے لگا تھا۔ بیدرنگ کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھا اور وہ اگر ایوننگ گاؤنز اور اسکرٹس میں ملبوس تھیں تو وہ حیرت کا شکار نہیں ہوئی تھی لیکن اسے نروس کرنے والی چیز ان دوسری خواتین اور بیگمات کا حلیہ تھا جو پاکستانی تھیں۔ وہ فیملی ڈنر تھا۔ کم از

کم سالار اسے یہ ہی جتا کر وہاں لایا تھا' لیکن وہاں آنے والی فیملیز کون تھیں' یہ اس نے اسے نہیں جتایا تھا۔ گہرے گلے والے اور بغیر آستین والے مختصر بلاؤزز' بیک لیس گاؤنز' سٹرنگ ٹاپس اور آف دا شولڈر ڈریسز میں ملبوس' پاکستان کی خاندانی خوب صورت عورتوں کا اتنا بڑا مجمع اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اسے لگا تھا جیسے وہ مس ورلڈ کے مقابلہ حسن میں آگئی ہو۔ وہاں موجود عورتیں بیس سے ساٹھ سال تک کی عمر کے درمیان تھیں اور یہ ہی طے کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا کہ کون عمر کی کس سیڑھی پر کھڑی ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے ہاتھ میں ڈرنکس لیے' وہ گرم جوشی اور بے تکلفی کے ساتھ مختلف مردوں سے گلے ملتے ہوئے گفتگو میں مصروف تھیں۔ شیفون کے لباس کے اوپر دوپٹا اوڑھے امامہ کو اپنا آپ الوباٹا لگا۔

وہاں کھڑے اس نے جیسے خود کو جانچنا شروع کردیا تھا اور وہیں کھڑے اس نے پہلی بار سالار اور اپنے حلیے کے فرق کو بھی کو نوٹس کیا تھا۔ ایک برانڈڈ سیاہ ڈنر سوٹ میں سرخ دھاری دار ٹائی کے ساتھ وہ بالکل اس ماحول کا حصہ لگ رہا تھا' گرینڈ اور پولشڈ۔ وہاں کھڑے اس پر یہ ہولناک انکشاف بھی ہوا کہ اس کا حلیہ سالار کی اس لک کے ساتھ میچ نہیں کرتا۔

وہ اوڈ کپل تھے۔ اسے احساس کمتری کا دوسرا دورہ بڑی غلط جگہ اور بڑے ہی غلط وقت پر پڑا تھا۔

وہ اس کا تعارف باری باری مختلف لوگوں سے کروا رہا تھا اور امامہ اس پذیرائی اور گرم جوشی پر حیران تھی' جو اسے مل رہی تھی۔ پھر یک دم اسے احساس ہونے لگا کہ اس گرم جوشی کی وجہ "بھی سالار سکندر تھا۔ یہ پروٹوکول مسز سالار سکندر کے لیے تھا۔ امامہ ہاشم کے لیے نہیں۔ یہ ٹیگ جس کے گلے میں بھی لٹکا ہوتا' اسے یہ ہی پروٹوکول ملتا۔ چاہے اس کا حلیہ اس سے بھی بدتر ہوتا' اس کا احساس کمتری پارے کی طرح اوپر جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پی آر میں ہونے کی وجہ سے اتنا سوشل ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا شوہر پاکستان میں بینک کے چند کلیدی عہدوں میں سے ایک پر براجمان تھا اور اس کے پاس آنے والے لوگوں کی خوش اخلاقی اور گرم جوشی دکھانے کی وجوہات کچھ اتنی فطری نہیں تھیں۔

سالار کے ساتھ کھڑے اسے اپنے ہی حلیے کی چند اور خواتین بھی بالآخر اس مجمع میں نظر آگئی تھیں اور ان کی موجودگی نے اسے کچھ حوصلہ دیا کہ اس جیسے اور بھی اوڈ کپلز وہاں موجود تھے۔

"ڈرنک پلیز!" مشروبات کی ٹرے پکڑے ویٹر نے بالکل اس کے پاس آکر اس سے کہا۔ وہ چونکی اور اس نے ٹرے پر نظر دوڑائی۔ وائن گلاس میں ایپل جوس تھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھالیا۔ ویٹر اب ان کے اردگرد کھڑے چند غیر ملکی افراد کو ڈرنکس پیش کر رہا تھا۔

اپنے سامنے کھڑے ایک غیر ملکی جوڑے سے باتیں کرتے ہوئے سالار نے۔ بے حد غیر محسوس انداز میں امامہ کو دیکھے بغیر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ وہ چونک اٹھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ شاید خود پینا چاہتا ہے لیکن اس کا گلاس ہاتھ میں لیے وہ اسی طرح اس جوڑے سے باتیں کرتا رہا۔ ویٹر دائرے میں کھڑے تمام افراد کو سرو کرتے ہوئے سالار کے پاس آیا۔ سالار نے امامہ کا گلاس بے حد غیر محسوس انداز سے ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے ویٹر سے کہا۔

"سوفٹ ڈرنکس پلیز!"

امامہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ٹرے میں رکھا اپنا گلاس اس نے دور جاتے دیکھا۔ پھر اس نے سالار کو دیکھا' وہ اب بھی ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ ویٹر چند لمحوں کے بعد ایک دوسری ٹرے لیے موجود تھا۔ اس بار اس کے گلاس اٹھانے سے پہلے ہی سالار نے ایک گلاس اٹھا کر اسے دیا اور دوسرا خود پکڑلیا۔

"ووف ہیلو۔۔۔ سالار!" وہ چالیس' پینتالیس سال کی ایک عورت تھی' جس نے سالار کے قریب آتے ہوئے

اس سے ہاتھ ملایا اور پھر بے حد دوستانہ انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ وہاں موجود دوسرے مردوں کی طرح عورتوں سے گلے نہیں مل رہا تھا لیکن ان میں سے وہ عورتوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور کئی عورتیں اس سے بات کرتے ہوئے اسی طرح بے تکلفی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں۔ امامہ کے لیے فی الحال اتنا کچھ ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ سب وہ ہضم کر لیتی اگر ان کا لباس اتنا قابل اعتراض نہ ہوتا۔

"مجھے کسی نے تمہاری بیوی کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے لیے ایک بڑی خبر ہے۔ کب شادی کی تم نے؟"

وہ عورت اب اس سے کہہ رہی تھی۔ سالار نے جواب "بے حد شائستگی سے امامہ سے اس کا تعارف کروایا۔

مسز لئیق نے اس سے ملتے ہوئے اسے ڈنر پر مدعو کیا۔ سالار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی دن طے کیے بغیر دعوت قبول کر لی۔ وہ پچھلے پندرہ منٹ سے اسے ایسے ہی کئی دعوتیں اسی طرح قبول کرتے دیکھ چکی تھی۔ مسز لئیق اب گروپ میں کھڑے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیلو ہائے میں مصروف تھیں۔ تب اس نے اپنے عقب میں کسی کو دیکھ کر سالار کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"ہائے رمشا!"

امامہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔

"او ہائے۔" رمشا بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف آئی۔

سالار نے دونوں کا ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ رمشا بڑی خوش دلی سے اس سے ملی۔

"بڑی لکی ہیں آپ۔ اگر آپ اسے پہلے نہ ملی ہوتیں تو اس بندے سے میں نے شادی کر لینی تھی۔" رمشا نے بڑی بے تکلفی سے امامہ سے کہا۔ "بس۔ کچھ دیر ہو گئی مجھے سالار سے ملنے میں۔"

وہ بھی جواباً خوش دلی سے ہنسا تھا۔

"ولیمہ کب ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"بیس تاریخ کو اسلام آباد میں۔" وہ سالار سے کہہ رہی تھی۔

امامہ نے اس بار سالار کو اسے ٹالتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ملاقات طے کر رہا تھا۔ اس کے پاس آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی، جس کے ساتھ سالار کا رویہ کچھ زیادہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا۔ رمشا گروپ میں موجود دوسرے لوگوں سے ملنے کے بعد ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف جا رہی تھی۔ امامہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔



"کوئی بات کرو۔" وہاں سے واپسی پر سالار نے اس کی خاموشی محسوس کی۔

"کیا بات کروں؟"

"کوئی بھی۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"عجیب لوگ۔ تھے سارے۔" کچھ دیر بعد سالار نے اسے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"عجیب کیوں؟"

"تمہیں عورتیں، اس طرح کے لباس میں یہ سب کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم نے وہ پہنا جو تمہیں اچھا لگا اور انہوں نے بھی وہی پہنا جو انہیں پسند تھا۔"

اس نے بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔ کم از کم وہ اس سے ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ "تمہیں کچھ برا

نہیں لگا؟"

"میرے لیے وہ سب ریسپیکٹ ایبل لوگ تھے۔ کچھ میرے کلائنٹس تھے' کچھ کو میں ویسے ہی جانتا ہوں۔"

"تمہیں برا کیوں لگے گا سالار۔۔۔ تم مرد ہو' تمہیں تو بہت اچھا لگے گا اگر تمہیں عورتیں اس طرح کے کپڑوں میں نظر آئیں گی۔"

بات کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کا جملہ کتنا سخت تھا۔ سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں ایسی گیدرنگز میں مرد بن کر نہیں جاتا' مہمان بن کر جاتا ہوں اور مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ کس نے کیا پہنا ہے اور کیا نہیں۔۔۔ میرے لیے ہر عورت بغیر اپنے پہناوے کے قابل احترام ہے۔ میں لباس کی بنا پر کسی کا کردار نہیں جانچتا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم نے دوپٹا لیا ہوا ہے تو تم قابل عزت ہو۔ اور وہ عورت جو ایک قابل اعتراض لباس پہنے ہوئے ہے وہ قابل عزت نہیں ہے۔ تو تم بالکل غلط ہو۔"

وہ بول نہیں سکی۔ سالار کے لہجے میں اتنے دنوں میں اس نے پہلی بار ترشی محسوس کی تھی۔

"تمہیں کیسا لگے گا اگر کوئی تمہارے پردے کی وجہ سے تمہارے بارے میں یہی بات کہے' جیسی تم ان کے بارے میں کہہ رہی ہو۔"

"تم ان کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟" وہ جھنجلائی۔

"میں کسی کی حمایت نہیں کر رہا' صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے' یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ سب پسند ہے؟" وہ اس کے سوال پر ہنسا تھا۔

"یہ ایشو نہیں ہے۔ مجھے یہ سب اپنی زندگی کے لیے پسند نہیں ہے لیکن مجھے ایسے ڈنر میں اس لیے جانا پڑتا ہے' کیونکہ مجھے اپنی جاب کی وجہ سے کسی حد تک سوشل رہنا ہے' لیکن میں کسی گیدرنگ میں جا کر یہ طے نہیں کرتا پھرتا کہ ان میں سے کتنے لوگ دوزخ میں جائیں گے اور کتنے جنت میں۔ مجھے جن سے ملنا ہوتا ہے' ملتا ہوں' کھانا کھاتا ہوں اور آجاتا ہوں۔ میں اپنے سر پر دوسروں کے اعمال کا بوجھ لے کر نہیں آتا۔" وہ اپنی زندگی کی فلاسفی سے اسے پھر حیران کر رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

"اگر میں تمہاری زندگی میں نہ آتی اور تمہیں شادی کرنی ہوتی تو اس طرح کی لڑکیوں سے کر لیتے' جو آج وہاں تھیں؟"

وہ رمشا کا نام لینا چاہتی تھی لیکن اس نے نہیں لیا۔ وہ خود بھی جان نہیں پائی کہ اس نے یہ سوال سالار سے کیا سننے کے لیے کیا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں پردہ کرنے والی یا پردہ نہ کرنے والی لڑکی میں کس سے شادی کرتا۔" سالار نے براہ راست سوال کر دیا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ واقعی یہی پوچھنا چاہتی تھی۔

"ہنسٹلی' تمہیں ایک بتاؤں۔۔۔ میں کسی عورت کا صرف پردہ دیکھ کر اس سے شادی نہ کرتا۔ کسی عورت کا پردہ کرنا یا نہ کرنا شاید میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے' جتنا اس میں کچھ دوسری خوبیوں کا ہونا۔" اسے آج شاک پر شاک لگ رہے تھے۔

"اگر ایک عورت اللہ کے احکامات پر عمل کرتی ہے' سر اور جسم چھپاتی ہے' اچھی بات ہے لیکن میں اس ایک چیز کے علاوہ بھی اس عورت میں کچھ اور خوبیاں چاہتا جس سے میں نے شادی کرنی ہوتی۔"

"کیسی خوبیاں؟" اسے تجسس ہوا تھا۔
"صبر، برداشت اور اطاعت۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔
"یہ دونوں نادر کوالٹیز ہیں۔ باقی سب کچھ ہوتا ہے لڑکیوں میں۔ ڈگریز اور لُک۔ اور مینرزم اور پردہ بھی۔ لیکن یہ دو کوالٹیز ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔" اگر اسے کوئی زعم تھا تو ختم ہو گیا تھا۔ وہ جن دو خوبیوں کو اپنی ترجیح بتا رہا تھا' وہ اس میں بھی نہیں تھیں۔ یا کم از کم سالار کے لیے فی الحال نہیں تھیں۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔
"میں کیوں اچھی لگی تمہیں؟" اس نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔
"خالی پردہ تمہیں امپریس نہیں کرتا۔ تحمل اور اطاعت تو میں نے کبھی تمہیں، کبھی نہیں دکھائی۔ پھر۔۔۔؟"
"پتا نہیں' یہ وہ سوال ہے جس کا جواب مجھے کبھی نہیں ملا۔ ایک بار نہیں' کئی بار میں نے اپنے آپ سے یہی ایک بات پوچھی ہے۔ تمہیں ناپسند کرنے کی بے شمار وجوہات بتا سکتا ہوں' لیکن پسند کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ایک بھی وجہ نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی منطقی جواز۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"پہلے تم مجھے intrigue کرتی تھیں۔ پھر تم مجھے irritate کرنے لگیں۔ اس کے بعد تم مجھے haunt کرنے لگیں۔ پھر میں تم سے جیلس ہونے لگا۔ پھر envy کرنے لگا۔ اور پھر محبت۔۔۔" وہ جیسے قدرے بے بسی سے ہنسا۔
"ان ساری اسٹیجز میں صرف ایک چیز کامن تھی۔ میں تمہیں کبھی بھی اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا۔ مجھے تمہارا خیال آتا تھا اور آتا رہتا تھا اور بس میرا دل تمہاری طرف کھنچتا تھا۔ خوار تو کرنا تھا اللہ نے مجھے' میری اوقات بتا کر۔ بس اور کوئی بات نہیں تھی۔ اس لیے یہ تو کبھی پوچھو ہی مت کہ کیوں اچھی لگی تھیں تم مجھے۔" وہ محبت سے زیادہ بے بسی کا اظہار تھا اور اظہار سے زیادہ اعتراف۔
"اور اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا تو پھر تم میرے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرتے' مثلاً "رمشا سے۔"
سالار نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔
"تو یہ سوال رمشا کی وجہ سے ہو رہے تھے۔ یو آر سلی۔"
"تمہیں پسند ہے نا وہ؟" وہ اس کی ہنسی اور جملے کو نظرانداز کر کے سنجیدہ ہی رہی۔
"ایک دوست اور کولیگ کے طور پر۔" سالار نے کہا۔
امامہ نے جواباً" کچھ نہیں کہا۔ سالار کو لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔
"کیا ہوا؟" سالار نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ کھڑی وہ بہت اچھی لگی تھی مجھے اور پھر۔۔۔"
"بعض دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے بہت سے لوگ اچھے لگتے ہیں' حتی کہ دو دشمن بھی ساتھ ساتھ کھڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"کچھ نہیں۔ ایسے ہی خیال آیا تھا۔"
"میں' تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں امامہ! یہ میری زندگی کا سب سے اچھا وقت ہے۔ فی الحال دنیا میں اور کوئی ایسی شے' نہیں ہے جس کی مجھے کمی محسوس ہو رہی ہو۔ اس لیے تم اپنے اندازوں اور خیالوں سے باہر آجاؤ۔ ڈنرز میں جاؤ' کھانا کھاؤ' لوگوں سے گپ شپ کرو۔ اینڈ ویش اٹ۔ اس دنیا کو اپنے ساتھ گھر لے کر مت آؤ۔"
اس رات سونے سے پہلے ناول پڑھتے ہوئے وہ سالار کے ساتھ ہونے والی اسی گفتگو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ ناول سے نظریں ہٹا کر وہ سالار کو دیکھنے لگی' وہ اپنے کام میں

منہمک تھا۔

"سالار... "اس نے کچھ دیر کے بعد اسے مخاطب کیا۔

"ہاں۔" اسی طرح کام کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم اچھے انسان ہو ویسے۔" اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"اچھا۔" وہ اسی طرح مصروف تھا۔ کسی ردعمل کے اظہار کے بغیر ایسی میں کرتے ہوئے امامہ کو لگا کہ شاید اس نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ "میں نے تمہاری تعریف کی ہے۔" اس نے دہرایا۔

"بہت شکریہ۔" اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی سرسری تھا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" اس کا اتنا نارمل رہنا ہے امامہ سے ہضم نہیں ہوا تھا۔

"کس چیز سے؟" وہ چونکا۔

"میں نے تمہاری تعریف کی۔"

"اور میں نے تمہارا شکریہ ادا کر دیا۔"

"لیکن تمہیں اچھا نہیں لگا؟" وہ کچھ متجسس تھی۔

"کیا اچھا لگتا مجھے۔ میری باتیں سن کر اچھا کوئی کہہ رہی ہو، عمل دیکھ کر کہتیں، تب خوشی ہوتی مجھے اور فی الحال میں ایسا کوئی عمل تمہیں پیش نہیں کر سکتا۔"

امامہ بول نہیں سکی، وہ پھر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھا۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر اس نے کہا۔

"تم نے میرے ہاتھ سے وہ ڈرنک کیوں لے لی تھی؟" اسے اچانک یاد آیا تھا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے شوٹ کر دو۔" وہ اس کے بے تکے جواب پر حیران ہوئی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"شراب تھی وہ۔" وہ ہل نہیں سکی۔

"سوری۔" سالار نے اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس سے معذرت کی۔ امامہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"ان پارٹیز میں ہارڈ ڈرنکس بھی ہوتے ہیں، سوشل ڈرنک سمجھی جاتی ہے یہاں۔" وہ سنجیدگی سے اسے بتاتے ہوئے دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

امامہ کا دل یک دم جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار شراب دیکھی تھی۔ اس نے شراب ہاتھ میں لی تھی۔ اگر وہ سالار کے ساتھ کھڑی نہ ہوتی تو شاید پی بھی لیتی۔ اس کا شوہر ان پارٹیز میں جانے کا عادی تھا اور ان پارٹیز میں وہ کہاں تک ایسی چیزوں سے اجتناب کرتا تھا یا کرپاتا تھا۔ اس کا اعتماد پھر لرزنے لگا تھا۔

وہ چند ہفتوں میں کسی کا کردار نہیں جانچ سکتی تھی۔ وہ بھی تب، جب وہ اسے شادی کے اس پہلے مہینے میں مکمل طور پر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحے پہلے دل میں سالار کے لیے نمودار ہونے والا احترام سیکنڈز میں غائب ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

موازنہ

ریحانہ اسلم

آج شاید دن اچھا تھا۔ ابھی صرف تین بجے تھے، اور شائلہ سارے کام سے فارغ تھی۔ لاریب امتحان سے فارغ ہو کر آج اپنی دوست کے ہاں گئی تھی اور کامی کو کالج سے سیدھے ٹیوشن جانا تھا کہ اس کے امتحان سر پر تھے۔ رہے اکرم صاحب تو انہوں نے تو دس بجنے سے پہلے کیا ہی آنا تھا۔

ایک آسودہ اور جاندار مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اس نے کافی بنائی۔ فریج سے سلائس اور سینڈوچ کے لیے کھیرا اور چکن نکالا۔ مزے سے اپنے لیے سینڈوچ تیار کیے اور لاؤنج میں آگئی۔ بڑے چاؤ سے ٹرے میز پر رکھی اور رغبت سے کھانے لگی۔

اچانک ہی اس کی نظر لاریب کی سائنس کے جرنل پر پڑ گئی۔ بے توجہی سے اسے اٹھا کر کھولا۔ پہلے ہی صفحے پر جاندار اور بے جان اشیا کا موازنہ لکھا ہوا تھا۔ شائلہ کا ذہن سالوں پیچھے چلا گیا۔

وہ کتنی چلبلی طالبہ ہوا کرتی تھی۔ تک بندی کرنا، قافیے ملانا، موازنے اور ان کے نئے نئے نام رکھنا اس کا خاص شوق تھا۔ جس کی تعریف اس کی اساتذہ کیا



کرتی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ اس نے ایک بار سنجیدہ اور غیر سنجیدہ خواتین کا موازنہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ سنجیدہ عورت وہ ہوتی ہے جو ہنسنے والی بات پر ایسا منہ بنائے کہ سامنے والے کو رونا آجائے اور غیر سنجیدہ وہ ہوتی ہے جو اس طرح ہنسے کہ لگے ڈھول پھٹ گیا ہے۔ اس نے کرکٹ اور کوڑا کرکٹ کا بھی موازنہ لکھا تھا۔

یادیں تھیں کہ تواتر سے اس کا پیچھا کررہی تھیں۔ پھر پتا نہیں کیوں اس نے کچھ صفحات نکال لیے اور پین اٹھا کر ایک شوہر اور بیوی کا موازنہ لکھنا شروع کردیا۔

بیوی ایک شاعرانہ مزاج کی ہنسنے ہنسانے والی عورت ہوتی ہے۔

شوہر صرف گانے سنتے ہیں وہ بھی عامیانہ سے۔

چھوٹی چھوٹی خوشیاں' پیار بانٹنا اور موقع کے لحاظ سے تحفے تحائف دینا بیوی کو بہت پسند ہوتا ہے۔

شوہر کی نظر میں یہ سب فضولیات اور پیسے کا زیاں ہوتا ہے' بلکہ چھچھوراپن ہوتا ہے۔

بیوی کا نظریہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی اچھائی کی تعریف کھلے دل سے کرنی چاہیے' اس سے حوصلہ بڑھتا ہے۔

کسی کو سر پر چڑھانا مجھے پسند نہیں' اس لیے میں کسی کی تعریف کبھی نہیں کرتا' شوہر کا کہنا ہوتا ہے۔

کھانے کی میز سلیقے سے سجا کر سلاد وغیرہ بنا کر بیوی داد طلب نظروں سے دیکھتی ہے۔

کھانا تو کھانا ہے معدے میں جا کر ہضم ہوجاتا ہے۔ شوبازی تو مجھے زہر لگتی ہے' شوہر فرماتے ہیں۔

سال میں ایک دو بار شاپنگ پہ جانا تو حق بنتا ہے۔ بیوی کی بڑی امنگ ہوتی ہے۔

مجھے عورتوں کے ساتھ بازاروں میں پھرنا پسند نہیں۔ چلی جاؤ کسی بہن کے ساتھ۔ یوں بھی مجھے شاپنگ کی تمیز نہیں شوہر کا ورا جواب ہوتا ہے۔

ڈرامے دیکھتے ہوئے وہ کرداروں پر تبصرہ کرتی ہے کہ کہیں تو خاموشی کا قفل کھلے۔

کتنا بولتی ہو' تم کیا چپ رہ کر ڈراما نہیں دیکھ سکتیں۔ ہر ڈرامے کے وقت شوہر کا یہی بیان ہوتا ہے۔

یہ اور بات ہوتی ہے کہ کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے جلد آؤٹ ہونے یا کیچ چھوڑنے پر وہ شور مچاتے ہیں۔۔۔ کہ بندہ کانوں کو ہاتھ لگا لے۔

بیوی کی مدھر ہنسی کی اکثر لوگ تعریف کرتے ہیں۔

کیا بچوں کی طرح کھی کھی کرتی رہتی ہو' تمیز سے رہا کرو۔ یہ بچپنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ شوہر کا یہ تبصرہ ہوتا ہے۔

انسان کو جینے کے لیے کھانا چاہیے۔ وہ اکثر سبزی پکالیتی ہے۔

یہ گھاس پھونس تم ہی کھالیا کرو' میرے آگے نہ رکھا کرو' شوہر فرماتے ہیں۔

بیوی کا دل گھومنے پھرنے کو چاہتا۔ وہ پکنک کا پروگرام بناتی ہے۔

میچ شروع ہوگئے ہیں۔ شوہر معذرت کرلیتے ہیں۔

بیوی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے رابطے میں رہنا چاہتی ہے۔

شوہر کو ہر ایک کے عیب گنوانے کا شوق تھا اور ہر ایک سے گھلنا ملنا پسند نہیں ہوتا ہے۔

مگر

تیئس سال سے وہ دونوں ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے کیونکہ جب شافعہ کو اکرم کی خوبیوں سے آگاہی ہوئی تو گزرتے وقت نے اس کی جھولی میں دو پھول سے بچے ڈال دیے تھے اور اس کی پہلی ترجیح ان کی پرورش تھی کہ وہ اب ایک ماں تھی اور اسے اپنے لیے نہیں بچوں کے لیے جینا تھا اور ویسے بھی اس فرق کے باوجود عورت ان سب باتوں پر سمجھوتا کرلیتی ہے' کیونکہ شادی شدہ زندگی میں یہ باتیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں۔ شوہر گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں خندہ پیشانی سے اٹھالے بس!

اس نے اپنے لکھے ہوئے موازنے کو حسرت سے دیکھا اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔



مہک فاطمہ

فیصلہ

"آپا! بس میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں یہ رشتہ کسی صورت قائم نہیں رکھ سکتی۔ میں اشعر کی منگنی توڑنا چاہتی ہوں۔" انیسہ بیگم کا لہجہ حتمی تھا۔

"ادھر شادی کی تاریخ طے ہے ادھر تم منگنی توڑنے کی بات کر رہی ہو؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" نفیسہ آپا بوکھلا گئیں۔ "کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟ کل سے، فون پہ یہ بات کہہ کر مجھے بھی ہولا رکھا ہے۔" ان کے استفہامیہ انداز میں بے کلی تھی۔

"آپا! ان لوگوں نے ہم سے جھوٹ بولا ہے۔ پہلے انہوں نے کہا کہ لڑکی کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دی ہے۔ چلیں، اس بات پہ تو ہم نے جیسے تیسے سمجھوتا کر لیا، لیکن اب مجھے بڑے پکے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ لڑکی کی ماں نے خلع لی تھی۔" انیسہ بیگم نے ایک ہی سانس میں ساری بات بتا کر اپنے تئیں جیسے دھماکا کیا۔

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ میں سمجھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔" نفیسہ آپا نے بظاہر تو پرسکون سا سانس بھرا، لیکن اندر سے کھٹک وہ بھی گئی تھیں، لیکن وہ اپنے تاثرات ظاہر کر کے بہن کی جذباتیت کو مزید شہ نہیں دینا چاہتی تھیں۔

"یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے آپا! جس لڑکی کی ماں گھر نہ بسا سکی، وہ لڑکی کیا گھر بسائے گی۔ میرا تو ہے بھی اکلوتا بیٹا اگر کل کلاں کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو۔۔"

انیسہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا جو انہیں بے چین کیے ہوئے تھا۔ اللہ اللہ کر کے تو انیسہ بیگم کو اپنے بیٹے کے لیے کوئی لڑکی پسند آئی تھی اور اب بات شادی تک پہنچنے سے پہلے ہی بگڑتی بلکہ ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

یہ بات انہیں الگ دہلا رہی تھی۔

"افسوس ہے انیسہ! تمہاری سوچ پہ بھی۔ اگر مرد طلاق دے تب بھی عورت عیب دار اور اگر عورت خود اپنے حق علیحدگی کا استعمال کرے پھر بھی وہ گناہ کی مرتکب ٹھہرتی ہے۔ معاشرے کی نظر میں۔ اب جو ہوا اس میں لڑکی بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں اور پھر کون جانے اس کی ماں کے ساتھ کیا مسائل ہوئے جو اسے خلع لینی پڑی، بہرحال یہ چھوٹی سی غلط بیانی کر کے کی تو انہوں نے بے وقوفی ہے۔ ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتیں، مگر جو لیا جو تم کرنے جا رہی ہو یہ اس سے بھی بڑی غلطی ہے۔ تم خود کو ان کی جگہ رکھ کے دیکھو۔ ان کے ذہن میں بھی کئی خدشات ہوں گے جن کے سبب انہوں نے یہ جھوٹ بولا۔"

نفیسہ آپا اپنی معاملہ فہم طبیعت کے مطابق مسئلے کو پرکھ چکی تھیں اور اب بہن کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آپا کی بات باوزن تھی۔ انیسہ جیسے سوچ میں پڑ گئیں۔ انہیں سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر نفیسہ دوبارہ بولیں۔

"اشعر کیا کہتا ہے اس بارے میں۔"

"وہ تو کہہ رہا تھا کہ آپ کی مرضی ہے جو چاہیں فیصلہ کریں۔" اشعر کے نام پر ان کی آنکھوں اور لہجے میں مٹھاس اتر آئی تھی۔ "ویسے مجھے تو حیرت ہے کہ اشعر کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات ہی نہیں۔ اس نے بات کو ہنس کے اڑا دیا۔" انہیں اشعر کے تاثرات پر حیرانی بھی تھی۔

"ہاں تو کوئی بڑی بات ہو تو بڑی لگے ناں۔" نفیسہ آپا بھی ہولے سے ہنس دیں، لیکن انیسہ کے تو جیسے سر

پہ گویعنی کوئی ان کی بات ہی نہیں سمجھ رہا تھا۔ سب نے انہیں احمق سمجھ رکھا تھا۔

"آپا! مجھے اس بات پہ بہت غصہ ہے کہ انہوں نے پہلے ہی مرحلے پہ ہم سے جھوٹ بولا۔ آگے نہ جانے کیا کریں گے۔" نفیسہ نے اپنے اشتعال کا سبب جتاتے ہوئے ایک اور خدشہ ظاہر کیا۔

"ہاں یہ تو غلط کیا انہوں نے اس معاملے پہ ہم سلیقے سبھاؤ کے ساتھ بات کریں گے ان سے جو بھی شکوہ



شکایت ہے دور ہو جائے گی۔" نفیسہ آپا نے مصلحت اور حکمت سے اس مسئلے کا بھی حل پیش کیا۔

"میں ان سے بات کر چکی ہوں۔" انیسہ نے ہولے سے جواب دیا۔

"تو کیا کہا انہوں نے۔" نفیسہ نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"اس کی ماں اور نانی دونوں ہی شرمندہ تھیں اور معذرت بھی کر رہی تھیں غلط بیانی پہ اس کی ماں تو رو رو کے صفائیاں دینے لگی۔ اپنے سابقہ شوہر اور سسرالیوں کے ڈھائے جانے والے مظالم کی داستانیں سنانے لگی۔" انیسہ نے سر جھٹک کے گہری سانس بھری۔ "لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں آپا! ان کی طرف سے میرا دل صاف نہیں ہو پا رہا۔ ایک بدگمانی کی تہہ سی جم گئی ہے میرے ذہن میں۔" ان کے لہجے کی گہرائی میں اک بے چارگی تھی جس کا محرک بھروسے کا ٹوٹنا تھا۔ نفیسہ آپا ان کی اشعر کے لیے حد درجہ حساسیت سے واقف تھیں۔ بیوگی کی چادر اوڑھنے والی ان کی اس بہن کی کل کائنات بیٹا ہی تھا۔

"ایک تو انیسہ! جو بات تمہارے ذہن میں گھس جائے اسے نکالنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ اب بالکل کامل صفت تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کہیں تو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آخر تم اللہ پہ بھروسا کیوں نہیں کرتیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ دیکھو! اب یہ تو بالکل بھی مناسب نہیں کہ ذرا سی بات کو جواز بنا کر رشتہ ختم کر دیا جائے۔ وہ بھی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے بعد بارات سے عین دس دن پہلے ہو سکتا ہے انہوں نے تو شادی کارڈ بھی بھیج دیے ہوں اپنے رشتے داروں کو۔" آپا نے تجزیہ کیا۔

"اور میرے دل کو جیسے یقین ہے کہ اللہ نے اپنے اشعر بیٹے اور اس من موہنی سی لڑکی کا ساتھ آسمانوں پہ لکھ رکھا ہے۔ تم بس اللہ کا نام لے کے شادی کی تیاریاں شروع کرو۔" نفیسہ آپا کے لہجے سے چاؤ اور محبت ٹپک رہی تھی۔ بہن کی باتیں انیسہ کے دل کو بھی لگی تھیں۔ ان کی رائے دل کو لگ گئی۔ وہ تمام خدشات جھٹک کے شادی کی تیاریوں میں جت گئیں۔



شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ انیسہ بیگم سارے ارمان پورے کر کے بڑے چاؤ سے مریم کو بیاہ کر لائیں۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم دونوں کچھ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف گھوم پھر آؤ۔" انیسہ نے ناشتے کی ٹیبل پر مریم اور اشعر سے کہا۔

"جی امی! میں نے بھی مریم سے یہی کہا ہے لیکن یہ کہتی ہے کہ پہلے امی سے اجازت لو تو پھر چلیں گے۔" اشعر نے اپنی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔ انیسہ کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"امی! ہم دونوں کے چلے جانے کے بعد تو آپ اکیلی رہ جائیں گی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں ناں۔" مریم کی شیریں و سریلی آواز ابھری۔ اس کی بات پر انیسہ ہنس پڑیں۔

"لو بتاؤ بھئی! میں تم دونوں کے ساتھ ہنی مون پر جاتی اچھی لگوں گی کیا؟ ایسا بھی ہوتا ہے بھلا۔ تم لوگ جاؤ انجوائے کرو۔" انیسہ کی طرف سے تو دونوں کو اجازت مل گئی لیکن مریم کا اپنائیت بھرا رویہ دیکھ کر انیسہ کا مان بہت بڑھ گیا تھا۔

"لیکن امی! آپ اکیلی کیسے رہیں گی۔" مریم کی ان کے بارے میں فکر ہنوز قائم تھی۔

"میری فکر مت کرو بیٹا! میں آپا کی طرف چلی جاؤں گی یا آپا کو اپنی طرف بلا لوں گی۔" انیسہ نے مسئلے کا حل بتایا جس پہ مریم مطمئن ہو گئی۔

"رشک کا مقام ہے، آپ دونوں کی قسمتوں پہ کہ دونوں کو اچھی ساس لو، بہو ملی ہے۔" اشعر شرارت بھرے انداز میں گویا ہوا تو وہ دونوں مسکرا اٹھیں۔

"ویسے اس میں سب سے زیادہ خوش قسمتی تو

سمجھیں میری ہی ہے۔" اشعر نے توس پہ جیم لگاتے ہوئے مزے سے تبصرہ کیا۔

"وہ کیسے؟" مریم حیرت میں تھی۔

"وہ ایسے۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہو کے سمجھانے لگا۔ "کہ ساس بہو کی چپقلش میں زیادہ مرد ہی پستا ہے۔ شکر ہے میں اس کھینچا تانی سے بچا رہوں گا۔ فی الحال تو حالات یہی پیش گوئی کر رہے ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ اسی اثنا میں کمرے سے آتی موبائل کی گھنٹی کی آواز نے گفتگو کا تسلسل توڑا۔

"میرا موبائل بج رہا ہے۔" مریم کچھ معذرت خواہ انداز میں کہتی اٹھ کے کمرے میں چلی گئی۔ فون اس کی ماں کا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اشعر نے کمرے میں آ کے اپنا موبائل اٹھایا اور ساتھ ہی ایک بھرپور سی نظر محو گفتگو بیوی پہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔

"اچھا امی! میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔" یہ کہہ کے مریم نے فون بند کیا اور اشعر کے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ گئی۔

"مریم بات سنو۔!" لاؤنج میں بیٹھی انیسہ نے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے پکارا۔

"آتی ہوں کچھ دیر میں۔" وہ کہتی تیزی سے گیراج کی جانب بڑھ گئی۔ انیسہ نے ششدر سی نگاہ اٹھا کے اس کی طرف بغور دیکھا۔ مریم کے انداز میں کیا تھا؟ بے نیازی لاپروائی بیزاری یا۔ انہیں مریم کا یہ انداز گستاخی کے مترادف محسوس ہوا۔ ان کے اندر برہمی، دکھ، خوف اور تاسف بھری چبھن کا احساس اٹھا۔

"کچھ دیر پہلے ڈھونگ رچا رہی تھی ہونہہ، شوہر کے سامنے قدر و منزلت بڑھانے کا ڈراما۔" ان کا ذہن مریم کے مزاج کی گتھیوں میں الجھنے لگا۔

"چار دن میں کیسے مٹھی میں کر لیا میرے بیٹے کو چالباز کہیں کی، نہ جانے کیا کیا سکھا کے بھیجا ہے ماں نے، اگر جو یہ میرے اشعر کو مجھ سے دور کرنے میں کامیاب ہو گئی تو۔؟" ان کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ ذہن پہ بوجھ بڑھنے لگا۔

مریم گیراج میں آئی تو اشعر گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔

"سنیں۔" مریم کی نرم سی عجلت بھری آواز پہ وہ پلٹا۔

"جی سنائیں۔" اشعر مسکرا کے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"آج شام کو جلدی آجائیے گا امی کی طرف چلیں گے۔" مریم نے تاکید کی۔

"ٹھیک ہے لیکن ایک شرط پہ۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"وہ کیا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"امی چاہے کتنا بھی اصرار کریں، لیکن تم وہاں ٹھہرو گی نہیں میرے ساتھ ہی واپس آؤ گی۔" وہی ڈائیلاگ جو شادی کے شروع میں شوہر حضرات بولتے ہیں لیکن پھر بھی مریم کو اک مسرت کا سا احساس گھیرنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ رقصاں ہوئی۔

"وہ کیوں؟" اس نے ترچھی نگاہوں سے اشعر کو دیکھ کر شرارتاً کہا۔

"اس کیوں کا مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو لیکن پھر بھی تازہ بہ تازہ کے لیے بتائے دیتے ہیں کہ ہم آپ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے۔" اشعر کا محبت میں بھیگا لہجہ مریم کے چہرے پہ گلابیاں چھلکا گیا۔ وہ محویت سے اسے تکنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے ارتکاز سے بوکھلا کر مریم جلدی سے بولی۔

"آپ لیٹ ہو رہے ہیں۔ جائیں۔" مریم نے اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی کی طرف موڑا۔

"دل نہیں کر رہا۔" وہ مزید مچلنے لگا۔

"کیوں دل نہیں کر رہا۔ چلیں بیٹھیں گاڑی میں۔" مریم نے دھونس کے انداز میں اسے گاڑی میں دھکیلا تو اشعر ہنستے ہوئے اسٹارٹ کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

آسمان پہ اوائل رات کی نیلاہٹ نے پر پھیلا رکھے تھے۔ چھوٹے سے لان میں جھومتی گلاب اور موتیے کی مہک میں ڈوبی۔ بے کل ہوائیں جانے کس کی متلاشی تھیں۔ اسے تو منظر میں موجود ہر شے کی کیفیت اپنے ہی جیسی محسوس ہو رہی تھی کھوئی کھوئی محو انتظار۔

اضطراب سے ٹیرس پہ ٹہلتے ہوئے اسے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس گھر کی جانب مڑتی ہوئی دکھائی دیں۔

"اشعر آ گئے۔" وہ برق رفتاری سے نیچے اتری۔ گیراج میں پہنچنے سے چند قدم پہلے اسے یاد آیا کہ وہ تو اشعر سے ناراض ہے دیر سے آنے پر۔ کتنی شرمندگی سے اس نے اماں کو وضاحتیں دے کر ٹالا تھا کہ وہ آج نہیں آ سکتے اور آگے سے اماں نے جو لیکچر سنایا وہ باتیں ذہن میں تازہ ہونے سے پہلے ہی اس نے سر جھٹکا۔

"السلام علیکم۔" وہ لاؤنج کے دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ جب پُرتپاک آواز پہ اس نے سامنے دیکھا تو اشعر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آج تو ہماری بیگم صاحبہ دیدہ و دل فرش راہ کیے کھڑی ہیں۔" اپنی چوری پکڑے جانے پہ وہ دل میں تھوڑی شرمندہ ہوئی۔ ناراضی کا منصوبہ بھی ملیا میٹ ہو گیا تھا لیکن اسی لمحے اس نے... بڑی مہارت سے بات کو اپنے حق میں پلٹا۔

"بیگم کو تو احساس ہے اسی لیے دل فرش راہ ہے۔ آپ کو تو بیگم کی رتی برابر پروا نہیں۔" اس نے روٹھنے جیسے انداز میں منہ بنایا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ارے اتنا بڑا الزام دھر دیا ہم پہ۔" وہ اس کی کلائی پکڑے صوفے پہ آ بیٹھا۔

"میں اس الزام کو سچ بھی ثابت کر سکتی ہوں۔" مریم نے چیلنج کیا۔

"جانتا ہوں۔ ثبوت کے طور پر آپ کے پاس شام کو جلدی نہ آنے کی دلیل ہے۔ لیکن مجھے بھی تو صفائی کا موقع ملنا چاہیے ناں۔" وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا' اس نے سوالیہ نظروں سے صفائی طلب کی۔

"دوپہر تک تو مجھے یاد تھا لیکن پھر کام کے پھیلاوے میں ایسا الجھا کہ ذہن سے نکل گیا۔ ابھی شادی کے دنوں میں جو چھٹیاں کی ہیں' ان کا خمیازہ بھی تو بھگتنا ہے۔ اسی مصروفیت کے باعث میں نے موبائل بھی آف کر رکھا تھا۔" اس نے وضاحت پیش کی۔

"ہوں۔" مریم نے ہونٹ سکیڑے اشعر کی بات میں وزن تو تھا۔

"امی کہاں ہیں؟" بیوی کی تفتیش ختم ہوئی تو اس نے فوراً "ماں کے بارے" پوچھا اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"وہ کمرے میں ہیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ آپ انہیں بھی بلا لیں۔" وہ اٹھ کے کچن کی جانب چل دی۔

☼ ☼ ☼

دن کبھی اڑان بھرتے پنچھی کی طرح اوجھل ہوتے تو کبھی سبک رو جھونکے کی طرح سرسراتے گزرتے گئے۔

مریم کچن میں مصروف تھی۔ پی ٹی سی ایل پہ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے لاؤنج میں آ کے فون اٹھایا۔

"کہاں تھیں تم؟ کب سے فون کر رہی ہوں' موبائل پہ بھی تم ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ یہاں بھی گھنٹے بعد اٹھایا ہے۔" مریم کی ماں نے چھوٹتے ہی کئی شکوہ آمیز باتیں کہہ ڈالیں۔ ان کی آواز سے ناراضی چھلک رہی تھی۔

"امی! میں کچن میں تھی اور موبائل سائلنٹ پر لگا ہوا تھا۔" مریم کا دھیان ہنوز چولہے پہ چڑھائی ہنڈیا کی طرف تھا۔

"کچن میں کیا کر رہی تھیں تم؟" ان کا ذہن بات کے پہلے حصے پہ ہی اٹک گیا۔ اسی لیے موبائل سائلنٹ پہ لگانے والی بات وہ نظرانداز کر گئیں۔

"دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھی امی۔" ماں کے تفتیشی انداز پہ اس نے بے زاری چھپا کے رسان سے جواب دیا۔ یہ اس کی ماں کا معمول تھا کہ وہ دن میں تین چار مرتبہ فون کر کے اس کے معمولات کے بارے میں کرید کرید کے پوچھتی تھیں۔ ان ہی سوالات سے بچنے کے لیے اس نے موبائل سائلنٹ پہ لگا رکھا تھا۔

"کتنی خرانٹ ہے ساس تمہاری۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی ہنڈیا کی رکھوالی کرا دی۔ ہمارے ہاں تو دلہنیں چھ چھ ماہ چارپائی سے پیر نہیں اتارتیں۔ تم اشعر سے کہو کہ تمہیں ملازمہ رکھ کے دے۔ اسے یہ بتاؤ کہ تم اتنا کام کرنے کی عادی نہیں ہو۔" اس کی ماں نے رازدارانہ انداز میں گر کی بات بتائی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امی! اس طرح تو میں سارا دن فارغ رہ کے بور ہو جاؤں گی۔" اس نے جواز پیش کیا! اور دوسری طرف اس کی ماں کا جی چاہا کہ سر پیٹ ڈالے۔

"ٹھیک ہے پھر نہ مانو میری بات اور چڑھاؤ سر پہ ان ماں بیٹے کو۔ دیکھ لینا ایک دن روتی ہوئی آؤ گی میرے پاس۔" مریم کے دل کو ٹھیس لگی لیکن اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

"ویسے کافی دن ہو گئے تم نے میری طرف چکر نہیں لگایا۔ نہ خود آتی ہو نہ مجھے آنے دیتی ہو۔ بس آج آ رہی ہوں تمہاری طرف۔" ان کا انداز حتمی تھا۔ مریم گڑبڑا گئی۔

"امی! آپ کسی اور دن آجایئے گا۔ دراصل آج شام میں اور اشعر ان کے کسی دوست کے ہاں ڈنر پہ انوائٹڈ ہیں۔" مریم نے تفصیلاً بتایا۔

"مریم بھا!" اس کی ماں کچھ ناگوار سے انداز میں گویا ہوئیں۔ آنے کا ارادہ ملتوی ہونے پہ ان کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

"اور وہ بڑھیا کہاں ہے۔" اچانک خیال آنے پہ انہوں نے پوچھا۔

"امی! کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ دراصل وہ تہجد کے وقت سے۔" مریم کی مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی ماں بول پڑی۔

"اونہہ! مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ یقیناً "پلنگ توڑ" رہی ہو گی بڑی بی۔ اسے بھی کام میں لگایا کرو۔ اتنی بھی خدمتیں نہ کرنا کہ وہ پیر ہی زمین پہ دھرنا بھول جائے۔"

"اچھا امی! میں آپ سے پھر بات کرتی ہوں۔ وہ سالن چولہے پہ چڑھا ہے۔ کہیں جل ہی نہ جائے۔" مریم نے عجلت میں کہہ کے ریسیور رکھا اور اسی لمحے اس کی نظر دائیں طرف دیوار میں نصب قد آدم آئینے پہ پڑی جس میں عقب والے کمرے کا عکس واضح دکھائی دے رہا تھا۔ انیسہ بیگم بھی ریسیور واپس رکھ رہی تھیں۔ خوف کی لہر نے مریم کے پورے وجود کو منجمد کر دیا۔ اس کی پیشانی پہ پسینہ پھوٹ پڑا۔

"مریم!" انیسہ کی پکار نے اس کی سماعتوں میں صور پھونکا۔ وہ پتھر ہو چکی تھی پھر بھی گہری شرمندگی اور خوف کا بوجھ اٹھائے خود کو کمرے کی طرف گھسیٹنے لگی، اور انیسہ کے قریب بیڈ پہ ٹک گئی۔

انیسہ کچھ لمحے اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں، مریم کے وجود میں کپکپاہٹ ہونے لگی جس پہ اس نے بمشکل قابو پایا، سر جھکائے مجرم بنی بیٹھی تھی۔

"تم نے جھوٹ بول کے اپنی ماں کو یہاں آنے سے منع کیوں کیا جبکہ اشعر تو تین دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔" لہجے میں واضح تلخی نہیں تھی لیکن چبھن ضرور تھی۔ انہوں نے بات بھی بہت عجیب نقطے سے شروع کی تھی۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ امی یہاں آکر میرے معمولات دیکھیں، میرے اطوار پر اعتراضات کریں یا گھر کے معاملات میں دخل اندازی کریں۔" سارا بھید کھل چکا تھا اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ لہٰذا مریم نے صاف گوئی اختیار کی۔

"تم اپنی ماں کی باتیں مان کیوں نہیں لیتیں۔ مائیں تو بیٹیوں کی بھلائی کے لیے ہی سوچتی ہیں۔" وہ نہ

جانے کیا اگلوانا یا سننا چاہتی تھیں‘ وہ اسے ٹٹول رہی تھیں۔ جانچ رہی تھیں۔

”ضروری نہیں کہ ماں کی ہر بات بیٹی کی بھلائی کے لیے ہی ہو۔“ اس کا ذہن ماضی کے تصور سے بوجھل ہونے لگا۔ ”میں یہ الفاظ کبھی نہ کہتی اگر میرا آنکھوں دیکھا تجربہ نہ ہوتا۔“

”کیسا تجربہ؟“ انیسہ کو الجھن بھرے تجسس نے آن گھیرا۔

”میری نانی امی ہمارے گھر کے معاملات میں حد سے زیادہ دخل اندازی کیا کرتی تھیں۔ امی کو فضول باتوں میں الجھاتیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرے والد اور دادی امی بالکل درست تھے‘ لیکن جب میرے والدین کا رشتہ ٹوٹا تو میرے حصے میں صرف والدہ کی محبت ہی آئی۔ والد کی شفقت سے مجھے محروم ہونا پڑا۔“ آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پہ پھسلنے لگے۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرے گھر کو ہلکی سی ٹھیس بھی لگے کیونکہ گھر ٹوٹنے کا خوف میرے اندر سرائیت کر چکا ہے اور میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہوں اسے شکست دینا چاہتی ہوں۔ اپنی ماں پہ لگے داغ کو دھونا چاہتی ہوں۔“

وہ خود کلامی کی کیفیت میں بولتی ہوئی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ انیسہ کو اس کے آنسوؤں میں سچائی مجسم نظر آرہی تھی۔ ان ہی لمحات میں ان کے تسلی آمیز لمس کو اپنے کندھے پہ محسوس کرکے مریم جیسے حواسوں میں آئی۔

”امی! آپ میری امی کی باتوں سے بہت ہرٹ ہوئی ہیں ناں۔ میں ان کی طرف سے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ساس کے سامنے جوڑ دیے۔

”پلیز‘ امی! میری امی کو معاف کر دیں۔ وہ دل کی بری بالکل نہیں۔ وہ تو بس۔۔“ مریم نے اپنی ماں کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا۔ انیسہ کو معافی طلب کرتی یہ لڑکی بہت معصوم اور بے چاری سی لگی اور اس لمحے انہیں ٹوٹ کر اس پہ پیار آیا۔

شادی کے شروع کے دنوں میں پیدا ہونے والی بدگمانی جو ان کے دل میں کہیں چھپی بیٹھی تھی آج اپنی موت آپ مرگئی۔ اس روز جسے وہ مریم کی بے اعتنائی سمجھ بیٹھی تھیں‘ وہ دراصل اس کی بے کلی تھی۔ جو اشعر کو پہلے روز کام پہ وداع کرنے کے سبب اس کے انداز میں اتر آئی تھی۔ اس روز بدگمانی کی دھول میں انیسہ نے اس خیال کو قابل غور ہی نہ گردانا تھا۔ لیکن آج حقیقت نے آشکار ہوکے ہر بدگمانی دھوڈالی تھی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا!“ انیسہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کے تسلی دی۔

”امی! آپ اشعر سے بھی ان باتوں کا تذکرہ مت کیجیے گا۔“ مریم کی آنسو بھری آنکھوں میں ایک اور التجا تھی۔ انیسہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

”نہیں کروں گی۔ تم فکر مت کرو۔“ انیسہ نے نرمی اور محبت سے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ جواباً“ مریم جوش محبت اور تشکر سے ان کے گلے لگ گئی۔ اپنائیت کا مسحور کن احساس دونوں کو گھیرنے لگا۔ اچانک کسی شے کے جلنے کی بو نے دونوں کو چونکایا۔

”لو سالن جل گیا۔“ مریم بجلی کی تیزی سے اٹھی۔

”کوئی بات نہیں۔ چیزوں کا جلنا دلوں کے جلنے سے بہتر ہے۔“ انیسہ کی مسکراتی آواز مریم نے اپنے پیچھے سنی۔

انیسہ نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔ طمانیت کا احساس ان کے اندر تک اتر گیا۔ ان پہ بڑی شدت سے یہ بات منکشف ہوئی کہ ان کا مریم کو سمجھانے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔



حیا بخاری

دلِ شہرِ محبت

"یا اللہ!" تیز آواز پہ رسالے میں سر دیے بیٹھی سدرہ نے فوراً "ایک بھرپور ناقدانہ نظر سامنے دنیا و مافیہا سے قطعی بے خبر سوتی عبو پر ڈالی۔

"یہ مہارانی ابھی تک سو رہی ہیں۔ ارے کیا رات کو اسے نیند نہیں آتی جو دن چڑھے تک اسے کوئی ہوش نہیں ہوتا۔" صغریٰ بیگم نے ایک تیز نگاہ سدرہ کی طرف کی۔

"مجھے کیا پتا امی۔"

"اٹھاؤ اسے۔ کچن دیکھے اور تم بھی اب اس کتاب کی جان چھوڑو۔ کپڑوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ کیا میلے کپڑوں کے انبار لگا کر ورلڈ ریکارڈ بنانا ہے۔" وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ چکی تھیں اور اس کی سوئی بس ورلڈ ریکارڈ پہ ہی اٹک گئی۔ کیا ان کے گھر میں اتنے کپڑے تھے جن کو جمع کر کے ورلڈ ریکارڈ بنایا جائے۔

وہ اسے سنا کر باہر جانے لگیں کہ نگاہ بھٹکتی ایک بار پھر گہری نیند سوتی عبو پر پڑ گئی۔

"دونوں بیٹیوں نے سسرال جا کر ناک کٹوانی ہے میری۔" سوئی عبو کی کمر پر بھی زوردار دھپ رسید کی گئی۔ وہ بس ذرا سا ہی کسمسائی۔

"اٹھاؤ اس ڈھیٹ مٹی کے پتلے کو۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ باہر گئیں، تو سدرہ نے سکھ کا سانس لیا۔

ناولٹ



"توبہ۔ امی بھی ناں۔ ہلا کے رکھ دیتی ہیں۔" اس نے اپنا موٹا سا چشمہ صحیح کیا اور پوری دل جمعی سے عبو کو اٹھانے لگ گئی۔ اسے ہمیشہ یہ کام بغیر گھوڑوں کے دریا پار کرنے جیسا لگا کرتا۔

"کیا مصیبت ہے سدرہ کی بچی! سونے دو۔" وہ اسے زور سے دھکا مارتی کروٹ بدل گئی۔ سدرہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ تب ہی بیڈ سے نیچے جا گری تھی۔

اسے شدید غصہ آگیا اور اس بار اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ "فوراً" کمبل کھینچ کے دور پھینک دیا۔ اب کی بار عبو تڑپ کے اٹھ بیٹھی تھی۔ ساتھ ساتھ دایاں بازو بھی سہلایا جا رہا تھا۔ جس پہ سدرہ نے زور سے چٹکی کاٹی تھی۔

"شرم نہیں آتی تمہیں۔" خوابیدہ آنکھوں میں نمی سی اتری۔

"بالکل نہیں آتی۔" صاف جواب آیا۔

"اور امی آخری وارننگ دے کے گئی ہیں۔ اگر اب بھی تم نے بستر نہ چھوڑا تو مرحوم دادا ابو کی بید کی چھڑی ہوگی اور تم۔" سدرہ نے اسے ڈرانے کی پوری کوشش کی اور توقع کے عین مطابق وہ بستر چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا یار' پھوپھو کو مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہے۔ ذرا جو آرام کرنے دیں۔" وہ سلیپرز میں پاؤں گھساتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

"دشمنی نہیں' پیار کہو اوکے۔ ہماری ہی بھلائی چاہتی ہیں امی۔ گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں اسٹیٹس پھر بھی لڑکیوں کے عیب چھپا لیتا ہے۔ اور ہمارے عیب ہماری اچھی تربیت' اخلاق اور سگھڑاپا ہی چھپا سکتا ہے۔" سدرہ نے عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کسی بڑی بوڑھی کی طرح اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اللہ معاف۔ عیب کون سے۔ تمہارا تو پھر بھی یہ انکل جیدی والا چشمہ ہے۔ مجھے تو اللہ نے اچھا خاصا بنایا ہے۔" وہ فرضی کالر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"خیر کم تو میں بھی نہیں ہوں۔ مگر میری مراد ہماری غربت سے ہے۔ آج کے دور میں یہی سب سے بڑا عیب ہے۔ آج کل نہ لڑکیوں کی صورت کو اہمیت دی جاتی ہے نہ سیرت کو۔ آج کل تو اس معیار کو صرف دولت پہ رکھ دیا گیا ہے۔ وہی ہوا چھی جو جہیز سے گھر بھر دے۔" سدرہ کی بات پر اب کے عبو بھی اثبات میں سرہلا گئی۔

"اب اپنی ثریا باجی کو دیکھ لو۔ صورت و سیرت میں یکتا۔ مگر صرف موٹر سائیکل کی فرمائش پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے شادی کی تاریخ ختم کردی گئی اور منگنی بھی توڑ دی گئی۔" سدرہ نے اپنی پڑوسن کی بات کی تو عبو بھی تاسف سے سرہلانے لگی۔

"سچ میں دو دن روتی رہیں بیچاری گھر والوں سے چھپ چھپ کر۔" عبو کے لہجے میں دکھ تھا۔

"چھپ چھپ کر۔ تو تم نے کہاں دیکھ لیا؟" سدرہ نے اپنی عادت کے مطابق بات پکڑی۔

"چھت پہ روتی تھیں ناں۔ میں نے بھی چھت سے دیکھا چھپ چھپ کر۔" وہ دائیں آنکھ دباتے ہوئے مسکائی تو سدرہ بھی مسکرا دی۔

"بید کی چھڑی اٹھاؤں یا دونوں باہر مو گی۔" صغریٰ کی چیختی آواز پہ جہاں سدرہ ہڑبڑا کر باہر بھاگی تھی۔ وہیں عبو نے باتھ روم میں پناہ لی تھی۔



آج موسم صبح سے بے حد خوش گوار تھا۔ صبح سے جاری ننھی منی بارش کی بوندوں کی کن من نے جیسے روح تک کو سرشاری سی بخشی تھی۔ وہ اوپر چھت پہ سب سے آخری سیڑھی پہ بیٹھی پیر لٹکائے' ایئر فون کانوں میں ٹھونسے مزے سے میوزک سنتی آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا کیا سپنے دیکھے جا رہی تھی کہ مانوس سی مہک محسوس کرتے ہی جھٹ سے آنکھیں وا کیں۔

"پکوڑے!" اس کے منہ سے ہلکی سی پرجوش سی

چیخ برآمد ہوئی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتری کچن کی طرف بھاگی، جہاں صغریٰ پھوپھو سبزی کاٹنے میں مصروف تھیں۔ اسے یوں بھاگ کر اندر آتے دیکھ کر انہوں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ "کیا ہوا خیریت؟"

"کچھ نہیں پھوپھو! وہ وہ۔" وہ ہکلائی۔

"لڑکی سدھر جاؤ۔ کچھ نہیں ہے تو یوں دوڑی کیوں آرہی ہو۔ کیا آرمی والوں نے شکاری کتے پیچھے چھوڑ دیے ہیں یا پولیس والوں نے کھوجی پیچھے لگا دیے ہیں۔" ان کے ہولناک اندازوں پہ وہ دل میں کانپ کے رہ گئی۔

"اللہ کا نام لیں پھوپھو! میں کوئی چور، ڈاکو، یا دہشت گرد تھوڑی ہوں۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"ان سے کچھ کم بھی نہیں ہو ویسے تم۔" عارف نہ جانے کب وہاں آیا تھا۔ جبو نے غصیلی نگاہوں سے اسے گھورا۔ مگر وہاں پروا ہی کسے تھی۔

"اور یہ کیا کانوں میں ہر وقت تاریں ڈالے پھرتی ہو۔" پھوپھو نے اس کے ایئر فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار انہیں مضبوطی سے تھام گئی۔

"ایسا نہ ہو تاریں کان میں لگانے کا یہ شوق تمہیں بھی لے ڈوبے، جیسے سدرہ کو دن رات پڑھائی کا جنون لے ڈوبا۔ اسے تو یہ موٹا چشمہ لگ گیا۔ تمہیں کہیں بہروں والے آلے نہ لگانے پڑ جائیں۔" جبو کا تو دل دہل گیا۔ دونوں کانوں سے تاریں کھینچ کر ہاتھ میں آ گئیں۔

"بددعا تو نہ دیں پھوپھو! اگر میری سماعت کمزور ہوتی تو یہ لگائے رکھنے کے باوجود بھی میں آپ کی آواز سن پاتی۔"

"میں نے بھی ابھی کا نہیں کہا۔ یہ شوق ایسے چھوٹے موٹے تحفے یادگار میں دے ہی جاتے ہیں۔ خدا کی پناہ! نماز اور قرآن کے لیے مار مار کے اٹھاؤ تب بھی نہیں سنتیں اور اپنے فضول شوق کے لیے سارا دن بھی لگائیں تو کوئی افسوس نہیں۔ اچھا اب جلدی سے آٹا گوندھ لو۔ میں ذرا دو گھڑی آرام کر لوں۔ سالن سدرہ بنا لے گی۔" اسے حکم سنا کر وہ باہر چلی گئیں۔

"پتا نہیں مجھے کیا مار پڑی تھی کہ پکوڑوں کی خوشبو پر کچن کی طرف دوڑی آئی۔" وہ روہانسی ہوتی موبائل میز پر پٹختے ہوئے بولی۔

"اوہ! وہ تو ثریا باجی بنا رہی تھیں، مجھے کہا کہ گھر بھی لیتے جاؤ مگر تمہیں پتا ہے کہ مجھے ایسے کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔" عارف مزے سے ٹانگیں میز پر جماتے ہوئے کہا۔

"اللہ تم سے پوچھے گا عارف! خود کھا کر آ گئے اور میں بیچاری۔" وہ تڑپی۔

"خود بنا لو۔ کھانے کی شیر ہو مگر مجال ہے کبھی خود بھی کچھ پکایا ہو۔" اس کا دل چاہا اسے خوب سنائے مگر پھر دل میں ہی کڑھتی رخ موڑ کر آٹا نکالنے لگی۔

"کھاؤ گی پکوڑے؟" بہت قریب سے وہ بولا تھا۔

"نہیں، مجھے تو بدہضمی ہو جاتی ہے پکوڑے کھا

کر۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولی۔ عارف کے لبوں پہ مسکراہٹ مچلی۔

"چلو تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے ' لاتا ہوں تمہارے لیے گرما گرم پکوڑے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بہت سجتی تھی۔ عبو نے تسلیم کیا "مگر پھوپھو۔" اسے فوراً" خیال آیا۔

"کام سارے سلیقے سے نپٹا لینا۔ امی کچھ نہیں کہیں گی پھر اور ویسے بھی آج مجھے ٹیوشن کے پیسے ملے ہیں' سو آج تو عیش بنتا ہے نا۔" اس نے عبو کے گیلے آٹے سے بھرا ہاتھ پکڑ کر اسے اسی کے چہرے پہ ملتے ہوئے کہا۔ وہ ہوں ہوں کرتی رہ گئی۔ شرارت کر کے وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ منہ صاف کرتی اسے دیر تک نوازتی رہی۔



پچھلے دو گھنٹوں سے لائٹ نہیں تھی اور عبو کو جب تک لائٹ نہ آتی نیند نہیں آتی تھی اور اگر عبو کو نیند نہیں آ رہی تو اس کا مطلب تھا کہ سدرہ نے بھی لازمی جاگنا تھا۔ وہ لاکھ سونے کی کوشش کر لیتی مگر عبو ہر حال میں اسے ناکام بنا کر چھوڑتی۔ ابھی بھی سدرہ کا نیند کے مارے برا حال تھا۔ لیکن عبو بار بار اسے اس قدر شدید جھٹکا دیتی کہ وہ مکمل طور پہ بیدار ہو جاتی۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد اس کی گھنی پلکیں دوبارہ گرنے لگتیں۔

"کیا مصیبت ہے عبو۔ سونے دو ناں۔" آخر سدرہ نے تڑپ کر التجا کی۔

"ایک دو گھنٹے اگر میرے لیے جاگ لو گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔" اس نے چلا کر خبردار کیا۔

"تو تم کیوں جاگ رہی ہو؟ سو جاؤ نا۔" وہ کسمسائی۔

"چلو چھت پر چلتے ہیں۔ دیکھو موسم کتنا سرد ہو رہا ہے' سچ میں بہت مزا آئے گا۔" عبو کو نیا خیال سوجھا۔ سدرہ کا سر مزید لٹک گیا۔

"پلیز عبو سو جاؤ۔ مجھے سخت نیند آئی ہے۔ اب اس وقت یوں جھول جھال کر کون جائے اتنی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر۔" سدرہ نے ہاتھ جوڑے۔

"تم منہ پہ پانی ڈالو اور چلو۔ پلیز سدرہ میری خاطر پلیز۔"

عبو نے آخری حربہ آزمایا اور اس کی توقع کے عین مطابق سدرہ اس کے لیے فوراً" راضی ہو گئی۔

"چلو میری ماں۔" لمبی جماہی لیتے ہوئے اس نے پاؤں سلیپرز میں ڈالے۔

"تھینک یو۔" وہ خوش ہوتے ہوئے تیزی سے باہر نکلی۔ باہر موسم واقعی سرد تھا مگر خوش گوار حد تک۔ ہوا میں ذرا سی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ چھت پر آتے ہی سدرہ کا موڈ بھی بحال ہو چکا تھا۔ وہ خود کو واقعی فریش محسوس کر رہی تھی۔

سدرہ نے کمرے کے ساتھ پڑی چارپائی صحن کے بالکل درمیان میں لا پھینکی۔ عبو ٹارچ آسمان کی طرف کیے جلانے بجھانے میں مصروف تھی۔

"کون ہے وہاں؟" دوسری طرف ثریا باجی کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑیں۔

"ثریا باجی بھی جاگ رہی ہیں۔" وہ یک زبان ہو کے بولی تھیں اور فوراً" چھوٹی سی دیوار کے قریب چلی آئیں۔

"ہم ہیں ثریا باجی۔" ان کی آواز سن کر کوئی آہستہ آہستہ چلتے ان کے قریب آیا تھا۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ ایک دوسرے کو اب وہ تینوں بخوبی دیکھ سکتی تھیں۔

"خیریت تو ہے؟" حساس سی سدرہ کو ان کی فکر ہوئی۔

"یہ تو مجھے تم بتاؤ۔" ثریا مسکرائی۔

"وہی ہمیشہ والا مسئلہ۔ لائٹ نہیں تھی سو مہارانی کو نیند نہیں آ رہی۔ اب صبح پھر دس گیارہ بجے اٹھیں گی۔" سدرہ کو پھر نیند کا قلق ہونے لگا۔

"مگر آپ کیوں جاگ رہی ہیں۔" عبو بھی حیران تھی۔

"انسان ہوں یار! آج مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔" ثریا نے جواب دیا۔

"اچھا آئیں ادھر آ جائیں۔" سدرہ نے اسے

اشارہ کیا۔ تو وہ ذرا سا اچھلی اور دیوار کے اوپر سے ان کی طرف آگئی۔

"چلو یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ اب تینوں مل کر باتیں کریں گے۔" عبو پرجوش ہوتی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ویسے ثریا باجی! کتنا اچھا ہو کہ ہم ہمیشہ ایسے ایک ساتھ رہیں۔" سدرہ نے آسمان پہ بکھرے ننھے ننھے تاروں کو تکتے ہوئے خواہش کی۔

"پاگل زندگی ایسے تھوڑی گزاری جاتی ہے تمہیں پتا ہے اگر زندگی میں تبدیلی نہ ہو تو ہم سب اکتا جائیں۔ دل ہی مر جائیں۔" ثریا مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"اب دیکھو! اگر تم بار بار فیل ہو کر ایک ہی کلاس میں بیٹھی رہو تو کیا تمہیں اچھا لگے گا۔ بس زندگی بھی ایک کلاس روم کی طرح ہے۔ روز نئی کتاب نیا باب۔ ہم آج ساتھ ہیں۔ مگر کل ہم جن کے ساتھ ہوں گے وہ شاید ہمیں ان رشتوں سے بھی زیادہ عزیز ہوں۔" ثریا نے خوب صورتی سے اسے سمجھایا۔

"تم بہت سویٹ ہو۔ بہت خوش قسمت ہو گا وہ جو تمہیں لے کر جائے گا۔" ثریا نے اس کے گال پہ پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بھلا گھر لے کر کون جائے گا۔" عبو نے شریر لہجے میں کہا۔

"یہ سادہ سا حلیہ، بالوں پہ ہر وقت اتنا تیل لگائے رکھتی ہے کہ جیسے اگلے دن تیل مارکیٹ میں ختم ہو جائے گا۔" وہ کھلکھلائی۔

"ہاں اور چشمہ دیکھو ذرا۔ اتنا موٹا۔ بھلا آج کے ـــــ لڑکوں کو ایسی لڑکیاں کب پسند آتی ہیں۔" ثریا نے بھی عبو کا ساتھ دیتے ہوئے اسے چڑایا۔

"نہ لے کر جائے کوئی۔ میں امی کے پاس ہی ٹھیک ہوں۔ بلکہ اب تو میں اور زیادہ تیل لگایا کروں گی۔ اگر ایسی بات ہے تو۔" وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

"توبہ ہے لڑکی۔ تم تو بالکل بھی بات دل پہ نہیں لیتیں۔" ثریا نے اسے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"ویسے پتا نہیں ثریا باجی! اس کا شوہر کیسا ہو گا۔" عبو خیالوں میں سوچنے لگی۔

"اس کا بہت اچھا ہو گا۔ تم اپنا سوچو۔" ثریا نے اسے نشانہ بنایا۔

"شوہر جیسا بھی ہو' بس پڑھا لکھا اور بہت امیر ہو۔ یہ بڑا سا بنگلہ ہو۔ بڑے سے صحن میں خوب صورت لان اور لان کے درمیان جھولا۔ چمکتی سیاہ شیشوں والی کار۔ سچ میں یہ کڑھ کڑھ کر جینے والی زندگی سے تو میں بالکل تھک چکی ہوں۔ بس اب تو اللہ کسی شہزادے کو لا دے کہیں سے اور میرے سارے خواب سچ کر دے۔ یہ بھی کوئی لائف ہے کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کے لیے بھی ترستے رہو۔" بہت ہی خوب صورت لہجہ آخر میں مایوس ہوا تھا۔

"غلط بات عبو! ایسا نہیں کہتے۔ پیسہ' دولت عیش و عشرت یہ سب کچھ اہم نہیں ہوتا۔ بلکہ قدر' خلوص رشتے اور احساس اہم ہوتے ہیں۔ جو ہماری زندگی کی اساس ہیں۔" ثریا نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"ثریا باجی! یہ صرف کتابی باتیں ہیں۔ کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ یہ عیش و عشرت اور دولت کے ہوتے ہوئے سکون نہ ہو ایسے ممکن ہے بھلا۔" وہ صاف منکر تھی۔

"یہ کتابی باتیں نہیں ہیں ڈیئر! بلکہ زندگی کی تلخ سچائیاں ہیں اور یقین کرو' دنیا ان باتوں پہ اب یقین بھی کرتی ہے۔ ہاں مگر ایک بات ہے۔ یہ باتیں کسی کو بھی سمجھائی نہیں جا سکتیں کیونکہ یہ وہ سبق ہیں جو زندگی کا استاد ہمیں دیتا ہے' اور اس استاد سے زیادہ اچھا سبق اور کوئی استاد نہیں دے سکتا۔" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا تو سدرہ اثبات میں سر ہلائی۔

"اچھا اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ جاؤ تم لوگ بھی سو جاؤ۔ میں بھی چلتی ہوں۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" لائٹ آ چکی تھی۔ تب ہی ثریا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں اپنے اپنے بستر میں گھسی

ایک دوسرے کی باتوں کو سوچے جارہی تھیں۔



بی اے کا رزلٹ بے حد شان دار رہا تھا۔ سدرہ اور عبو دونوں ہی بے حد خوش تھیں۔ عارف نے دونوں کو جی بھر کے نہ صرف سیر کروائی بلکہ ان کی پسندیدہ آئس کریم بھی کھلائی' دونوں خوشی سے بے حال تھیں۔
ابھی ابھی سارہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ صغریٰ نے اسے کمرے میں آنے کو کہا' وہ جلدی سے ماں کے پاس پہنچی تھی۔

"جی امی۔"

"بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" صغریٰ بیگم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی امی۔" وہ فوراً بیٹھ گئی۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! تمہارے اور عبو کے نمبر بہت اچھے ہیں اور مجھے یہ بھی اچھی طرح پتا ہے کہ تم دونوں کو ہی آگے پڑھنے کا شوق ہے۔ خاص کر تمہارے جنون سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔"

وہ ذرا سا رکیں' سدرہ خاموش رہی۔

"لیکن میں تم دونوں کو یونیورسٹی نہیں بھیج سکتی۔ اس معاملے میں تم دونوں عارف سے کوئی ذکر نہیں کرو گی۔ اگر وہ تم دونوں سے اس بارے میں خود پوچھے بھی تو تم دونوں نے طریقے سے اسے ٹال دینا ہے۔ یہ بات تم عبو کو بھی اچھی طرح سمجھا دو۔ میں نے اگر اس سے بات کی تو وہ ضرور ہنگامہ کرے گی اور تب بات ضرور عارف تک پہنچے گی۔" انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ سدرہ خاموش رہی مگر آنکھوں کے دیے مدھم سے پڑ گئے تھے۔

"اور ہاں! تم بھی عبو سے اس وقت ہی بات کرنا جب عارف باہر ہو اور اس کے آنے میں کافی وقت بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی بھی حال میں اسے اس بات کا پتا چلے۔" بیٹی کا بجھتا چہرہ دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر وہ ضبط کر گئیں۔

"اب جاؤ۔ رات کے کھانے کی تیاری کرو۔ عبو کو بھی ساتھ ملا لینا۔ یہ جو تم اس کی مدد کرنے کی غرض سے اس کے کئی کام خود کرلیتی ہو ناں یہ اس کے ساتھ نیکی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ اگر اس عمر میں یہ کاہلی اور کام چوری اس کی عادت بن گئی تو ساری زندگی تم موجود نہیں رہو گی اس کی مدد کے لیے' تب اسے بے حد پریشانی ہو گی۔ سو تم دونوں کے لیے اچھا یہی ہے کہ وقت پہ سمجھ جاؤ۔" انہوں نے اسے مزید ہدایات دیں۔

سدرہ خاموشی سے سر ہلاتی وہاں سے اٹھ گئی اور کچن میں آکر کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ مگر اس کا سارا دھیان کمرے میں موجود عبو کی طرف تھا۔ جو یقیناً "ایرفون کانوں میں ٹھونسے گانے سننے میں مگن تھی۔ اسے پتا تھا کہ عبو اس کی طرح نہیں تھی کہ ہر بات پہ سمجھوتا کر لیتی۔ وہ اس سے قطعی مختلف تھی۔ اسے جیسے ہی یہ بات پتا چلتی کہ امی نے یونیورسٹی داخلہ دلوانے سے منع کر دیا ہے۔ اس نے شور مچا دینا تھا۔

اور اس طرح عارف سے یہ بات کسی طور چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اب اسے یہ بھی سوچنا تھا کہ کس طرح امی کی بات عبو تک پہنچائے کہ وہ راضی ہو جائے۔ شور بھی نہ کرے اور عارف بھی اس معاملے سے دور رہے۔ لیکن اسے کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ یہ بات عبو کو اس کی ماں سے مزید دور کر سکتی تھی۔ متنفر کر سکتی تھی اسے اور یہ گوارا نہ تھا اس کے لیے قطعی۔

"نہیں! میں عبو سے بالکل صاف بات کروں گی۔ وہ بہت اچھی ہے۔ ضرور امی کی پرابلم سمجھ جائے گی۔ میں اسے سمجھاؤں گی اور میں جانتی ہوں۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گی۔ وہ مطمئن ہو چکی تھی۔



"کیا مصیبت ہے عبو! جب بھی کر جاؤ۔" سدرہ نے چڑ کر کہا تھا اور عبو جو پچھلے آدھے گھنٹے سے نہ

صرف روئے جا رہی تھی۔ بلکہ زور زور سے شوں شاں بھی جاری تھی کہ مزید کلس کر رہ گئی۔

"اچھا۔ مصیبت بھی مجھے ہے۔ ہاں بھئی تمہیں کیا تکلیف؟" وہ بدلحاظ ہوئی۔

"مجھے کیا تکلیف۔ کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے۔" سدرہ کو پہلی بار اس پہ شدید غصہ آیا۔

"سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے نا سدرہ بی بی! تمہاری تو امی ہیں وہ۔ تمہیں بھلا ان کی کوئی بات غلط کیسے لگ سکتی ہے۔" وہ مزید تیز ہوئی۔ سدرہ اسے تاسف سے دیکھے گئی۔

"تم کتنی بدگمان ہو عبو! حالانکہ دیکھا جائے تو امی نے ہمیشہ تمہیں اپنی سگی بیٹی مانا ہے۔ تمہارے اور میرے ساتھ برتاؤ میں ذرا بھی فرق نہیں رکھا۔ مگر پھر بھی تم۔ تف ہے تم پر۔" وہ شدید خفا تھی۔ مگر پروا کسے تھی۔

"تو پھر ایسا کیوں۔ کتنے خواب دیکھے تھے میں نے کہ بی اے کلیئر کرنے کے بعد یونیورسٹی جاؤں گی۔ ہمیں بھی کچھ آزادی ملے گی۔ زندگی کو جینے کا مزا تو اب آنے والا تھا۔ مگر تمہاری امی نے ایک مرتبہ پھر سب چکنا چور کر دیا۔"

وہ آج بدلحاظی کی ساری حدیں پار کر رہی تھی۔ سدرہ نے اس کی سوچ پہ افسوس کے ساتھ اس بات کا دل ہی دل میں شکر کیا کہ امی اور عارف اس وقت گھر پر نہیں تھے۔

"تم بالکل غلط سوچ رہی ہو عبو! تم سے زیادہ افسوس مجھے ہے۔ اور تم بھی اس بات کی گواہ ہو کہ تعلیم میرا جنون ہے۔ تم تو اس کو صرف ایک ایڈونچر کے طور پہ لیتی ہو مگر میرے لیے یہ مقصد حیات تھا۔ اور ماؤں سے زیادہ اپنی بیٹی کی خواہشات کو بھلا اور کون سمجھ سکتا ہے۔ سو اگر امی نے آگے بڑھانے سے منع کر دیا ہے تو اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی۔" وہ اپنی صلح جو طبیعت سے مجبور ایک بار پھر اسے پیار سے سمجھانے لگی۔

"میں ایسی کسی بات کو نہیں مانتی جو دوسروں سے ان کی خوشیاں ان کے خواب چھین لے، سمجھیں تم۔ کاش بابا اور امی کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوتی۔ خود تو مر گئے اور مجھے جلتے رہنے کے لیے اس کال کوٹھڑی میں چھوڑ گئے۔"

نفرت سے کہتی وہ چھت کی طرف دوڑ گئی تھی۔ سدرہ اس کے لہجے کی سنگینی محسوس کر کے یوں ساکت ہوئی جیسے جان ہی نہیں رہی تھی اس میں۔ چونکی تب جب زور سے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ تب ہی اس نے عبو کو بھی نیچے آتے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بنا ہی اندر چلی گئی تھی۔ اس نے آرام سے کنڈی کھول دی تھی۔

"کہاں سو گئی تھیں سدرہ! پتا بھی ہے کہ دو قدم چل لوں تو میری جان نکلنے لگتی ہے۔" صغریٰ بیگم پھولے سانس کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ عارف سامان سے بھرے تھیلے اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے اندر آیا۔

"سارے مہینے کا راشن پھر ایک ساتھ لے آئی ہوں۔ برکت رہتی ہے اور مہینہ بھی آرام سے گزر جاتا ہے۔ اب روز روز مجھ سے نہیں لگائے جاتے بازار کے چکر۔ سردیوں کے کپڑے عارف کے ساتھ جا کر تم دونوں خود لے لینا۔ چلو سامان رکھو۔ میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔" وہ سدرہ کو سمجھاتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئیں کہ نظر عبو اور سدرہ کے مشترکہ کمرے کے بند دروازے پہ پڑی جو ہمیشہ تب ہی دن کے وقت بند ہوتا جب عبو کا موڈ سخت آف ہوتا، وہ ٹھہر گئیں۔

"عارف! تم تھیلے کچن میں رکھو اور سدرہ! تم ذرا میری بات سنو بیٹا۔" وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئیں۔ سدرہ تیزی سے ان کے پیچھے آئی۔

"عبو پھر ناراض ہے کیا؟" انہوں نے بغیر اس کی طرف دیکھے پوچھا۔

"نہیں تو امی! بس ایسے ہی، آپ کو پتا تو ہے اس

کل۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔
"تم نے یونیورسٹی والی بات کہی ہوگی اس سے۔" وہ اندازہ لگاتے ہوئے بولیں۔ اس بار سدرہ خاموش رہی۔ اور ان کے پیر دبانے لگی۔ تب ہی صغریٰ بیگم کی آنکھوں سے ٹپکتا وہ واحد آنسو نہ دیکھ پائی تھی۔ جو بے حد ضبط کے باوجود اپنی حد وپار کر گیا تھا۔

"جب سے ہوش سنبھالا۔ سب بڑوں سے ایک بات ہر موقع پر سنی کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ جسے بندہ کبھی نہیں سمجھ پاتا۔ تمہارے ماموں اور ماں کی یکے بعد دیگرے جوان اموات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں ننھی سی عبو کو گود میں لیے جب واپس گھر آئی تو بس اللہ کی مصلحت ہی ڈھونڈتی رہی۔ مگر ہم خاکی ہیں بیٹا! ہم اس کی مصلحت کا سلیہ تک نہیں پا سکتے۔ اس کی کن کو بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔ بس مجھے بھی صبر آگیا۔ مگر تمہارے بابا کی اچانک موت نے ہمارے گھر کی بنیادیں ہلا دیں۔ جب تک وہ زندہ تھے، کبھی مجھے گھر کے کاموں کے علاوہ کسی اور کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے، مگر ان کی وفات کے بعد۔ ان کی تھوڑی بہت پنشن اور میری سلائی کے پیسوں سے یہ گھر میں نے کتنی مشکلوں سے چلایا۔ یہ بس میں اور میرا رب جانتا ہے۔ مگر جب سے یہ گردوں کی تکلیف ہوئی ہے۔ اب گزارا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ عارف مشین چلانے نہیں دیتا اور پنشن بہت کم ہے۔ اس میں تو ایک مہینے کا راشن مکمل نہ آئے۔ کہاں میری دوائیوں اور دوسرے اخراجات۔

اوپر سے عارف کی بے روزگاری۔ وہ جتنا بھی چھوٹی موٹی نوکری کر کے کما لے۔ ہماری یہ چند ضروریات بھی مشکل سے پوری کر پاتا ہے۔ وہ اپنی نوکری کو لے کر بے حد پریشان ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس قدر مہنگی تعلیم کے اخراجات اس پہ ڈال کر اسے مزید پریشان کردوں۔ تم جانتی ہو اسے اگر تمہاری اور عبو کی خواہش کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اپنا خیال کیے بنا جانوروں کی طرح کام میں جت جائے گا۔" وہ ذرا دیر رکیں۔ سدرہ انہیں دیکھنے لگی۔ وہ انہیں بے حد کمزور لگیں۔

"تم عبو کو سمجھاؤ۔ میں جانتی ہوں۔ تمہارا رزلٹ بے حد اچھا آیا ہے۔ اور میں بہت خوش بھی ہوں مگر۔ پھر میں منع نہیں کر رہی بس عارف کی جاب ہو جانے دو۔ میں بہت تھک چکی ہوں سدرہ! اب تم لوگ میری طاقت ہو۔ میں تم پہ سختی اس لیے نہیں کرتی کہ بیٹیاں مجھے عزیز نہیں۔ بلکہ میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی کے ہر موڑ پہ خود کو کامیاب بنا سکو۔ مجھے کمزور نہ کرو بیٹا! اگر میری طاقت نہیں بن سکتیں تم تو۔"

سدرہ کو ان کا لہجہ نم سا لگا۔ وہ اٹھ کر ماں سے لپٹ گئی۔ خود بخود پلکیں بھیگنے لگیں۔ صغریٰ نے اسے اپنے آپ میں بھینچ لیا۔ اسے آج خود پہ غصہ آرہا تھا۔ اور جو پیسے وہ اور عبو فضول چیزوں پہ ضائع کر دیتے تھے۔ وہ ماں کے کئی چھوٹے مسائل کا حل بن سکتے تھے۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی عبو کے گالوں پہ لڑھکتا نمکین پانی اس کے دل و دماغ پہ لکھے سارے شکوے شکایتیں بہا لے گیا تھا۔ اس نے خود کو دل ہی دل میں کوسا تھا۔



"یہ دروازے پہ کاغذ تم نے چسپاں کیا ہے؟" وہ جو لہک لہک کر ملکہ نور جہاں بننے کی کوشش میں گلا پھاڑے جا رہی تھی۔ عارف کی آواز پہ اسے دیکھنے لگی۔ خوب صورت چمک دار آنکھوں میں ناراضی صاف ظاہر تھی۔
"تم دیکھ نہیں رہے میں ریاض کر رہی تھی۔" وہ تڑخی۔
"اس کے لیے سوری۔ اب بتاؤ یہ کاغذ تم نے لگایا ہے باہر دروازے پہ۔" عارف اس کی لڑاکا طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ تب ہی فوراً معذرت بھی کی مگر سوال جوں کا توں رہا۔
"ہاں تو کیا! تمہیں تو میں پکڑا کے گلی میں کھڑا کر دیتی جو دروازے پہ نہ چپکاتی۔" وہ سخت بدمزا ہوئی۔

اور اس کی بات سن کر عارف اس سے بھی زیادہ۔

"مجال ہے جو کسی سوال کا صحیح جواب دے دو۔" وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اچھا بابا! وہ کاغذ میں نے ہی لگایا ہے۔ بس خوش، اب جاؤ۔" ہاتھ جوڑ کر کہتے ہوئے دوبارہ ریاض کے لیے منہ کھول دیا گیا۔

"رکو۔" عارف نے تیزی سے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرائے تھے۔

"اب کیا ہے؟" وہ بری طرح جھنجلائی۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے ٹیوشن پڑھانے کی۔ میں ہوں ناں تم سب کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔" اس کی بہت ساری دوسری باتوں میں یہ خوبی بھی مبو کو بے حد پسند تھی۔

"میں نے کب انکار کیا۔ مگر میں اور سدرہ تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ بالکل ویسے جیسے تم ہمارے لیے فکر مند رہتے ہو۔ ہم تمہارے لیے اس گھر کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔" اب کی بار وہ سنجیدگی سے عارف کی طرف متوجہ ہوئی۔ نجانے کیوں عارف کو بے حد اچھا لگا۔

"اوکے! بٹ جب میری جاب ہو جائے گی تو یہ سب ختم۔" وہ ابھی بھی کچھ الجھا سا تھا۔

"پرامس۔ ویسے بھی مجھ سے نہیں ہوتیں یہ سختیاں۔" وہ دوبارہ اپنی جون میں واپس آ گئی۔ عارف مسکرا دیا۔

"اوکے۔ اب تم اپنا ریاض جاری رکھ سکتی ہو۔" نرمی سے کہتا وہ باہر چلا گیا۔

"تم نے بتایا نہیں یہ ریاض انکل کون ہیں۔" ریاض کے لیے کھلا منہ جھٹ سے ایک بار پھر بند ہوا۔ سدرہ نے پھر صرف ایک ہی لفظ پکڑا تھا۔

"تمہارا ہونے والا میاں۔" وہ چلا اٹھی۔

"اللہ نہ کرے۔ یہ انکل ٹائپ نام مجھے بالکل نہیں پسند۔ مجھے تو مہران، سکندر ہیرو ٹائپ نام والا لڑکا ملے گا، دیکھنا۔" خواب نہ صرف جاگتی آنکھوں میں چمکنے لگے بلکہ ساتھ ساتھ شیئر بھی ہونے لگے۔

"مجھے گانا سیکھنا ہے۔ سیکھنے دو گی۔" اس نے اس بار ہاتھ جوڑ دیے۔ سدرہ حیرانی سے کندھے اچکاتی دوبارہ اپنی کرسی پہ جا بیٹھی۔

"تم دونوں کو اگر اس کمرے میں رہنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا خیال ہے۔ اکبر کے چند کاریگر منگوا کر اسی کمرے میں چنوا نہ دوں۔" انہوں نے اپنے پڑوسی اکبر مستری کو بادشاہ کے رتبے پہ فائز کرتے ہوئے زبردست مثال پیش کی تھی۔ مبو کی تو ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہر وقت کھی کھی۔ جاؤ کچن کو دیکھو اور سدرہ تم جاؤ جا کر ذرا چھت کی صفائی کرو۔" انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"پھوپھو! آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں ابھی جا کر سب کر دیتی ہوں۔"

ان کے گال پہ بوسہ دے کر وہ باہر بھاگ گئی۔ سدرہ اس کے اس عمل پہ حیران ہوتی اس کے پیچھے تھی۔ اور صغریٰ بیگم بھائی کا لمس محسوس کرتے ہی بے آواز رونے لگی تھیں۔ مبو ان کے عزیز ترین بھائی کی نشانی تھی۔ اکلوتی نشانی۔



"امی! کس کا خط ہے؟" سدرہ نے خط کا لفافہ چاک کرتی صغریٰ سے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں پتا بیٹا۔ ہمیں بھلا کون خط بھیجے گا۔" انہوں نے ذرا کی ذرا خط باہر نکالا اور واپس ڈال کر اسے پکڑا دیا۔

"جاؤ سنبھال کر رکھ دو۔ ہو سکتا ہے عارف کی نوکری کا ہو۔ ایسا نہ ہو ادھر ادھر ہو جائے اور کوئی اہم بات ہو۔" انہوں نے فکر مندی سے اسے لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"مگر امی! مجھے لگتا ہے یہ خط فاران سے ہے۔ میرا مطلب بیرون ملک سے۔" وہ لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"جتنا کہا ہے اتنا کرو۔ پتا نہیں کتنا اہم لفافہ ہے۔ بس

سنبھال کر رکھ دو۔ عارف آنے ہی والا ہے۔" تب ہی وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔ آسمانی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں بھی وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ صغریٰ تو اسے دیکھتے ہی پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا عارف! خیریت تو ہے۔" سدرہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"ہاں بس جیسے ہی ٹیوشن سینٹر سے نکلا۔ کتا پیچھے لگ گیا۔ آخری گلی تک پہنچا کے گیا ہے۔" سدرہ کے ساتھ ساتھ امی کو بھی ہنسی آ گئی۔ باہر آتی عبو کا قہقہہ بھی جان دار تھا۔ وہ اسے گھور کے رہ گیا۔

"اسے لگا ہو گا شاید یہ ہینڈسم سا نوجوان رستہ بھول گیا ہے۔" عبو نے اسے مزید چھیڑا۔

"پانی پلاؤ۔ تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میری یہاں جان نکل گئی ہے۔" وہ آستین فولڈ کرتے ہوئے بولا اور ماں کے پاس ہی پلنگ پہ بیٹھ گیا۔ سدرہ نے فوراً اسے خط تھما دیا۔

"کس کا خط ہے؟" وہ جو انہماک سے خط پڑھنے میں مصروف تھا، عبو کی آواز پہ چونک گیا۔ وہ پانی کا گلاس تھامے کھڑی تھی اس نے خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا اور پانی پینے لگا۔

"امی! یہ اکرم احمد کا خط ہے لندن سے۔" گلاس واپس عبو کو تھماتے ہوئے وہ ماں سے مخاطب ہوا۔

"اکرم احمد۔" وہ پُر سوچ انداز میں بڑبڑائیں۔ "وہ تو تمہارے ابا کے لنگوٹیا یار تھے۔"

"کہتے ہیں وہ پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں اور جب تک گھر نہیں مل جاتا وہ ہمارے گھر میں ٹھہریں گے۔" عارف کی بات پہ سدرہ اور عبو دونوں اچھلی تھیں۔

"ہمارے گھر۔" حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"چلو کہیں سے تو برکت کی نوید آئی۔" صغریٰ پرانے زمانے کی نشانیوں میں سے تھیں۔ تب ہی مہمانوں کو رحمت جان کر بے حد خوش ہوئیں۔

"لنگوٹیا کیا ہوتا ہے امی!" سدرہ کی سوئی اٹکتے دیکھ کر عبو کا دل چاہا سر پیٹ لے۔

"بہت جگری دوست، بہت پیارا اور پرانا۔" وہ سادگی سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "جو عرصے تک ساتھ رہے ہوں۔ ساتھ کھیلے ہوں۔"

"اسے چھوڑیں، پھوپھو! یہ بتائیں کہ وہ ہیں کتنے لوگ اور کب تک رہیں گے یہاں اور۔۔۔" عبو بے چین تھی۔

"خط کے مطابق تو انہوں نے بیوی، بیٹے اور بیٹی کا لکھا ہے۔ تو چار لوگ ہی ہوئے۔" عارف نے سوچتے ہوئے بتایا۔

"مگر ہمارے گھر میں اتنی جگہ کہاں۔ امی کا کمرا اتنا چھوٹا ہے کہ بیڈ ہی مشکل سے آیا ہے یہی حال میرے اور سدرہ کے کمرے کا ہے اور بیٹھک میں تو تم ہوتے ہو۔ تو مہمان۔۔۔؟" عبو کی بات بھی سچ تھی۔

"کب تک آمد متوقع ہے ان کی۔" صغریٰ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"اسی ہفتے کی شام تک امی۔" عارف نے جواب دیا۔

"یوں کرتے ہیں کہ بیٹی کو سدرہ اور عبو کے ساتھ اور بیٹے کی تمہارے ساتھ جگہ بنا دیں گے۔ اور اکرم بھائی اور بھابی کے لیے اوپر والا کمرا میں صاف کر لیتی ہوں۔" انہوں نے حل نکالا۔

"مگر چھت کے کمرے میں تو کاٹھ کباڑ بھرا ہے سارا۔" سدرہ فکر مندی سے بولی۔

"جو ٹوٹا پھوٹا ہے کباڑ میں بیچ دیتے ہیں، باقی سب کچرے میں پھینکو دو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ امی آپ لوگ سامان باہر نکالیں۔ میں نیچے لے آؤں گا۔" عارف بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے رک گیا۔

"ویسے انہوں نے بابا کو لکھا ہے یہ خط کہ وہ یہاں گھر اور بزنس سیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب ایک تو انہیں بابا کی موت کا پتا نہیں اور دوسرا وہ شاید زیادہ دیر ہمارے گھر نہ رہیں اور امی! انہوں نے بابا سے کسی اچھی جگہ پہ اچھا مکان بھی دیکھنے کو کہا ہے

تاکہ وہ جلد از جلد سیٹ ہو سکیں۔" اس نے پوری بات بتاتے ہوئے کہا۔

"مطلب کافی امیر لوگ ہیں پھر تو۔" سدرہ نے اندازہ لگایا۔

"ظاہر ہے لندن میں رہتے ہیں۔" عبو کہاں خاموش رہنے والی تھی۔

"پھر تو لڑکا بھی کافی پڑھا لکھا ہو گا۔" اس بار اندازہ لگانے والی صغریٰ بیگم تھیں۔

"تمہارے ابا مرحوم اور اکرم کی بہت دوستی تھی۔ چلو اللہ کرے، ان کے دل میں اسے رشتہ داری میں تبدیل کرنے کا خیال آجائے تو کم از کم کسی ایک بیٹی کے فرض سے تو سبکدوش ہو سکوں گی۔" اندازے کے ساتھ ساتھ صغریٰ بیگم تو گھڑے گھڑے خواب بھی دیکھنے لگیں۔ ان کی بات پہ عبو نے غیر ارادی نظر عارف پہ ڈالی تھی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ فوراً" نظریں جھکا گئی۔

عارف سر جھٹک کے باہر نکل گیا۔ مگر عبو دیر تک خود سے الجھتی اس کی نظروں کا مفہوم ڈھونڈتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اکرم اور ثمینہ دونوں ہی بے حد اچھی اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے۔ تب ہی ان کے متعلق جو خدشات سدرہ اور عبو کے دل میں تھے کہ لندن کے رہنے والے ان کے چھوٹے سے گھر میں گزارا کیسے کریں گے' دم توڑ گئے تھے۔

گھر کے چھوٹے صاف ستھرے صحن میں وہ سب بے تکلف انداز میں کرسیاں بچھائے گپ شپ میں مصروف تھے۔ منیحہ بھی سادہ طبیعت کی وجہ سے انہیں بے حد پسند آئی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔" سیڑھیوں سے نیچے آتی ثریا پہ سب کی ہی نظر پڑ چکی تھی۔ اس لیے وہ جو شارٹ کٹ اپنا کے یہاں نکلی تھی اور واپس جانے کا بھی سوچ رہی تھی۔ بادل نخواستہ اسے نیچے آنا ہی پڑا تھا۔ ادب سے سب کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ثمینہ آنٹی نے محبت بھری نگاہ اس کے سادہ اور خوب صورت سراپے پہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کون ہیں؟" نمول نے صغریٰ سے پوچھا۔

"یہ ثریا باجی ہیں۔ ہماری شگوفی۔" سدرہ نے امی کا کتنے دنوں پہلے بولا ہوا لفظ پکڑ رکھا تھا۔ وہاں پہ موجود سب ہی لوگوں کی پہلے آنکھیں پھٹی تھیں حیرت سے' اور پھر سارا صحن زوردار ہنسی سے گونجا تھا۔ امی نے البتہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں مزید بڑی کرنے کی کوشش کر کے اسے گھورا تھا۔

"میرا مطلب ہماری بہت پیاری دوست ہیں کافی پرانی۔" وہ فوراً" وضاحت دینے لگی۔

"ماشاء اللہ۔ بہت پیاری بچیاں ہیں۔ پاکستان آکر میرا تو جی خوش ہو گیا۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔

"سچ میں بھابھی! بہت اچھا لگا ہمیں۔ اپنے دوست کو نہ پا کر دل رنج بھی ہوا۔ مگر آپ سب کی محبتوں اور اخلاق نے پردیس کی ساری تکان دور کر دی ہے۔" اکرم تشکر آمیز لہجے میں بولے۔

"اب بس کہیں اچھا سا ٹھکانہ ہمیں بھی میسر آجائے۔" ان کے بیٹے ہاشم نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"آپ نے چونکہ خط میں ہدایت کی تھی تو میں نے کئی اچھی جگہ پہ مکانات دیکھ رکھے ہیں۔ آپ بس ایک دو دن آرام کر لیں۔ تو پھر دیکھنا شروع کر دیں۔ میں خود آپ لوگوں کو لے جا کر دکھاؤں گا۔" عارف نے انہیں مطمئن کیا۔

"آرام کیا کرنا۔ اگر تم فارغ ہو تو آج شام ہی چلتے ہیں۔" اکرم کو شاید کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

"جی جی ضرور انکل! جب آپ کہیں۔" وہ بھی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"عبو' سدرہ! جاؤ بیٹا! کھانے کی تیاری کرو۔" صغریٰ بیگم نے بیٹیوں کو مخاطب کیا تو وہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثریا کے ساتھ منیحہ بھی ان کے ساتھ ہو لی۔

"بہت ہی اچھی تربیت کی ہے بھابی! آپ نے بچوں کی۔" اکرم نے کھلے دل سے تعریف کی تو وہ بھی مسکرا دیں۔

"تربیت تو آپ لوگوں نے اپنے بچوں کی کی ہے۔ لندن جیسے شہر میں بالکل اسلامی طرز عمل دیا ہے اپنے بچوں کو۔ یقین جانیں! مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیں شرف میزبانی بخشا۔"

"میرا اور کون ہے پاکستان میں بھابی! صرف بھائی جیسا دوست ہی تھا اور اس کی فیملی۔" انہوں نے کہا تو اطمینان کا احساس صغریٰ کے دل میں اترنے لگا۔ مدتوں بعد انہیں اپنے بھائی کی کمی پر ہوتی محسوس ہوئی تھی۔



"کتنے اچھے لوگ ہیں ناں۔ سچ میں مجھے امید نہیں تھی کہ لندن میں رہنے والے لوگ بھی اتنے سادہ اور با اخلاق ہو سکتے ہیں۔" ثریا نے سیب کاٹتے ہوئے کہا۔ اکرم انکل نے ایک ہفتے کے اندر ہی سب کام نبٹا لیے تھے اور شفٹ بھی ہو گئے تھے۔ آج وہ تینوں پورے ایک ہفتے بعد اکیلی بیٹھی تھیں، مگر صبح سے یوں میٹنگ جاری تھی۔ جیسے یہ موقع انہیں ایک صدی بعد ملا تھا۔

"لو۔ لندن میں رہنے والوں کے کیا سینگ نکل آتے ہیں، جو سادہ اور با اخلاق نہیں ہو سکتے۔" عبو اس کی منطق پہ حیران ہوئی۔

"نہیں یار! میرا مطلب ان غریب لوگوں سے تھا۔ جو وہاں جا کر دو پیسے کیا کما لیں۔ یہاں کے غریب رشتہ داروں کو منہ نہیں لگاتے۔" ثریا نے وضاحت کی۔

"خیر! جو بھی ہے مجھے تو بہت پسند تھے اور سچ بتاؤں مجھے تو ان کا بیٹا ہاشم بہت پسند آیا۔" عبو کی آواز نے اندر آتے عارف کے قدم وہیں روک دیے۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔

"کتنا سنجیدہ طبیعت کا ہے اور پرسنالٹی بھی شان دار۔ مردوں کو بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ عارف کو لگا اس کا سر گھومنے لگا تھا۔

"ثریا باجی! آپ کی جوڑی تو خوب جچے گی ان کے ساتھ۔"

تختوں کی طرف جاتا دل ایک جھٹکے سے واپس آیا تھا۔ اور عارف کے لبوں پہ مطمئن سی مسکراہٹ پھیلی۔ وہ تیزی سے واپس مڑ گیا۔

"نہ بابا! مجھے نہیں لگتا کہ مجھے کوئی پسند کرے گا۔ پھر اب دوبارہ میں کوئی تلخی نہیں چاہتی۔ مجھے تو ثمینہ آنٹی کی نظر میں تمہارا عکس صاف دکھائی دیا کیوں سدرہ؟" ثریا نے سدرہ سے تائید چاہی تو وہ فوراً اثبات میں سر ہلا گئی۔

"بلکہ مجھے تو خود ہاشم بھی تم میں انٹرسٹڈ لگا۔ یاد نہیں تم جیسے ہی عارف سے کوئی چیز منگواتیں وہ لے آتا دوڑ کر۔" سدرہ نے بڑا سا چشمہ سیدھا کیا۔ اگر عارف لب ٹھہرا تو اس کا کرنا بنتا تھا۔

"ہاں اس پر تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔" عبو چونکی۔

"سچ عبو! عارف بتا رہا تھا کہ بہت ہی پیارا گھر ہے ان کا اور گاڑی بھی لے رہے ہیں۔ تمہاری تو لائف بن گئی سمجھو۔" ثریا مسکرائی۔

"یہ خواب امی تو ایسے دیکھتی تھی ہمیشہ۔" سدرہ نے اسے کہنی ماری۔

"ہو سکتا ہے وہ تم لوگوں کو اپنے گھر دعوت بھی دیں۔" ثریا نے اندازہ لگایا۔

"ویسے عبو! اگر سچ میں ایسی بات ہوئی تو تم کیا فیصلہ کرو گی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے جیسے عارف بھی تم میں انٹرسٹڈ ہے۔" ثریا کی شرارت بھری آواز پہ وہ بری طرح چونکی تھی۔

"بھائی کی تو ابھی تک جاب بھی نہیں اور میرے خیال میں ایسے حالات میں اگر اکرم انکل عبو کا ہاتھ مانگتے ہیں تو امی ہرگز انکار نہیں کریں گی۔"

سدرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اسی بات

پہ بحث کرنے لگیں اور عبو گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔

☼ ☼ ☼

گھر واقعی بہت اچھا تھا۔ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مگر بے حد خوب صورت تھا۔ اکرم انکل خود ان سب کو گاڑی میں لے کر آئے تھے۔ عارف اور امی نہیں آپائے تھے۔ عارف کو کہیں انٹرویو دینے جانا تھا اور امی کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ تب ہی وہ ثریا کو ساتھ لے آئے تھے۔ وہ بھی بے حد خوش تھی۔

گھر کے پچھلے حصے میں سرسبز لان کے بیچوں بیچ لگے جھولے نے انہیں مزید سرشاری دی تھی۔ ثریا اور سدرہ تو پاگلوں کی طرح وہیں چپک کے رہ گئیں۔ عبو انہیں وہیں چھوڑ کے اندر چلی آئی اور باہر آتے ہاشم سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"ایم سوری۔" وہ بری طرح نروس ہوئی۔

"سوری اصل میں، میں آپ کو، آئی مین آپ لوگوں کو ہی بلانے آرہا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ جھولا چھوڑیں ابھی۔" وہیں کھڑے سدرہ اور ثریا کو کھلکھلاتے دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ انجوائے کرنے دیں ان کو۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو پورا گھر دکھاتا ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ سدرہ کدھر رہ گئی۔" نجانے کیوں اسے ہاشم کی نظروں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"وہ امی کے ساتھ کچن میں بزی ہے۔ اسے کوکنگ کا کریز ہے۔ آپ آیئے نا میرے ساتھ پلیز۔" اب کی بار وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ اس نے ایک پل کے لیے سوچا پھر اس کے ساتھ چل دی تھی۔

ہاشم کا کمرا بے حد خوب صورت تھا۔ کمرے کے پینٹ سے لے کر کمرے میں استعمال کی ہر چیز میں گلابی رنگ کی جھلک تھی۔ جس سے عجیب سا فسوں طاری ہونے لگا تھا۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے۔ تو کمرا چمک اٹھا۔

"آپ کا کمرا بہت شان دار ہے۔" بے اختیار ہی وہ بولی تھی۔

"مجھ سے دوستی کریں گی۔" ہاشم کا سوال بھی اسی قدر بے اختیار تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

"مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ میں بس دوستی چاہتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ آپ سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔" دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے لبوں پہ دوستانہ مسکراہٹ سجائے وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ عبو کا دل دھڑک اٹھا۔

"میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔" اسے لگا اس نے وہاں آکر غلطی کی تھی۔

"میری بات کا جواب تو دے دیں۔" وہ تیز آواز میں بولا تھا۔ دروازے کی طرف بڑھتے قدم ایک پل کے لیے تھمے۔

"آئی ایم سوری۔" تیزی سے کہہ کر وہ نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا مسکراتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آپ نے بلایا۔" عارف نے پوچھا تو صغریٰ بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بیٹھو! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟" انہوں نے عارف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"جی امی! حکم کریں۔" وہ ماں کا بے حد فرماں بردار تھا۔ صغریٰ کو اپنے بیٹے پر فخر تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ثمینہ اور اکرم بھائی کو عبو بے حد پسند آئی ہے۔ میں نے نہ صرف ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے بلکہ مجھے لگتا ہے عبو کا جھکاؤ بھی ان کی طرف ہے۔ نئے رشتے پا کر میں نے اسے بہت خوش دیکھا ہے۔" عارف کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی۔

"اور پھر تم جانتے ہو عبو کو شروع سے ایسی آرام و آسائش والی زندگی کتنی پسند ہے۔" دل کی وادی پہ

اداسی کی دھند اُترنے لگی تھی۔

"سچ بتاؤں، تو میں نے عبو کو ہمیشہ تمہاری دلہن کے روپ میں دیکھا ہے۔ میری دلی خواہش رہی ہے کہ عبو میری بہو بنے۔ ہمیشہ میرے پاس رہے مگر میں کوئی خود غرضی کرنا نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی خواہش کے لیے میں اس کی خواہش اور خوابوں کا گلا گھونٹ دوں۔"

عارف تو کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"وہ ہمیشہ مجھے سدرہ کی طرح ہی عزیز رہی۔ تمہاری جاب ہو جاتی حالات کچھ بہتر ہوتے تو میں ضرور اس سے بات کرتی مگر اب جب قسمت اس کے لیے بہتر راستہ دے رہی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ کم از کم میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہ آئے۔"

بے حد اداسی کی حالت میں بھی اسے اپنی ماں پہ فخر محسوس ہوا۔

"میں چاہتی ہوں۔ اگر وہ لوگ رشتہ لے کر آئیں تو میں فوراً "ہاں" کر دوں۔" ان کے لہجے میں اطمینان تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ خود اپنے بیٹے کے دل کی دنیا تہہ و بالا کر چکی ہیں۔

☼ ☼ ☼

عبو اور سدرہ دونوں بے حد خوش تھیں۔ ثریا کی ایک بے حد اچھے گھرانے میں بات طے ہو گئی تھی اور اس بار سراسر بغیر لالچ کے یہ رشتہ ہوا تھا۔

لڑکے کی بہن نے ثریا کو کسی تقریب میں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا۔ ثریا کے گھر میں تو جیسے نئی زندگی دوڑ گئی۔ گھر بھر خوشی سے مسکرا اٹھا۔ لڑکے والوں کو شادی کی جلدی تھی۔ سو ایک دو دن میں تاریخ بھی رکھنے کا کہہ گئے۔ عبو اور سدرہ کا تو خوشی کے مارے برا حال تھا۔ ملائی جیسی رنگت والی ثریا کا چہرہ گلال تھا۔ عبو اور سدرہ نے چھیڑ چھیڑ کر اس کا حشر خراب کر دیا تھا۔

"عبو! تم فکر نہ کرو بچو! تمہارا کام بھی ایک دو دن میں تمام ہونے والا ہے لو کے۔" ثریا نے تنگ آ کر اسے آنکھیں دکھائیں۔

"ہیں وہ کیسے؟" وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

"آنٹی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید ثمینہ آنٹی لوگ تمہارا ہاتھ مانگنے آ رہے ہیں۔" ثریا نے اسے چھیڑا۔

"سچ میں عبو! تم بہت خوش قسمت ہو۔ یاد ہے تمہیں وہ دن جب ہم بارش میں چھت پر بیٹھے اپنے اپنے خواب سنا رہے تھے تو تم نے کیا کہا تھا۔" سدرہ نے رشک سے کہا۔

"ہاں!" عبو کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ میرا خواب ہے۔ جس شخص سے بھی میری شادی ہو۔ بے حد امیر ہو۔ اس کا گھر بے حد پیارا ہو۔ گاڑی ہو گھر کے خوب صورت سے لان میں جھولا ہو جس کی زنجیروں پہ بیل چڑھی ہو اور وہ لڑکا بس مجھ سے پیار کرتا ہو بے حد پیار۔"

"ہاں اور ہم سب کتنا ہنسے تھے تم پر کہ بلی کے خواب۔" سدرہ کا قہقہہ جاندار تھا۔

"چلو اب تو تم خوش ہو جاؤ نا۔" ثریا نے اسے چھیڑا۔

"میں دیکھتی ہوں شاید پھوپھو کو کوئی کام ہو۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی۔ ثریا اور سدرہ نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" ثریا حیرت سے بولی تھی۔ سدرہ کندھے اچکا گئی۔

☼ ☼ ☼

اکرم اور ثمینہ آئے ہوئے تھے مگر اس بار وہ ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھ پائی تھی۔ حیا تھی یا کچھ اور وہ اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اپنے کمرے میں وہ یونہی کسی کتاب کے ورق الٹ پلٹ رہی تھی کہ صغریٰ چلی آئیں۔

"عبو!" صغریٰ کی آواز پہ وہ جھٹکا کھا کے سیدھی ہوئی۔

"جی پھوپھو آپ۔"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے بیٹا۔" انہوں نے

شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نہ جانے کیوں اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"جی پھوپھو! آپ حکم کریں۔" وہ مودب سے لہجے میں بولی تھی۔ بیڈ شیٹ کے پھول دھندلانے لگے تھے۔ دروازے کے باہر کھڑے عارف نے خود کو اندر جانے سے روکا تھا۔

"اکرم اور ثمینہ ہاشم کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ سچ کہوں تو خود میری بھی خواہش تھی کہ اس جیسے اچھے لڑکے کے لیے میری ہی کسی بیٹی کا انتخاب ہو اور دیکھ لو اللہ نے میری سن لی۔" پھوپھو کا لہجہ ہمیشہ کی طرح مطمئن تھا۔

"مجھے تو اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ میں تم پہ اپنی مرضی مسلط کروں۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں تم خود فیصلہ کرو۔ اگر تمہیں کوئی بھی اعتراض ہو تم مجھے بتادو۔ ماں باپ کی سمجھ داری اپنی جگہ مگر بچوں کی خواہشات کا احترام کرنا بھی ان کا فرض ہے۔" ان کے محبت پاش لہجے نے اسے جیسے بکھیر کے رکھ دیا تھا۔

"آپ جو بھی فیصلہ کریں مجھے منظور ہے پھوپھو!" وہ بمشکل بول پائی تھی۔ عارف اندر تک ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

"جیتی رہو۔ ہمیشہ سکھی و آباد رہو۔" پھوپھو دعائیں دیتی باہر چلی گئیں۔ کچھ لمحوں بعد ہی سدرہ ثریا دوڑی ہوئی اس کے پاس آئیں۔

"ہاں کردی امی نے۔ اگلے جمعے کو تمہاری منگنی رکھی ہے۔" سدرہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا تو وہ جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی، جھٹکے سے سدرہ سے لپٹ کر رو دی۔ اس کے اس ردعمل پہ وہ دونوں حیران کھڑی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

جس قدر خوش وہ لوگ گھر آئے تھے۔ اسی قدر اداسی اب ان سب کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جس گھر میں خوشی کی ہنسی گونج رہی تھی۔ اب وہاں عجیب سی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

اکرم اور ثمینہ جب گھر لوٹے تو منیحہ تو بھائی کی منگنی کا سن کر جھوم جھوم اٹھی۔ دیر تک وہ تینوں اس بات کو لے کر خوش ہوتے رہے مگر اس وقت سب کی خوشیوں پہ پانی پھر گیا۔ جب ہاشم گھر لوٹا۔ منیحہ نے جونہی اسے سرپرائز کے طور پہ اس کے اور عبو کے رشتے کا بتایا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔

"مگر..." وہ بول ہی نہیں پارہا تھا۔

"مگر کیا؟" ثمینہ کو کچھ غلط ہونے کا اندازہ ہونے لگا۔

"مگر میں تو سدرہ کو پسند کرتا ہوں امی! عبو میں تو مجھے منیحہ نظر آتی ہے۔ ایک بہن' ایک دوست کی طرح ہے وہ میرے لیے۔" وہ واقعی شاکڈ تھا۔

"تم... تم کیا کہہ رہے ہو ہاشم!" ثمینہ کے ساتھ ساتھ اکرم بھی پریشان ہو گئے۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پاپا! میں نے تو پہلی نظر میں دیکھتے ہی سدرہ کو پسند کرلیا تھا۔" وہ بری طرح پھنسا تھا۔

"مگر مجھے تو بیٹا، تم عبو کی طرف ہی مائل لگے۔ بلکہ ہم سب کا یہی خیال تھا اور سچ کہوں تو ہم سب کو عبو بے حد پسند بھی ہے۔" ثمینہ نے کہا تو منیحہ اور اکرم نے تائید میں سر ہلادیا۔

"آپ لوگ کم از کم اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار تو مجھ سے پوچھ لیتے۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔

"ہم نے سوچا تمہیں سرپرائز دیں گے۔" ثمینہ نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی مذاق نہیں امی! اتنا بڑا فیصلہ بھی بھلا سرپرائز ہو سکتا ہے۔ یہ تو شاک ہے وہ بھی ہزار وولٹ کا۔" وہ بددلی سے بولا۔

"خیر تم دل برا مت کرو۔ عبو بھی اچھی لڑکی ہے۔ بہت خوش رکھے گی تمہیں۔" اکرم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں ابو! یہ شادی جیسا مضبوط بندھن ہے۔

کوئی مذاق نہیں کہ دل میں کوئی اور ہو اور رہیں آپ کسی اور کے ساتھ۔ وہ بھی ساری زندگی ایک سمجھوتے کی ادوری میں۔ نہ تو میں اپنی زندگی خوار کر سکتا ہوں نہ عبو کی۔ پھر ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی۔ نہ ہی بات پھیلی ہے۔" وہ بھی دوٹوک لہجے میں بولا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا۔" اکرم اس بار غصیلے لہجے میں بولے۔

"مطلب صاف ہے ابو! ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اور پھر آپ خود سوچیں۔ دونوں ایک ہی گھر کی بہنیں ہیں۔ جب جب میں سدرہ کو دیکھوں گا میرے دل کی خلش بڑھتی رہے گی عبو بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔"

اکرم سوچ میں پڑ گئے۔ واقعی ہاشم کی بات میں وزن تھا۔

"مگر لوگ کیا سوچیں گے اور عبو تو۔ لڑکیاں تو ذرا سی بات چھڑنے پہ ہی سپنے بننا شروع کر دیتی ہیں۔" ثمینہ بھی فکر مند تھیں۔

"آنٹی صغریٰ بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ ضرور ہماری بات سمجھیں گی اور عبو کو میں جانتا ہوں۔ وہ اتنی سی بات پہ کوئی اثر نہیں لے گی۔" اب کہیں جا کے اس کے کھنچے اعصاب نارمل ہوئے تھے۔

"پھر بھی میں تو یہ بات کبھی نہیں کر سکتی۔ ہاشم کے ابو! یہ بات اب آپ کو اکیلے ہی سنبھالنی پڑے گی۔"

ثمینہ نے تو قطعی طور پہ معذرت کی۔ تو ہاشم امید بھری نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے سرہلا کر اسے حوصلہ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سردی بڑھ گئی تھی۔ آج صبح سے جاری بارش نے موسم ایک دم سے بدل دیا تھا۔ ایسے موسم میں ہمیشہ وہ خوشی سے جھومتی پھرتی تھی۔ مگر آج عجیب سی اداسی نے گھیر رکھا تھا۔ وہ خود کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ دل عارف سے بات کرنے کو مچل رہا تھا۔ وہ اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی چھوٹی بڑی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی تھی اور کبھی بھی اسے مایوس نہیں ہونے دیا تھا اس نے۔

"عارف کہاں ہے؟" اس نے ننھی بوندوں کو محسوس کرتے ہوئے کچن کی کھڑکی سے اندر کام کرتی سدرہ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو صبح ناشتا کیے بغیر ہی نکل گیا۔" سدرہ نے کھڑکی کے قریب آتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"پتا نہیں۔" وہ بھی کھڑکی میں آ ٹھہری۔ "مگر مجھے کچھ اداس سا لگا عارف۔ تم نے تو کچھ نہیں کہہ دیا اسے۔"

"میں نے۔" وہ حیران ہوئی۔

"کیونکہ تم ہی بس ہو جس سے خفا ہو تو وہ ایسے اداس ہوتا ہے۔" سدرہ نے ندامت سے اچکاتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں عبو خود پہ اختیار نہ کر سکی۔ وہ منہ بسور کر رونے لگی۔

"عبو!" سدرہ تیزی سے باہر لپکی۔

"پاگل! میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔" اسے خود پہ غصہ آنے لگا۔

"نہیں سدرہ! میں تم سے خفا ہو کے نہیں روئی۔ بلکہ مجھے تو اپنے آپ پہ افسوس ہو رہا ہے۔ ہاشم لاکھ اچھا سہی، اس کا گھر اس کی گاڑی میرے خوابوں میری خواہشوں جیسی ہے۔ مگر میں اس سے۔" وہ اٹکی۔

"تم اس سے کیا؟" سدرہ نے گیلا ہوتا چشمہ اتار کے ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مگر ہاشم میرے خوابوں کے شہزادے جیسا بالکل بھی نہیں ہے۔ پھر بھی۔ پھر بھی میں نے پھوپھو کے کہنے پہ سر جھکا دیا مگر یہ دل۔ میرا دل میرے بس میں نہیں رہا سدرہ! یہ تو عارف کی گروان کیے جا رہا ہے۔" سدرہ کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو عبو۔" وہ بمشکل بول پائی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں سدرہ! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے نہ صرف عارف کو بلکہ ایک بہت ہی مخلص اور سچے دوست کو کھو دیا ہے۔ سوچو بھلا عارف

سے زیادہ مجھے کون سمجھ سکتا ہے۔"

وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ صحن کے بالکل بیچوں بیچ کھڑے عارف کے دل کی اداسی بارش کے ساتھ جیسے دھلنے لگی تھی۔ کتنا خوب صورت اقرار اسے نصیب ہوا تھا۔ وہ بھی چوری چھپے۔ وہ تو اپنی فائل لینے واپس گھر آیا تھا۔ وہ بھی دبے پاؤں کہ عبو سے سامنا نہ ہو اور وہ اس کی آنکھوں کے دروازے پڑھ لے۔ مگر اب...

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی سدرہ! بہت بڑی غلطی۔" اس نے سدرہ کے ہاتھ تھام لیے۔

"مگر اب تو کچھ نہیں ہو سکتا عبو! تم مجھے تو کم از کم کچھ بتاتیں۔" وہ خفا تھی۔ اور پریشان بھی۔

"تمہیں کیا بتاتی۔ جب میرا دل مجھ پہ ہی نہیں کھلا' مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی کہ میں کب عارف۔۔۔"

وہ اداس ہوئی۔ عارف کے دل کو کچھ ہوا۔

"لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا سدرہ! مجھے پھوپھو کی عزت اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں ان کا سر کبھی جھکنے نہیں دوں گی۔" وہ کہہ کر سدرہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ عارف ایک مرتبہ پھر خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ وہ اسی خاموشی سے واپس ہولیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اکرم بھائی!" اکرم کی پوری بات توجہ سے سننے اور سمجھ لینے کے بعد وہ بھلا کیسے مان سکتی تھیں۔

"یہ بات میری سدرہ کی ہوتی تو بھی۔۔ مگر عبو۔ وہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ مجھے بے حد عزیز۔ اس نے میرے فیصلے پہ خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اب میں اس کی خوشیاں چھین کر اپنی ہی بیٹی کی جھولی میں ڈال دوں۔ یہ خود غرضی کیسے کروں بھلا۔" ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"آپ میری بات کو غلط لے رہی ہیں۔ اگر آپ ذرا توجہ دیں تو ہم ایک طرح سے ہاشم اور عبو کی خوشیاں ان کو لوٹا رہے ہیں۔ ہاشم سدرہ کو پسند کرتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ شادی صرف ایک زبردستی کا بندھن ہو

گی۔ تب آپ خود فیصلہ کریں دونوں بچوں کی ساری زندگی داغ ہو جائے گی۔" اکرم بھائی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر خود ان کو اپنے دلائل بے حد کمزور لگے۔

"شادی بہت مضبوط بندھن ہے بھائی صاحب! محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مجھے اپنی تربیت پہ ناز ہے۔ عبو آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔" چاہتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اندر آتا عارف فوراً ماں کی طرف بڑھا تھا۔

"امی! کیا ہوا؟" وہ بے طرح پریشان تھا۔

"میں بتاتا ہوں بیٹا!" اکرم کو امید تھی کہ عارف جیسا سمجھ دار بچہ ضرور ان کی بات سمجھ لے گا۔ تب ہی انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات عارف کے گوش گزار کر دی۔ عارف کے دل میں عجیب سی خوشی نے سر اٹھایا۔ مگر وہ اپنی کیفیت چھپا گیا۔

"انکل! ایک منٹ مجھے امی سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ امی! آپ ذرا باہر آئیں میرے ساتھ۔" وہ ماں کو لے کر باہر آگیا۔

"امی! یہ دیکھیں۔" اس نے ایک خاکی لفافہ ماں کی طرف بڑھایا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ مسکرا دیا۔

"میری جاب ہو گئی ہے امی! بہت ہی مناسب تنخواہ کے علاوہ مجھے گھر اور گاڑی کی سہولت بھی دی گئی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے انہیں بتانے لگا تھا۔

"سچ عارف۔" خوشی کے مارے ان کے آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی۔

"اور اب ایک ضروری بات۔ آپ کو یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ آپ کی خواہش تھی کہ عبو آپ کی بہو بنے اور یہ بھی کہ عبو کو اس کے خواب بھی مل سکیں۔ تو اب میں اس قابل ہو گیا ہوں امی! پھر قدرت بھی موقع دے رہی ہے اور۔۔۔" وہ خاموش ہوا۔

"پھر اور کیا؟" وہ بمشکل بولیں۔

"اور یہ صرف میری نہیں بلکہ آپ کی بھتیجی کی بھی خواہش ہے۔ وہ آپ کو چھوڑ کے اور کہیں نہیں جانا چاہتی۔" عارف نے جیسے ان کو نئی زندگی بخش دی۔

"سچ۔" وہ تقریباً چلا اٹھی تھیں۔

"اگر پھر بھی آپ کو یقین نہ آئے تو آپ سدرہ سے پوچھ لیں کیوں کہ یہ سب اس نے صرف اسی محترمہ کو بتایا ہے۔" اب کی بار وہ کھل کے مسکرا دی تھیں۔

"شکر میرے اللہ کا۔" انہوں نے دل سے اپنے رب کا شکریہ ادا کیا کہ جس پاک ذات نے اس قدر مشکل فیصلہ ان کے لیے آسان کر دیا تھا۔ بے حد آسان۔ وہ اکرم بھائی کو خوش خبری سنانے اندر کی طرف مڑ گئیں۔ عارف سدرہ اور عبو کو اپنی نوکری کی خبر دینے چل دیا۔



"یہ کیا ہو گیا۔ ہاشم بھائی اپنی سدرہ پہ لٹو تھے۔ اور ہم سب عبو کو چھیڑتے رہے۔" ثریا نے سدرہ کی لمبی چوٹی شرارت سے کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ اسے گھور کے رہ گئی۔

"اللہ سچ ثریا باجی۔ مجھے تو اتنی شرم آ رہی ہے کہ ہاشم بھائی کو فیس کیسے کروں گی۔ اس دن جب ہم ان کے گھر گئے تھے تو انہوں نے مجھے دوستی کے لیے کہا تھا۔ میں ڈر گئی تھی کہ لندن پلٹ ہیں پتا نہیں ان کے دل میں کیا ہے اور وہ کتنے اچھے نکلے۔ تف ہے میری سوچ پہ۔ مجھے تو دل سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔" عبو تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

"لیکن مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔ انہیں میں کیسے پسند آگئی اور پھر تم سب بھی تو کہتے تھے کہ میرے سادہ حلیے 'تیل لگے بالوں اور یہ موٹے چشمے کی وجہ سے میرا نکاح تم لوگوں کو شٹل کاک۔۔۔ برقع میں کرانا پڑے گا تاکہ غلطی سے بھی لڑکے کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔"

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولی۔ اس اچانک صورت حال نے سب سے زیادہ اسے ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ عارف اور عبو کی کایا ہی ایک دم پلٹ گئی تھی۔ اداسی کی جگہ چہکار نے لے لی تھی۔

"سچ کہوں تو یہ بات میرے لیے بھی شاکنگ ہے۔" عبو نے ایک آنکھ دباتے ہوئے شرارت سے کہا۔ ثریا نے اس کے سر پہ چپت لگادی۔

"تم ہو ہی اتنی پیاری کہ کوئی بھی تمہیں دیکھ کر دل ہار سکتا ہے۔ ہم دونوں تو تمہیں چھیڑتے رہتے تھے۔" ثریا نے اسے خود سے لگاتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

"سچ۔" اسے شاید یقین نہیں تھا۔

"سچ۔" عبو نے بھی اس بار اسے زور سے خود میں بھینچتے ہوئے کہا تو وہ تینوں ہی کھلکھلا کے ہنس دیں۔

☆ ☆ ☆

"خالہ! آپ لوگ مجھے تو بالکل اکیلا کر کے جارہے ہیں۔" ثریا اداسی سے بولی۔

"نہیں بیٹا! ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ اگلے ماہ ہی تو تمہاری شادی ہے۔ پھر نئے رشتوں میں تم یوں گھل لو گی کہ پرانے بس یاد بن کر رہ جائیں گے۔" انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

"اللہ نے کرم کیا ہے۔ عارف کو گھر اور گاڑی ملی ہے۔ ورنہ سچ کہوں تو اس گھر کو چھوڑنے کا دل نہیں کرتا میرا۔" وہ جذباتی ہونے لگیں۔

"خالہ آپ بھی نا۔ عارف کو دیکھیں کتنا خوش ہے۔" ثریا نے کمرے کے سامنے ٹھہرے گنگناتے عارف کو دیکھتے ہوئے مسرت سے کہا۔

"ہاں اللہ اسے لمبی عمر دے۔ آمین۔" صغریٰ بیٹے کو دعا دینے لگیں۔

"عبو کہاں ہے؟" برآمدے میں کھڑی سدرہ کے کانوں میں سرگوشی سی ہوئی۔ وہ مسکرادی۔

"بارش کی دیوانی چھت پہ ہے۔" اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا تھا۔

صحن کے بالکل بیچ میں وہ آسمان کی طرف چہرہ کیے آنکھیں بند کر کے کھڑی تھی۔ وہ چپکے سے اس کے قریب آگیا۔

"اب تو میں بھی تمہاری طرح بارش کا دیوانہ رہوں گا۔" اچانک ہماری آواز پہ وہ بے طرح چونکی تھی۔

"وہ کیوں؟" عارف کو دیکھ کر دل میں خوشی نے سر اٹھایا۔

"کیونکہ اسی بارش میں میں نے تمہارا اعتراف سنا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"میرا اعتراف!" وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

"ہاں وہ جو تم سدرہ سے لپٹ لپٹ کر کر رہی تھیں اس دن بارش میں۔" اس کی بات پہ عبو کے گال تک سرخ پڑنے لگے۔

"تو... تو کیا تم نے سب سن لیا تھا؟" وہ ہکلائی۔

"ایک ایک لفظ نہ صرف سنا بلکہ حفظ بھی کرلیا۔ سناؤں۔" وہ شریر ہوا۔ عبو کچھ بول ہی نہ پائی۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔

وہ بارش میں کھڑے بھیگ رہے تھے۔ مگر دونوں کو ہی اس بات کا احساس تک نہ تھا۔

"ہم کل۔ نئے گھر میں شفٹ ہوجائیں گے۔ مگر تمہارے ساتھ اپنی نئی زندگی نیا بندھن میں اسی گھر سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی دیواریں میری محبت کی گواہ ہیں۔" اس نے جیب سے ایک خوب صورت سی انگوٹھی نکال کر کہا۔

"کیا تم مجھے یہ حق دو گی؟" خوب صورت مردانہ لہجہ اس کے کانوں کو جیسے نئی زندگی کی نوید سنا گیا۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ عارف نے پیار سے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنادی۔

"عارف!" کسی کی تیز آواز پہ وہ چونکا۔

"ہم سفر... شکریہ۔" اس کے کانوں میں سرگھولتا وہ تیزی سے نیچے اتر گیا اور وہ وہیں کھڑی بھیگتی رہی۔ اسے خوشی تھی۔ اس نے محبت کو پہچان بھی لیا، مان بھی لیا اور قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

آنکھیں موندے اپنے چہرے پہ بارش محسوس کرتے وہ دل سے مسکرادی تھی۔

☆

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں، ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ، سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر، سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ سعدی کو یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے، جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی، ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں، جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی، ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے، جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا



مکمل ناول



ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
چیف سیکیورٹی آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔
نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے۔ اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے" حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر پر "آمس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے در جینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔
اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بد تمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فندے سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس قاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد سیل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔
زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔
حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا در اصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے لینے کے لیے۔۔۔ پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایل پائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

ساتویں قسط

وہ فوراً تیزی سے مڑا دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

حنین سامنے تھی 'نامکمل بندپٹ کی وجہ سے وہ سب کچھ سن چکی تھی۔

"آخر وہ اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہیں کہ انہیں کسی کا بھی خیال نہ ہو! نہ ماموں کا نہ سارہ خالہ کا ان کو صرف اپنا غم یاد ہے۔" وہ شاکی سا کہتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ حنین سست قدموں سے چلتی اس کے قریب آئی۔

"آپ کو پھپھو سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

وہ متعجب رہ گیا۔ "ان کے الزام کی وجہ سے فارس ماموں کو پھانسی ہو جائے گی اور تم کہتی ہو کہ۔۔۔"

"جو بھی تھا' آپ کو پھپھو سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی' کم از کم آپ کو نہیں!"

وہ کہہ کر مڑ گئی۔ سعدی نے خفگی سے سر جھٹکا۔ منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ وہ سخت غصے میں تھا اور وہیں گھٹنوں پہ بازو رکھے' سر جھکائے' اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔

حنین چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ ذرا سی درز سے اندر جھانکا' زمر اسی طرح لیٹی ہوئی تھی' اس کی گردن اب بائیں طرف نہیں تھی سیدھی تھی' وہ اوپر دیکھ رہی تھی اور وہ رو رہی تھی' بری طرح! کبھی وہ اپنے ساتھ لگی نلیوں کو دیکھتی' کبھی مشینز کو' کبھی سفید چادر کو' کبھی ہاتھ میں لگے کینولا کو اور آنسو ابل ابل کر آنکھوں سے گرتے جا رہے تھے' کبھی کوئی ہلکی سی سسکی بھی نکل جاتی تو وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے اسے دبا لیتی' اس کے لیے یہ بہت شرمندگی کی بات تھی کہ کوئی اسے روتا دیکھ لے' وہ بہت مضبوط تھی۔

حنین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بڑے دل کے ساتھ پلٹ آئی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ کون سچ کہہ رہا تھا اور کون جھوٹ۔ لیکن کیا اب اس بات سے فرق پڑتا تھا! اس نے زمر کو پہلی دفعہ روتے دیکھا تھا۔ اس کا دل بہت بھاری ہو گیا تھا۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

ندرت اور بڑے ابا زمر کے کمرے میں تھے۔ وہ جان بوجھ کے زمر کے پاس اندر نہیں گیا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا مگر زمر نے اسے اندر بلایا بھی نہیں۔ ایک دفعہ کسی سے پچھوایا بھی نہیں۔ اس کو منایا بھی نہیں۔

وہ خفا خفا سا باہر ہی بیٹھا رہا۔ وہ آج پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ صحت میں نہیں جذباتی کیفیت میں۔ ٹیک لگا کر قدرے اٹھ کے بیٹھی۔ گھنگریالے لمبے بال پونی میں سنبھال کر باندھے خاموش اور سنجیدہ۔

سامنے وہیل چیئر پہ موجود نحیف اور بیمار سے بڑے ابا کو اس کا ہر انداز مزید اذیت دے رہا تھا۔ وہ بھی ایک فکر مند نگاہ زمر پر ڈالتے جو دور کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتی بظاہر ان دونوں کو نظر انداز کر رہی تھی' جو خاموش سی سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھیں۔ زمر لاکھ عزیز سہی فارس ان کا بھائی تھا۔ سعدی کی طرح زمر سے جھگڑا کر کے اس پہ چیخ چلا کر ناراض نہیں ہو سکتی تھیں۔ ذہن میں بار بار خیال آ رہا تھا آخر وہ بھی فرحانہ کی بیٹی ہی نکلی' مگر وہ ظاہر نہیں کر رہی تھیں' بالکل چپ' کسی نہ کسی مصالحت کی امید لیے۔

بڑے ابا نے ہاتھ بڑھا کے بیٹی کے ہاتھ کو تھاما' وہ اس کے بیڈ کے کافی قریب بیٹھے تھے' ان کی ضد اور اصرار پہ آج انہیں یہاں آنے کی اجازت ملی تھی۔ اس نے بس سے۔ کس پہ زمر نے سر گھما کے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کمزور اور بوڑھے لگ رہے تھے' اداس بھی۔

"بیٹا! میں فارس کو جانتا ہوں' وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا' ضرور اس کو پھنسایا جا رہا ہے۔"

"ہم کسی جس آفیسر کو کون پھنسا سکتا ہے ابا!" وہ بیزار ہوئی۔

"کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں ہو سکتے؟ ان کی کمزوریاں نہیں ہوتیں؟ ان انٹیلی جنس آفیسرز کی فائلوں کے انبار ہیں جو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی نکالے گئے' پھنسائے گئے یا پھانسی چڑھ گئے۔ وہ سب سے الگ ہے کیا؟"

"ٹھیک ہے آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹ

بول رہی ہوں' حالانکہ سب سے زیادہ نقصان میرا ہوا ہے' میں نے اس کے الفاظ سنے تھے' میں نے اس کی منت کی تھی کہ وہ میرے اوپر گولی نہ چلائے' وہ میری زندگی خراب نہ کرے۔" درد سے پھٹی آواز میں کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ "میں نے ابا اس کو اتنا تک کہا کہ میں اس کا کیس لڑوں گی' ہر عدالت میں' ہر جگہ اس کے ساتھ کھڑی ہوں گی' وہ میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرے۔ لیکن اس نے پھر بھی مجھ پہ گولی چلائی' اس نے پھر بھی مجھے مارنا چاہا۔ اگر اس نے میری کوئی خیر قبول نہیں کی تو آپ اس کے لیے مجھ سے کسی خیر کی توقع مت رکھیں۔"

"میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہیں' لیکن یہ صرف اور صرف کوئی غلط فہمی ہے۔" زمر نے بے زاری سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے نکال لیا۔ وہ دل مسوس کر بیٹھے رہ گئے۔

"آپ لوگ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ جس کو مجرم سمجھنا چاہیے' اس کے لیے آپ کے دل میں ہمدردی ہے تو ٹھیک ہے' ہمدردی لینے کا مجھے بھی شوق نہیں۔ میں جیسی ہوں' ویسی ہی ٹھیک ہوں۔"

"ایسے کیوں سوچتی ہو؟ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہم انتظام کر رہے ہیں' بہت جلد کوئی کڈنی ڈونر مل جائے گا' تمہیں کبھی ڈائلیسز پر نہیں آنا پڑے گا' تم دوبارہ سے صحت یاب ہو جاؤ گی۔"

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ گردن پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔

ندرت آہستگی سے اٹھیں' اس کے قریب آئیں اور بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھ کر۔ منت بھری بے بسی سے اس کو دیکھا۔

"زمر! میرے لیے کیا تم اپنا بیان واپس نہیں لے سکتیں؟ فارس جیل چلا جائے گا' اس کو سزا ہو جائے گی' وہ برباد ہو جائے گا۔" اس نے زخمی نگاہوں سے ندرت کا چہرہ دیکھا۔

"اور میرا بھائی! میری خوشیاں' میرے غم؟ ان کا کیا؟ آپ سب کو لگتا ہے کہ میں اپنی ضد پہ اڑی ہوئی ہوں؟" شکایت آمیز نظر اپنے باپ پر ڈالی "لیکن آپ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ میرے پاس ضد کرنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ تباہ ہو چکی ہوں میں! اب فارس برباد ہو یا آباد' مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے! میں نے اس کی عزت کی ہمیشہ' کیونکہ مجھے انسان کے اندر کی اچھائی پہ یقین ہوتا ہے' مگر میں غلط تھی' وہ ویسا ہی ہے جیسا لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے۔ آپ اس کے لیے مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔ کیونکہ میں آپ سب کی بے اعتباری سہہ سکتی ہوں لیکن فارس کو معاف نہیں کر سکتی۔"

وہ گردن موڑ کر پھر سے کھڑکی کو دیکھنے لگی۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ اب وہ لوگ چلے جائیں۔

ندرت شکستگی سے اٹھیں' گھوم کر بڑے ابا کی وہیل چیئر کے پیچھے آئیں اور انہیں لے کر باہر نکل گئیں۔ دروازہ حسب معمول آدھا کھلا رہ گیا۔ اسے آوازیں آ رہی تھیں۔ دروازے کے پار راہداری میں وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ وہ کسی سے مخاطب تھیں۔ خاتون کی آواز۔ فضیلہ آنٹی۔ حماد کی امی' وہ پہچانتی تھی۔ وہ آہستگی سے سیدھی لیٹی' تکلیف چہرے پہ نمودار ہوئی۔ اور آنکھیں بند کر لیں' بالکل ایسے جیسے وہ سو رہی ہو۔

واقعی یہ وہ صبحیں تھیں جن میں جاگتے ہوئے اسے آفس جانے کی کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ کون سی خواہش کہاں آ کر پوری ہوئی تھی!

ندرت' فضیلہ آنٹی کو اندر لے آئی تھیں۔ زمر کی آنکھوں میں فی الحال صرف اندھیرا تھا' مگر وہ آوازیں سن سکتی تھیں۔ فضیلہ آنٹی یقیناً" اس کے بازو کے قریب بیڈ کے ساتھ کھڑی تھیں۔

اس نے انہیں کہتے سنا۔

"بہت زیادہ افسوس ہوا۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ زمر کے ساتھ اس طرح ہو گا' وہ بھی اتنے اہم موقع سے پہلے! ہمارے تو سارے رشتے دار بھی آ چکے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ حماد کے بہن بھائی۔ بتا نہیں'

کتنوں کی فلائٹس ہیں۔ آگے کروانی پڑیں گی یا شاید کینسل۔"

وہ کہہ ہمدردی سے ہی رہی تھیں، مگر انداز میں کوئی عجلت تھی۔ زمر بند آنکھوں سے سنے گئی۔

"آپ تو جانتی ہیں، دو شادیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ حماد کے تایا کے بیٹے کے فنکشنز بھی ساتھ ہی تھے۔ ولیمہ تو ہم دونے ہی اکٹھا رہے تھے۔ اب ظاہر ہے یہ شادی تو ابھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جہاں کے فنکشنز تو کل سے، شروع ہو جائیں گے۔ اب آپ تو جانتی ہیں، ہماری بھی مجبوری ہے۔"

"سب کی مجبوریاں ہیں، میں جانتی ہوں۔" ندرت بولیں تو آواز میں پسپائی تھی۔

زمر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ ندرت اب شاید ان کے لیے کوئی جوس نکالنے لگی تھیں، مگر وہ منع کرنے لگیں۔

"حماد باہر انتظار کر رہا ہے، ایسا کرتے ہیں ہم وہیں بیٹھتے ہیں۔ اس کمرے میں تو مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔ پتا نہیں ہسپتالوں میں ایسی گھٹن کیوں ہوتی ہے۔"

اور ان کی آواز دور ہوتی گئی۔ شاید وہ کمرے سے جا رہی تھیں۔ اور پھر دروازہ بند ہو گیا، سناٹا چھا گیا، قبر کی پہلی رات کا سا سناٹا۔ زمر نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اب کمرے میں اکیلی تھی۔ اب کوئی بھی چیز افسوس نہیں دلاتی تھی۔ سارے احساسات مر گئے تھے۔ اسے پتا تھا اب کیا ہو گا۔ دوسری دفعہ اس کی منگنی ٹوٹ جائے گی۔ پھر بھی ایک امید تھی، شاید ایسا نہ ہو۔

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں کہیں چہرہ نہیں ہے

دروازہ اک دم کھلا، وہ چونکی۔ اتنی جلدی میں سب کچھ ہوا کہ وہ سوئی بھی نہ بن سکی۔ مگر پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ آنے والی فضیلہ یا ندرت نہیں تھیں۔

خود کو زمر کے پاس اکیلا چھوڑ دینے کا کہتی، جواہرات کاردار نے اندر قدم رکھا۔

بند گلے کے نیوی بلیو گاؤن، لمبی سفید ہیل، بالوں کا نفیس سا جوڑا، جوان، خوب صورت اور بے حد اسمارٹ سی جواہرات مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ زمر اسی بے رنگی اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔

"ہیلو زمر! کیسی ہو؟"

ایک فلپائنی ملازمہ اور ایک سوٹ میں ملبوس ملازم پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لیے اس کے پیچھے آئے اور کمرے میں موجود میزوں کو ان سے بھر دیا۔ جواہرات نے ہلکا سا آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ مودب سے باہر نکل گئے۔

ساتھ ہی شہرین کاردار اندر آئی۔ اس نے لمبی قمیص پہن رکھی تھی اور کندھے پہ شی چین کا پرس تھا۔ سنہرے باب کٹ بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں پیچھے کرتی، مصنوعی سی مسکراہٹ لیے وہ جواہرات کے ساتھ چلتی آگے آئی۔ زمر کے قریب رکی اور جیسے تعارف کروایا۔

"میں مسز ہاشم کاردار ہوں۔ ہم پارٹی میں ملے تھے۔"

زمر نے سر کے خم سے ان دونوں کے رسمی کلمات کا جواب دیا، جیسے وہ شدید کوفت میں مبتلا ہو۔ جواہرات نے زمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسے شہرین کو بتایا۔

"زمر یوسف، پبلک پراسیکیوٹر ہے۔ ہاشم نے یقیناً تم سے ذکر کیا ہو گا۔"

شہرین نے منہ میں کچھ چباتے ہوئے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"جی آئی نو۔ ڈی اے ہیں یہاں کی۔" وہ زمر کی طرف مڑی "ڈی اے، کیسی ہو تم؟" اس کو جیسے اپنے انداز تخاطب سے خود ہی لطف آیا تھا۔

زمر نے رکھائی سے "بہت اچھی" کہہ کر نظروں کا رخ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ وہاں وہ سرمئی بادلوں سے سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔

"آپ بیٹھیے مسز کاردار! میں باہر جاتی ہوں، یہاں

بور ہو جاؤں گی۔"

شہرین اپنے بالوں کو پھر سے پیچھے جھٹکتی 'بے نیازی سے کہتی مڑ کر باہر نکل گئی۔ جواہرات بس مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھی' کہنیاں کرسی کے ہاتھ پہ اور انگوٹھیوں والے ہاتھ باہم ملائے۔ اسی شیریں مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے جو تمہارے ساتھ ہوا۔ یقیناً" جس نے بھی کیا وہ۔۔" اس نے تنک کر جواہرات کو دیکھا۔

"جس نے بھی کیا کیا مطلب؟؟ فارس نے کیا ہے یہ سب! اور اگر آپ اس کی وکالت کرنے آئی ہیں' میرے سامنے تو پلیز اپنا وقت ضائع مت کیجئے گا۔"

"نہیں میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اس نے یہ کیوں کیا؟ کیا کوئی وجہ بتائی تھی اس نے؟" جواہرات نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

زمر نے آنکھیں سکیڑ کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کو میری بات کا یقین ہے؟" جواہرات نے مسکرا کر شانے ذرا سے جھٹکے۔

"میں جانتی ہوں تم سچ بول رہی ہو۔"

"اور آپ یہ کیسے جانتی ہیں؟ ہم دوسری دفعہ مل رہے ہیں!" وہ سرد سا گھور کر بولی۔ اگر یہ اس سے قریب ہونے کی کوئی کوشش تھی تو وہ ہاشم کی ماں کو اس میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

"کیونکہ میں اس اذیت کو پہچانتی ہوں جو غلط سمجھے جانے والے سچے لوگوں کے چہروں پہ ہوتی ہے۔" زمر کی مشکوک آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"اور آپ مجھ سے دوسری ملاقات میں میرا چہرہ کیسے پڑھ سکتی ہیں؟"

جواہرات اٹھی اور قدم قدم چلتی کھڑکی تک گئی۔ باہر بارش کی ننھی ننھی بوندیں زمین پہ گر رہی تھیں۔ وہ چند لمحے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی پھر مڑی تو چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔

اس کی جگہ افسوس تھا۔

"مجھے واقعی دکھ ہے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا' کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ کیونکہ اس چیز نے تمہاری زندگی برباد کر دی اور زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ کوئی تمہاری بات پہ یقین نہیں کر رہا۔ میں سب جانتی ہوں۔ ہاشم مجھے بتا چکا ہے اور ہاشم کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ کہہ رہا ہے اسے تم پہ یقین ہے۔ تو یقیناً" ایسا ہو گا۔ لیکن جہاں تک میری بات ہے میں تمہیں نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے تم جھوٹ بول رہی ہو' ہو سکتا ہے۔ تم سچ بول رہی ہو۔ لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جب کسی کو درست ہوتے ہوئے ناقابل اعتبار سمجھا جائے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔"

زمر کے تنے تاثرات قدرے ڈھیلے پڑے تھے مگر لہجے کی رکھائی برقرار تھی۔

"کم از کم میری فیلنگز آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ اپنی زندگی میں بہت عیش و آرام سے رہنے والی ایک ملکہ ہیں۔ آپ کی ایک سلطنت ہے۔ آپ ہم جیسے لوگوں اور ہمارے مسائل کو نہیں سمجھ سکتیں۔"

جواہرات اٹھی اور قدم قدم چلتے کھڑکی تک گئی۔ اس کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشے پہ پانی کی بوندیں تڑ تڑ کرنے لگی تھیں۔

"میں واقعی ایک ملکہ ہوں' اس میں کوئی شک نہیں۔ میں اور میرا شوہر اس شہر کے بہترین کپلز میں چوتھے نمبر پہ شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن کیا تم یہ جانتی ہو کہ میں اس کی دوسری بیوی ہوں؟"

زمر نے بری طرح چونک کے اسے دیکھا۔ لب "اوہ" میں سکڑے۔

"چلو' پہلی بیوی تو مر گئی' مگر کیا تم یہ جانتی ہو کہ میرے بعد بھی اس کی زندگی میں کوئی عورت آئی تھی۔ اس کے بعد کتنی آئیں میں نے حساب رکھنا چھوڑ دیا' اب یاد ہے تو صرف نفرت جو میں اس سے کرتی ہوں' مگر ڈرتی بھی ہوں۔ ملکہ بننا بھی آسان نہیں ہوتا۔"

زمر کے چہرے کی ناگواری اب خاموشی میں بدل

گئی تھی، وہ دھیان سے سن رہی تھی۔

"جب نوشیرواں چار سال کا تھا' مجھے ان کی حرکات و سکنات مشکوک لگتی تھیں۔ میں نے ایک پرائیوٹ انویسٹی گیٹر ہائر کیا تھا

ہم سب اندر سے چکنا چور ہوتے ہیں' میں بہت سی باتیں اپنے شوہر سے کہہ نہیں سکی۔ ایک دن آئے گا جب میں کہوں گی' جب میرے اندر کی شیرنی غرائے گی۔ لیکن تب تک۔۔۔"

اس نے بارش سے بھیگتے شیشے سے ہاتھ اٹھایا' مڑی اور کرب سے مسکرائی۔

"تب تک مجھے مصنوعی مسکراہٹوں کے ساتھ کھیلتے رہنا ہو گا' کیونکہ انتقام کی پہلی سیڑھی اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنا ہے۔" وہ واپس چلتی ہوئی آئی' کرسی پہ بیٹھی اسی تمکنت اور رعونت سے اور موتی کے ایئر رنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"اور دوسری ملاقات میں تمہیں یہ سب میں کیوں بتا رہی تھی؟ تاکہ یہ سمجھا سکوں کہ اگر آج تم اپنے انتقام کے لیے نہ کھڑی ہوئیں تو کبھی نہیں ہو سکو گی' اور اگر تم اس سفر میں اکیلی رہ جاؤ تو بھی میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

زمر یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی' چہرے کی ساری تلخی' بے رخی' بے زاری غائب تھی۔ جواہرات نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی' اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے جانا ہے ایک میٹنگ میں' پھر ملاقات ہو گی۔"

"آپ بیٹھیے نا!" وہ بے اختیار بولی' تو اپنی آواز میں نرمی محسوس ہوئی۔ جواہرات نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"کسی کی ذات کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کا ایک ٹکڑا توڑ کر اسے دکھانا ہوتا ہے' میں نے یہ کر لیا' مگر تکلیف مجھے بھی ہوئی ہے' اب چلوں گی۔" نرمی سے کہتی وہ مڑی' آنکھ کا ایک کونا بھیگ گیا تھا۔ اور تب زمر اس کی گئی تذلیل' دکھ' بے وفائی سب

یاد آ گیا تھا اور ہ ریک ہیل سے چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

باہر ویٹنگ روم میں حنین اسی طرح بیٹھی تھی' بال جانے کب کے برش کیے ہوئے' بددل' مرجھائی ہوئی سی۔ سعدی اس کے مقابل اداس سا بیٹھا تھا۔ بار بار نگاہیں پھپھو کے کمرے کی طرف جاتی راہداری کی طرف اٹھتیں' پھر سر جھٹک کر بے بڑا کر خود کو روک لیتا۔

دفعتاً" کسی آہٹ پر اس نے سر اٹھایا' چوکھٹ میں شہرین کھڑی تھی۔ سعدی بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا' اس نے اشارہ کیا۔ باہر بلانے کا اشارہ' حنین اپنی سوچ میں گم تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر شہرین کے پیچھے آیا۔

وہ راہداری میں کھڑی تھی سینے پہ بازو لپیٹے' فرصت سے اس کو آتے دیکھتی رہی۔

"جی کہیے مسز کاردار؟" وہ سرد مہری سے اس کو دیکھے بنا دائیں طرف ٹرالی گھسیٹتی نرس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم سوری میں تم سے ایکسکیوز کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کر دی تھی۔ شیرو اور تمہارے بیچ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔" سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر آنکھیں چندھیا کر اس کی ذہنی حالت جانچنا چاہی۔

"اٹس او کے۔" وہ بغور اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"گڈ' یعنی کہ اب ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟ ہوں؟" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ اس کی گال کی ہڈی اٹھی ہوئی تھی' جب مسکراتی تو آنکھیں چھوٹی ہو جاتیں۔

"کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"ابھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' مستقبل میں ہو۔" اس نے ابرو اچکائے۔

"آپ بے فکر رہیے' نہ میں نے کچھ سنا تھا' نہ میں کسی کو کچھ بتاؤں گا۔" اس نے پچھلے سال کی بھولی بسری بات کی طرف اشارہ کیا۔

"میں بے فکر ہوں' کیونکہ ہاشم کو پتا چل گیا تھا۔" سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا؟"
"یہی کہ میرا اپنے کزن کے ساتھ افیئر چل رہا ہے۔ اور دیکھو' اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔"
اس نے کف تان کر شرٹ کی کھلی سی آستین اوپر اٹھائی' کندھے کے قریب بازو کی جلد سامنے آئی۔ اس پہ جا بجا سیاہ سے نیل تھے' کٹ بھی لگے تھے۔ سعدی بالکل ساکت سا رہ گیا۔
"یہ؟"
"یہ میرے شوہر نے مجھے پیٹا تھا' اب اس بات کو کافی دن گزر چکے ہیں۔ یہ پارٹی کے بعد کی بات ہے۔ اس لیے مجھے بالکل بھی کوئی ڈر نہیں رہا کہ تم کسی کو کچھ بتاؤ گے' چونکہ مجھے کوئی ڈر نہیں ہے تو میرے خیال سے ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔"
آستین نیچے کی' دوبارہ سے مسکرائی۔ اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا جیسے ہاشم تھپکتا تھا اور مڑ کر کوریڈور میں آگے چلتی گئی۔ سعدی جز بز سا اس کو جاتے دیکھتا رہا' عجیب سی تھی وہ۔ اوں ہوں سر جھٹکا۔ اور آگے چلتا آیا۔

☆ ☆ ☆

کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی انسانوں میں
وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں

زمر کے کمرے کے قریب ندرت' فضیلہ اور حماد کے ساتھ کھڑی تھیں۔ بڑے ابا بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حماد اکھڑا اکھڑا سا الگ رہا تھا۔ فضیلہ ہی ساری باتیں کر رہی تھیں اور وہیل چیئر پہ بیٹھے بڑے ابا بس آس بھری نگاہوں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ "پتا نہیں اب آگے کیا ہو گا؟ پتا نہیں اب آگے کیا ہو گا؟" فضیلہ کی ہر بات میں پریشانی اور کبھی رکھائی سے ایک ہی فقرہ بار بار آتا۔ ان کے تاثرات ہر شخص سمجھ رہا تھا' ان کا بھی قصور نہیں تھا۔
"ہم کوشش کر رہے ہیں' بہت جلد اس کو کڈنی ڈونر مل جائے گا اور پھر وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

بڑے ابا نے امید دلانے کی کوشش کی۔ حماد نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔
"ڈونیٹڈ کڈنی کتنا عرصہ چلتا ہے؟" الفاظ تھے کہ چابک۔ جو بھی تھا بڑے ابا کے منہ پہ لگا تھا۔ وہ بس اس کو دیکھ کے رہ گئے۔ پھر آہستہ سے بولے۔
"عیسائی جب شادی کرتے ہیں تو ایک حلف اٹھاتے ہیں کہ غریبی میں اور امیری میں' بیماری میں اور صحت میں ہم ساتھ رہیں گے۔ حتیٰ کہ ہمیں موت جدا کر دے۔ صد شکر کہ ہمارے یہاں یہ حلف نہیں اٹھایا جاتا ورنہ بہت سے لوگ مشکل میں پڑ جاتے۔"
حماد بے زاری سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ فضیلہ جلدی سے بات بدلنے لگیں' تب ہی جواہرات کاردار باہر آتی دکھائی دی۔ سعدی کے تنے اعصاب اس کو دیکھ کر ڈھیلے پڑے۔ وہ مسکرائی تو وہ بھی مسکرایا۔ اس فیملی کو دیکھ کے کتنی تسلی ملتی تھی۔ جیسے ہر مشکل میں ان کے ساتھ ہوں۔ وہ قریب آئی۔
"مجھے امید ہے کہ آپ کی بیٹی بہت جلد صحت یاب ہو جائے گی اور اگر نہ ہو' تب بھی وہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے ساتھ یہ اس کی زندگی کے ساتھی کو فخر ہو گا۔"
ساتھ ہی حماد کو دیکھا' اس کا حماد سے تعارف نہیں تھا' تب بھی وہ سمجھ گئی تھی۔ یہی ہے بے چارہ منگیتر۔ سعدی ان کا تعارف کروانے لگا۔
"اورنگ زیب کاردار کی بیوی' ہاشم کاردار کی ماں"
فضیلہ اور حماد کے تاثرات فوراً" بدلے۔ بہت خوش دلی سے ان سے ملے۔ اس کے ملازم دور کھڑے تھے۔ اور پھر اس کا رعب' تمکنت سے اٹھی گردن' گہری آنکھیں اور لبوں کی مسکراہٹ۔ وہ تو تھی ہی ملکہ۔ سوائے بڑے ابا کے' اس کے آگے جھکنے والوں کی کمی نہ تھی۔
"تم پریشان مت ہو" اس نے گہری نظروں سے حماد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گی۔ کیا تم مجھے آفس تک چھوڑ دو گے؟ زمر ہماری فیملی ہے اور اس کے فیانسی سے دوبارہ ملاقات کا وقت جانے ملے یا

نہیں۔" ساتھ ہی امید افزا نگاہوں سے سعدی کو دیکھا۔ وہ مسکرا دیا "یقیناً" اب وہ اس کو سمجھائے گی اور جواہرات تو جواہرات تھی۔ وہ کہے اور کوئی انکار کرے' ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ حماد بے ساختہ "جی بالکل شیور" کہنے لگا۔ جواہرات سر کو خم دے کر آگے چلتی گئی۔

حماد فوراً" پیچھے لپکا۔ فضیلہ بیگم نے تذبذب سے ان دونوں کو جاتے دیکھا۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

باہر بارش اب تھم چکی تھی۔ گاڑی کے قریب آکر جواہرات نے مسکرا کر ڈرائیور سے کہا۔ "اپنی شکل گم کرو۔" اور ہتھیلی پھیلائی۔ اس بے چارے نے جلدی سے چابی اس کے ہاتھ پہ رکھی اور واقعی وہاں سے گم ہو گیا۔ وہ حماد کی طرف مڑی۔

"آفس کا ایڈریس میں تمہیں بتا دوں گی۔ ایسی کار ڈرائیو کرنے کے موقعے کو امید ہے' تم ضائع نہیں کرو گے۔" اور گھوم کر فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھ گئی' حماد نے چابی دیکھی' اور پھر اس چمکتی ہوئی گاڑی کو' آنکھیں جیسے خیرہ ہو گئیں۔

جواہرات فرنٹ سیٹ سے پچھلی نشست کے ساتھ کھڑی ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ وہ جو پہلے اپنا دروازہ کھولنے لگا تھا' رکا۔ پھر تیزی سے گھوم کے اس طرف آیا' اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ تمکنت سے اندر بیٹھی۔ حماد نے کسی ڈرائیور کی طرح دروازہ بند کیا اور واپس ڈرائیونگ سیٹ تک آیا۔

"یہاں سے سیدھا لے لو۔" اس نے محض اتنا کہا اور وہ خود کو بہت پراعتماد ظاہر کرتا ڈرائیو کرنے لگا۔

گاڑی سڑک پہ رواں دواں تھی۔ جواہرات سر جھکائے اپنے موبائل پہ فون بک کھول رہی تھی۔ حماد مرعوب سا خاموش سا ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔

"بے فکر رہو' وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے کانٹیکٹس کی فہرست آہستہ آہستہ نیچے کرتے ہوئے کہا۔ حماد نے بیک ویو مرر میں سے دیکھا۔ اور پھر سامنے ونڈ اسکرین کو۔

"جی۔" بس وہ اتنا کہہ سکا۔

"امید ہے' اسے ڈونر کڈنی مل جائے گا۔ سال ڈیڑھ تو چل ہی جائے گا۔ بے کار ہو گیا تو کوئی بات نہیں ڈائیلیسز پہ آجائے گی۔ ہفتے میں دو دفعہ ہی تو کروانا پڑے گا۔ آخر اچھی لڑکی کے لیے تو تم اتنی قربانی دے ہی سکتے ہو۔" وہ اے والے نمبرز سے گزرتی بی پہ آگئی تھی۔

"رہا بچوں کا سوال' تو وہ زندگی کا مقصد تو نہیں ہوتے۔ نہ بھی ہو سکیں تو کوئی بات نہیں' اڈاپٹ کر لینا۔" ہلکے سے شانے اچکاتے ہوئے اس کا انگوٹھا اسکرین کو مسلسل نیچے کیے جا رہا تھا۔ ڈی اور پھر ای' ابھی تک مطلوبہ شخص سامنے نہیں آیا تھا۔ حماد کے چہرے پہ چھایا تفکر بڑھتا گیا۔ البتہ وہ خاموشی سے محض "جی" کر کے رہ گیا۔ جواہرات اسے زمر کے لیے قائل کر رہی تھی یا اس سے متنفر' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"دیکھو' زندگی میں ہر چیز پرفیکٹ تو نہیں ملتی۔ میرا خیال ہے وہ ایک اچھی لائف ہے اور تمہارے ساتھ آسٹریلیا جا کر بھی اپنی پڑھائی اور جاب جاری رکھ سکے گی۔ نہ بھی رکھ سکی تو تم ایک کمانے والے بہت ہو۔ نہیں؟"

حماد کی آنکھوں میں مزید تناؤ آگیا۔ اس نے سر کو اثبات میں خم دیا' لب سے "جی" تک نہیں بولا۔

جواہرات کا اسکرین پہ چلتا انگوٹھا ایک دم رکا۔ لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ یہ جے کی فہرست تھی' جیلانی' رقیب جیلانی۔ اس نے اس نمبر پہ ایک ٹیکسٹ بھیجا۔

"میرے آفس کے باہر میرا انتظار کریں۔" اور فون رکھ کے' سر اٹھا کر چمکتی نگاہوں سے حماد کو دیکھا۔ یہاں سے اس کے سر کی پشت' کان اور آدھے چہرے کے تنے تاثرات وہ دیکھ سکتی تھی۔

"آگے کا کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا' قسمت جس طرف لے جائے۔" وہ احتیاط سے تول تول کے اتنا ہی کہہ سکا۔

آفس کے سامنے وہ اترے تو جواہرات تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی' حماد تابعداری سے اس کے پیچھے تھا۔ مطلوبہ فلور پہ پہنچ کر بھی وہ اس کے آگے ہی چلتی جا

رہی تھی۔ اردگرد مودب ہو کر رکتے اور سلام کرتے لوگوں کو مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی وہ آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک آفس کے سامنے آ رکی۔ وہاں ایک سوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر صاحب بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتے متفکر سے نظر آ رہے تھے۔ جواہرات کو آتے دیکھ کر چہرے پہ چمک آئی۔ آگے بڑھے۔

"میم! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" جواہرات نے مسکراتے ہوئے ان سے حملو کا تعارف کروایا۔

"یہ ہمارے عزیز ہیں حملو۔ اور حملو! یہ ہاشم کی ایک کمپنی کی طرف سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں' آدھا سال یہاں اور آدھا وہاں بچوں کے پاس' لو عمر کی نیشنلٹی بھی ہے نکر رہتے ہیں ہیں۔" پھر اسی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ جیلانی صاحب کو دیکھ کر بولی۔

"حملو ایک انجینئر ہے اور آسٹریلیا میں جاب کرتا ہے۔ آپ کو اس سے مل کر خوشی ہو گی۔" ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"ہاشم میرا انتظار کر رہا ہو گا' میں چلتی ہوں۔" وہ آگے بڑھی تو خوش دلی سے حملو سے مصافحہ کرتے ہوئے جیلانی صاحب معذرت کر کے دو قدم جواہرات کے پیچھے آئے۔ حملو وہیں ملے جلے تاثرات میں کھڑا رہ گیا۔ خوش ہونا چاہیے یا پریشان؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"میں اس لڑکے کا کیا کروں؟ مجھے تو وہاں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" جیلانی صاحب نے آگے بڑھتی جواہرات کے قریب آ کر ہلکی سی سرگوشی کی۔ وہ مسکرا کر ان کی طرف پلٹی' چمک دار آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"کیا آپ کو اپنی بیٹی کے لیے ایک پڑھے لکھے' خاندانی اور خوش شکل گدھے کی ضرورت نہیں تھی؟"
جیلانی صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں' سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

"گڈ' تو پھر بس میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ یو آر ویلکم"۔ ان کے تھینکس کا انتظار کیے بغیر وہ مڑ کر آگے بڑھ گئی۔ جیلانی صاحب اب کے زیادہ گرم جوشی سے مڑے' اور حملو کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے اپنے ساتھ آگے لے گئے۔

وہ ہاشم کے آفس میں آئی تو وہ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھا' کہنیاں میز پہ رکھے انگلیوں کے پوروں سے آنکھیں مسل رہا تھا۔ کوٹ پیچھے ٹنگا تھا اور شرٹ کے کف مڑے ہوئے تھے۔

"تمہارے اور شہرین کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی ہے؟" آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چہرے پہ تعجب ابھرا۔

"آپ سے کس نے کہا؟"

"شہرین کے موڈ نے۔" وہ کہنی پہ ٹکا پرس بے نیازی سے میز پہ رکھتی اس کے سامنے بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور گلے میں پڑی چین انگلی پہ لپیٹتی مسکرا کے گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ہاشم نظریں چرا گیا۔

"اگر ہوئی بھی ہے تو کیا؟ میں ہمیشہ کی طرح اس کو معاف کر دوں گا اور اگر معاف نہ کر سکا تو چھوڑ دوں گا۔"

"یعنی تمہیں معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنے کزن سے افیئر تھا۔" اس نے آہستہ سے بری طرح چونک کر ماں کو دیکھا۔

"کیا آپ جانتی تھیں؟"

"بالکل۔"

"تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتانے سے تم ناخوش ہو جاتے' اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ بہرحال۔" جواہرات نے بات بدلنے کے سے انداز میں سر جھٹکا۔

"فارس کے کیس کا کیا بنا؟" ہاشم بے زاری سے کرسی پہ پیچھے کو ہوا۔ وہ خود بھی شہرین والے کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قلم اٹھا کر انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

"اگر زمر اپنے بیان پہ قائم رہے تو کیس بہت مضبوط ہے۔"

"وہ رہے گی۔" پھر آنکھوں سے گلاس ڈور کے پار اشارہ کیا۔ ہاشم نے اس طرف دیکھا۔ جیلانی صاحب حماد کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ہمراہ لیے آہستہ آہستہ مختلف کیبنز کی طرف اشارہ کرتے بتاتے جا رہے تھے۔ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟"

"زمر کا منگیتر۔" ہاشم نے ایک دم اکتا کر ماں کو دیکھا۔

"ممی! آپ کیا کرتی پھر رہی ہیں؟ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ہر چیز سنبھال رہا ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا' صرف ایکسیلیٹر پہ پاؤں رکھا ہے' یہ منگنی ویسے ہی ٹوٹ جانی تھی۔ جتنی جلدی ٹوٹے گی' اتنا زیادہ زمر اپنے بیان پہ قائم رہے گی۔ ورنہ تم اس کے خاندان کو جانتے ہو' وہ اسے بیان بدلنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔" ہاشم کے لیے اتنا بہت تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔

"رات کو کھانے پہ ملتے ہیں۔" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے جیلانی صاحب نے اسے دیکھ کر گرم جوشی سے حماد سے تعارف کروانے کی کوشش کی۔

"یہ ہاشم..." مگر وہ ایک نظر بھی ڈالے بغیر سخت تاثرات کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اورنگ زیب کے آفس کا دروازہ زور سے کھولا۔ وہ اندر اپنی کیبنٹ کے لوگوں اور اس پی کیپ والے کنسلٹنٹ کے ساتھ مصروف نظر آ رہے تھے۔ ہاشم نے سخت نگاہوں سے صرف ایک اشارہ کیا اور وہ سب اپنی چیزیں اٹھائے باہر نکل گئے۔ اورنگ زیب قدرے تشویش سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ میز کے سامنے آیا اور بولا۔

"میں علیشا کے معاملے کو سنبھال لوں گا' لیکن پھر آپ کو ایک قربانی دینی پڑے گی۔"

"اور وہ کیا؟"

"وہ فارس کی ایلی بائی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ لڑکی چپ چاپ یہاں سے چلی جائے تو پھر وہ فارس کے حق میں بیان نہیں دے گی۔ علیشا کے جانے کا مطلب ہے' فارس جیل سے نہیں نکلے گا۔" اورنگ زیب کاردار ماتھے پہ بل لیے اس کو سنتے رہے۔ چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔ اور پھر بولے۔

"عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کیسز میں وہی لڑکی اس کی ایلی بائی ہے۔"

"اس کی بھانجی بھی ساتھ تھی۔"

"وہ تو اس کی رشتے دار ہے اور چھوٹی بچی ہے' ہاشم! اس کی گواہی میٹر نہیں کرتی۔"

"پھر میں علیشا کو یہاں سے بھیج دوں گا' لیکن آپ فارس کو نکلوانے کی بالکل کوشش نہیں کریں گے۔" اورنگ زیب کاردار نے ہلکے سے شانے جھٹکے۔

"مجھے اس کی بے گناہی کا یقین نہیں ہے' یقیناً" اس نے علیشا کو کچھ دے کر اس گواہی پہ مجبور کیا ہو گا۔ تو ٹھیک ہے' وہ چلی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔"

ہاشم ان کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتا مڑ گیا۔ تیز تیز چلتا باہر آیا۔ باقی لوگ تو بکھر گئے تھے صرف کنسلٹنٹ لڑکا جو وہاں کھڑا تھا فوراً اس کی طرف لپکا۔

"اگر ان خفیہ میٹنگز کا تعلق اس لڑکی سے ہے جو اس دن آئی تھی تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں ہمیں اسے کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ کیونکہ ایسی لڑکیاں۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کر پاتا' ہاشم نے ایک دم جھپٹ کر اسے گردن سے پکڑا' دیوار سے لگایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر انگلی اٹھائے' چبا چبا کر غصے سے بولا۔

"آئندہ میرے مخاطب کیے بغیر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو تمہیں یہیں پہ گاڑ دوں گا۔ سمجھ آئی؟"

ہکا بکا سے لڑکے کی گردن جھٹکے سے چھوڑی' اپنے کوٹ کی نادیدہ شکن درست کی اور اسے گھورتا ہوا واپس مڑ گیا۔ منع کیا تھا اس نے اپنے باپ کو یہ سیاست

اور اس کے جھمیلوں میں پڑنے اور پھر اس جیسے تازہ گریجویٹ ہوئے خود کو بہت ماہر اینالسٹ سمجھنے والے لڑکوں کو بھاری تنخواہوں پہ رکھنے سے "مگر نہیں اس کی کون سنتا تھا اودھر۔ یا شاید اسے غصہ بہت آرہا تھا آج کل۔

وہ کہیں بھی نہیں گیا۔ گاڑی میں بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا اور پھر رکا تو سامنے ایک فلورل مارکیٹ تھی۔ ہاشم اترا' ایک خوب صورت سا بڑا سا گلدستہ خریدا' اسے فرنٹ سیٹ پہ رکھا اور جب دوبارہ ڈرائیو کرنے لگا تو آنکھوں میں شدید کرب تھا۔

اب کے وہ اترا تو سامنے قبرستان تھا۔ وہ پھول ہاتھ میں پکڑے' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا قبروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ زرتاشہ غازی' وارث غازی۔ یہ قبریں قریب قریب تھیں۔ کہیں آس پاس زمر کی والدہ کی قبر بھی تھی۔ اور سعدی کے والد کی بھی۔ مگر وہ صرف زرتاشہ کی قبر کے سامنے آکھڑا ہوا۔ جھک کر بہت ادب سے گلدستہ اس کے اوپر رکھا پھر سیدھا ہوا' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے۔ جوتے سے مٹی پہ پڑا کوئی کنکر مسلتے ہوئے وہ کتنی دیر کھڑا لب کاٹتا رہا۔

"آئی ایم سو سوری زرتاشہ' تم بہت پیاری' بہت معصوم سی تھیں' میں واقعی ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میری مجبوری تھی۔ بہت سے لوگوں کی خوشیوں کے لیے کسی ایک کو قربانی تو دینا پڑتی ہے۔" ہولے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے اداس نظروں سے قبر کے کتبہ کو پڑھا۔

"مگر شاید تمہارے لیے یہی بہتر تھا۔ تم فارس کے ساتھ خوش نہیں تھیں' تمہیں ایک جنت میں رہنے کی آرزو تھی۔ امید ہے اب وہ پوری ہو گئی ہو گی۔ زیادہ امید ہے کہ فارس بھی جلد تمہیں جوائن کرلے گا۔ تم دونوں ہم سے زیادہ خوش رہو گے۔ تمہارے لیے اچھا ہی ہوا۔" سر اثبات میں ہلاتے اسے جیسے تسلی ہوئی۔

پھر بھی وہ کافی دیر وہاں کھڑا رہا۔ بارش کے بعد کی گیلی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور قبروں کا سناٹا' آس پاس خاموشی سے تیرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

ہم سے ہمارے حال کی تفصیل پوچھیے
ہمدردیوں کے نام پر سازش بہت ہوئی

ماحول میں عجیب سناٹا تھا' سعدی مضطرب اور بے بس سا کھڑا سلاخوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ جہاں فارس نفی میں سر ہلاتا دائیں سے بائیں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ شدید غصہ تھا' جیسے بس نہ چلتا ہو وہ کسی کا گلا دبا دے۔ پھر ایک دم وہ سامنے آیا۔ دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو پکڑ کر اسی طیش سے سعدی کو دیکھا۔

"میں نے نہ کوئی کال کی تھی نہ میں اس دوہرے قتل میں ملوث ہوں۔ اگر تمہاری پھپھو یہ بات بار بار کر رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے وہ جانتی ہیں یہ سب کس نے کیا۔ اور وہ کسی کو کور کر رہی ہیں۔"

گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کے چہرے پہ چھائی ندامت میں حزن بھر گیا۔

"پھپھو جھوٹ نہیں بولتیں' انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"کس قسم کی غلط فہمی؟ وہ کہہ رہی ہیں کہ میں نے قتل کیے ہیں اور تم کہہ رہے ہو غلط فہمی؟" اس نے غصے سے سلاخ کو جھٹکا دیا مگر وہ سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ یہ جھٹکے ان کو توڑنے کے لیے ناکافی تھے۔

فارس بے بسی سے سلاخوں سے پشت لگائے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سعدی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہی اصل مجرم ہے کیونکہ وہ اس کے سامنے مسلسل زمر کی طرف داری کر رہا تھا۔

"کیا پتا کسی نے پھپھو کو مجبور کیا ہو؟ ڈرایا ہو' دھمکایا ہو؟ اتنا خوف زدہ کر دیا ہو کہ وہ یہ سب کہنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔" فارس نے اس کی طرف پشت کیے استہزائیہ سر جھٹکا۔

"میں نہیں مانتا۔ کس قسم کی خاتون ہیں وہ' جانتا

ہوں میں۔ انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کو دور کر رہی ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں۔ ہم اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔ پھپھو اپنا بیان واپس لے لیں گی۔ میں اور ہاشم بھائی آپ کو۔۔۔"

فارس پھر کر اس کی طرف مڑا۔ "بھاڑ میں گیا ہاشم۔ مجھے اس کی کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔ نہ اس کے کیے گئے وکیل پر' نہ اس کے کسی وعدے پر۔ وہ تو سب سے زیادہ خوش ہوگا مجھے یہاں دیکھ کر۔" سعدی کی آنکھوں میں گہرا دکھ ابھرا۔

"آپ ان کے بارے میں ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ سب کزنز کے درمیان رقابتیں' جھگڑے چلتے ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آپ کو یہاں دیکھ کر خوش ہوں۔ وہی آپ کے لیے سب سے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں ہاشم کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ وہ جان بوجھ کر یہاں آتا ہے' تاکہ مجھے یہاں دیکھ کر فاتحانہ مسکرا سکے۔ اگر آج کوئی اٹھ کر یہ کہہ دے کہ میری بیوی اور بھائی کا قتل بھی ہاشم نے کیا تھا تو میں مان لوں گا۔"

غصے میں وہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ سعدی بے یقینی اور دکھ سے پیچھے ہٹا۔ اسے اتنا گہرا صدمہ ہوا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ مگر کہنے کی نوبت آئی بھی نہیں۔ کیونکہ چند منٹ کے لیے ان کو چھوڑ کر باہر گیا ہاشم واپس آگیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" آواز پہ ان سے کھڑے سعدی نے چونک کر سر موڑا اور غصے سے تیز تیز بولتے فارس نے رک کر ادھر دیکھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سرمئی سوٹ میں ملبوس ہاشم کے چہرے پہ سنجیدگی تھی اور گہرا ملال بھی۔

"بالکل ٹھیک۔ میں ہی گدھا الو کا پٹھا ہوں جو اپنے ہزار کام چھوڑ کر تمہارے لیے دن رات ایک کر رہا ہوں۔ میری ماں کبھی ڈی اے کے پاس جاتی ہے اور کبھی اس کے منگیتر کے پاس کہ کسی طرح اس کا یہ رشتہ ختم ہو جائے۔ تاکہ وہ اپنی زندگی میں پرسکون ہو کے اپنی محرومیوں کا بدلہ تم سے نہ لے۔ اپنی بیوی' اپنی بچی ان کو کتنے دن سے نظرانداز کر کے میں ادھر تمہارے لیے خوار ہو رہا ہوں اور تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں یہاں مزا لینے آتا ہوں۔" جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم قدم چلتا وہ سلاخوں کے قریب آیا۔ فارس ابھی تک اسی سنجیدہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے پریشانی سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ بہت ہرٹ لگ رہا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی بات پہ اعتبار نہیں ہے۔ سب یاد ہے مجھے' کس طرح میری بیوی کو میرے خلاف بھڑکاتے تھے۔" فارس جواباً غرایا۔

"جیسا کہ میں نے کہا' میں ہی بے وقوف تھا جو اتنے دن سے تمہارے لیے کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ میرا باپ' جس کا رشتہ مجھ سے زیادہ تم سے ہے۔ تم پہ لعنت بھیج کر اپنی کمپنی میں مصروف ہے' اس لیے یو نو واٹ فارس! تمہاری یہ بلیم گیم دیکھ کر اب مجھے بھی یقین ہونے لگا ہے کہ تم ہی اس دوہرے قتل کے پیچھے ہو۔ میری طرف سے تم سڑو اس جیل میں' میں جا رہا ہوں۔" دکھ اور برہمی بھری آنکھوں سے اس کو دیکھتا وہ پلٹا اور تیز تیز باہر نکل گیا۔ سعدی تیزی سے سلاخوں کے قریب آیا۔

"آپ کیوں اپنے غصے میں بے قابو ہو جاتے ہیں؟ وہ ہاشم بھائی ہیں۔ آپ کو پتا ہے وہ کتنے دن سے یہاں پہ خوار ہو رہے ہیں میرے ساتھ۔ آپ کے وکیل کی فیس' تمام اخراجات' پولیس آفیسر سے سفارشیں ہر چیز وہی کر رہے ہیں۔ اور آپ پھر بھی ان ہی کو الزام دے رہے ہیں۔ ماموں کو!" وہ بے حد بے یقین تھا اور جیسے ہاشم سے زیادہ ہرٹ ہوا تھا۔ فارس نے غصے سے سر جھٹکا۔

"میں کسی کو الزام نہیں دے رہا۔ میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کسی پہ اعتبار نہیں ہے۔"

"آپ نے کہا کہ وہ اس قتل میں ملوث ہیں' آپ نے ان پہ لگتا ہوا الزام لگا دیا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا' ظاہر ہے وہ اس میں ملوث نہیں ہے۔ اس کا میرے بھائی یا بیوی سے کیا لینا

دیتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے۔ وہ ہاشم کاردار ہے۔ اگر وہ چاہتا تو میں دو منٹ میں باہر ہوتا۔ میں باہر اس لیے نہیں ہوں کیونکہ اس نے چاہا ہی نہیں۔" سعدی نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے اردگرد کے اتنے صحیح لوگ اتنی غلط باتوں پہ کیوں اڑ چکے ہیں؟" اور گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھتا ہاشم کے پیچھے باہر کو لپکا۔ وہ پولیس اسٹیشن کے باہر اپنی کار کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ راق کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی سوچ تھی۔ اذیت بھی تھی۔ لب بھینچے ہوئے تھے' سعدی کو بے پناہ شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ جلدی سے اس کے قریب آیا۔

"میں آپ سے معذرت کرتا ہوں ماموں کی طرف سے۔ وہ غصے میں کہہ گئے وہ سب۔ لیکن آف کورس ان کا یہ مطلب نہیں تھا۔"

ہاشم نے ان ہی نظروں سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو قتل کیسے کر سکتا ہے' اسی لیے میں نے سوچا کہ فارس نے یہ نہیں کیا ہوگا۔ بالکل ایسے ہی میں یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کوئی آدمی اپنے بھائیوں جیسے کزن پہ یہ الزام کیسے لگا سکتا ہے۔ مگر دیکھو۔ کیا تمہیں بھی لگتا ہے کہ میں فارس کے ساتھ مخلص نہیں ہوں؟"

سعدی نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

"آف کورس نہیں' انہوں نے خود بھی کہا کہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ غصے میں کہہ گئے۔ پلیز آپ دل پہ مت لیں۔" پھر فکرمندی سے متذبذب سا بولا۔

"ہمیں آج لائر کے پاس بھی جانا تھا' ہاشم بھائی! آپ وہاں جا رہے ہیں نا؟" اس کے دل کو دھڑکا لگ گیا تھا' ہاشم کے چہرے پہ زخمی مسکراہٹ ابھری۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ فارس کی باتوں کی وجہ سے میں اس کے لیے بہترین وکیل نہیں کروں گا یا وکیل کو فیس دینا یا اس کی سفارشیں کرنا بند کردوں گا تو تم ہاشم کاردار کو نہیں جانتے۔ آف کورس! ہم ابھی وکیل کے پاس جائیں گے۔ ہم بہترین اسٹریٹجی اپنائیں گے اور چند دن میں فارس باہر ہوگا۔ ڈونٹ وری۔" تکان سے کہتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا۔

"آپ خود بھی تو یہ کیس لڑ سکتے ہیں!"

"فارس اور میرا ایک رشتہ بھی ہے۔ جو اتنا اچھا نہیں ہے۔ میں پیسے بچانے کو اس کے لیے شہر کا بہترین وکیل نہ کروں' تو یہ میرے نزدیک غلط ہے۔ میرے ساتھ وہ کبھی بھی آرام دہ ہو کر بات نہیں کرے گا۔ اپنے وکیل سے کرے گا۔ میں لوگوں کے لیے بغیر کسی صلے کی امید کیے فیور کرتا ہوں' دکھ صرف اس بات کا ہے کہ جس کزن کے لیے میں اپنی بیوی کو بھی ٹائم نہیں دے پا رہا' جس کی وجہ سے وہ مجھ سے لڑ بھی پڑی۔ اس کزن نے مجھے یوں کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔" سر جھٹکتے ہوئے چابی نکالتا وہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ سعدی نے ایک دم چونک کے اسے دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے اسپتال کا منظر گھوما' بازو سے آستین اوپر کر کے اپنے زخم دکھاتی شہرین' اس کی آنکھوں کا کرب اور اس کا راز کھل جانے کے بعد کی بہادری۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ ان کی واقعی لڑائی ہوئی تھی۔ مگر فارس کی وجہ سے نہیں' شہرین کی بے وفائی کی وجہ سے تو پھر۔ وہ ایک دم ہاشم کو دیکھنے لگا۔ وہ بالکل مختلف بات کر رہا تھا۔

"چلو!" ہاشم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خیال کی دھند ہٹی' تو ہاشم کے چہرے کا ملال نظر آیا۔ وہ ابھی تک فارس کی باتوں پہ افسردہ تھا۔ سعدی ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹک کر گھوم کر فرنٹ سیٹ کی طرف آیا۔ وہ بھی پتا نہیں کیا سوچنے لگا تھا۔



وہ کانٹا ہے جو چبھ کر ٹوٹ جائے
محبت کی بس اتنی داستاں ہے

حنین بوبے ابا کی وہیل چیئر گھسیٹتی اسپتال کی راہداری میں آگے لا رہی تھی۔ وہ افسردہ سے گردن ایک جانب جھکائے بیٹھے تھے۔ زمر کو سمجھایا' منت کی'

مان جتایا' اور وہ ہمیشہ کی طرح ہٹ دھرم' اپنی بات پر اڑ چکی تھی۔ چونکہ اس نے کہہ دیا کہ وہ فارس تھا' تو اب قیامت تک وہ فارس ہی تھا جس نے اسے کال کی تھی۔ وہ ایک انچ بھی اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ چونکہ میڈم رمشہ اس سے ملنے آئی تھیں' اس لیے انہوں نے حنین سے کہا کہ وہ انہیں باہر لے جائے۔ اور اب وہ دونوں باہر جا رہے تھے۔ حنین بھی خاموش تھی اور بڑے ابا بھی۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"بڑے ابا! کیا کبھی چیزیں ٹھیک ہوں گی؟"

انہوں نے گردن اٹھائے بغیر کہا۔ "شاید۔" وہ وہیل چیئر دھکیلتی آگے نکل گئی۔

راہداری میں بینچ پہ سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھے سعدی نے پیروں کی آواز سنی مگر چہرہ نہیں اٹھایا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ اپ سیٹ تھا۔ ندرت اس کو پُر امید نظروں سے دیکھتی تھیں کہ وہی پھپھو کو سمجھائے۔ فارس کا رویہ' ہاشم کی تمام کوششیں' کچھ بھی ان کے حق میں جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ زمر کے اپنے بیان پہ ڈٹے رہنے کے بعد ندرت اسپتال نہیں آئی تھیں۔ بہانہ سارہ کا تھا۔ بھائی مرا ہے' بھابھی اکیلی ہے' اس کی بچیاں' ان کا خیال۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فارس کی وجہ سے پھپھو سے کھنچ سی گئی ہیں۔ مگر اپنی جگہ وہ بھی ٹھیک تھیں۔ شاید اپنی جگہ زمر بھی ٹھیک تھی۔ مگر ٹھیک تو وہ بھی تھا۔ صرف حالات غلط تھے۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا' یہاں تک کہ میڈم رمشہ باہر نکلیں۔ اس کے قریب آ کے رکیں' کسی احساس کے تحت سعدی نے سر اٹھایا۔ پھر تے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم میم!" ادب سے سر کو خم دے کر سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بہت افسوس ہوا زمر کا۔ اللہ اس کو صحت دے۔" سعدی نے افسردگی سے ہاں میں گردن ہلائی۔

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ کتنے سال رہ گئے ہیں؟"

"بس دو۔"

"اور کتنے دنوں کی چھٹی پہ آئے ہو؟" وہ ساتھ ہی بنچ پہ بیٹھ گئیں' سعدی دوسرے کنارے پہ ٹک گیا۔ اس بنچ کی تین ہی نشستیں تھیں' اب درمیان کی خالی تھی۔

"بس دو ہفتے رہ گئے ہیں' پھر واپس جانا ہے۔"

"آپ کے ماموں کا بھی ابھی سنا' بہت افسوس ہوا بیٹا!" وہ شائستگی اور لحاظ سے تعزیت کر رہی تھیں۔ سعدی سنتا گیا' چند ایک تفصیلات بتائیں' کس طرح ہوا؟ کیا ہوا؟ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی گفتگو کا رخ فارس کی طرف مڑ گیا۔

"کیا آپ زمر کو سمجھا نہیں سکتیں کہ وہ ماموں کے خلاف دیا گیا بیان واپس لے لیں۔ وہ آپ کی بہت مانتی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد سعدی نے قدرے امید و لجاجت سے آگے ہو کر کہا۔ میڈم رمشہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہیں' پھر ہلکا سا گلا کھنکار کر ابرو اچکائے۔

"میرا نہیں خیال کہ کسی شخص کو اس کی اٹل رائے سے موڑنا آسان ہوتا ہے۔" سعدی بددل سا ہو کر پیچھے ہو گیا۔ میڈم کی طرف کیا گیا رخ بھی سامنے کو موڑ لیا۔ اب وہ گھٹنوں پہ کہنیاں رکھے' سر ہاتھوں پہ گرائے ان سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ میڈم رمشہ گہری نظروں سے اس کے ہاتھوں میں آدھے چھپے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھتی رہیں۔ پھر خود بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ گود میں رکھا پرس بنچ کی خالی نشست پہ رکھا اور سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

"میرا بڑا بیٹا علی ایروناٹیکل انجینئر ہے۔ ہم تین سال سے ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ بات بھی نہیں کی تھی' نہ وہ ہمارے بچوں کی شادی پر آیا' نہ ہم گئے۔ میری فرسٹ کزن' میری بچپن کی دوست تھی۔ اونکالوجسٹ ہے' اسی شہر میں رہتی ہے۔ ہم نے سات سال سے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی' کوئی فوتگی ہوئی تو چلے گئے۔ زندوں کے لیے نہیں گئے۔ میری سب سے چھوٹی بہن اور میرے دوسرے نمبر کے بھائی کی آپس میں پچھلے ساڑھے پانچ سال سے

ناراضی ہے' دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ میری امی اس ساری صورت حال سے بہت غمزدہ رہتی ہیں۔" وہ سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے ہلکے ہلکے سے کہتی جارہی تھیں۔ سعدی اسی طرح سرہاتھوں میں لیے بے دھیانی سے سنتا گیا' اسے لگا شاید وہ خود سے بول رہی ہیں۔

"مگر مجھے امید ہے کہ میری ماں کے مرنے پہ سارے بہن بھائی آجائیں گے' مل بھی لیں گے۔ کیونکہ ناراض رشتوں کو عموماً" کسی کے مرنے کا انتظار ہوتا ہے۔ مگر کیا تم جانتے ہو کہ یہ ساری لڑائیاں یہ ساری ناراضیاں شروع کیسے ہوئی تھیں؟؟"

سعدی نے ہاتھ گرائے' چہرہ اٹھایا' ذرا موڑ کر آنکھوں میں کراہت بھری پریشانی لیے میڈم کو دیکھا' ہلکا سا نفی میں سرہلایا۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ سامنے دیوار کو دیکھتے کہتی گئیں۔

"یہ سب تب شروع ہوا' جب ہر ایک فریق نے اپنی صحیح یا غلط بات کے لیے دلیلیں پیش کرنا شروع کیں۔ جب دوسرے کی بات بحث کے لیے سنی گئی' معاملے کو حل کرنے کے لیے نہیں۔ تو پھر کوئی نہیں چلاتا' پتھر کوئی نہیں مارتا' باتیں۔ صرف باتیں ہی گھروں میں دراڑیں ڈالتی ہیں۔ ان کو توڑتی ہیں' رشتے کاٹتی ہیں' صرف باتیں۔"

سعدی پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔

"میں سمجھ رہا ہوں' اگر آپ کا اشارہ پھپھو سے کی گئی میری بدتمیزی یا بحث کی طرف ہے تو پلیز مجھے کلیئر کرنے دیں' یہ کسی کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے' میں صرف۔۔۔"

"میری ایک دوست تھی' بہت اچھی' بہت قابل۔ عام سی شکل کی تھی۔ مگر اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی' ایسا رعب تھا کہ آس پاس سب مرعوب ہوجاتے۔"

وہ اس کی بات سنے بغیر سامنے دیکھتے ہوئے گویا خود کلامی کے انداز میں کہتی جارہی تھیں۔ سعدی کو اب بے زاری ہونے لگی۔

"میں اس کے پاس ایک کیس کے سلسلے میں گئی تھی' وہ وکیل تھی نا۔ بہت اچھی' بہت قابل۔ اس نے میرا مسئلہ بھی حل کردیا اور تب سے کسی بھی قانونی مشاورت کے لیے میں اسی کے پاس جاتی ہوں۔ بہت بھاری فیس لیتی ہے' ایک پائی نہیں چھوڑتی' مگر اچھی لڑکی ہے۔ اپنے مئوکلوں کے لیے' کبھی میرے پاس نہیں آئی' سوائے ایک دفعہ کے' جب اس کے بھتیجے کو اسکالرشپ چاہیے تھا۔"

بے دھیانی سے سنتے سعدی نے ایک دم چونک کر گردن موڑی' استعجاب سے آنکھیں سکیڑ کر میڈم کو دیکھا۔ وہ بدستور سامنے دیوار کو دیکھتی کہے جارہی تھیں۔

"اس کے بھتیجے کو اسکالرشپ نہیں مل سکا۔ نہ وہ اتنا لائق تھا' نہ اتنا غریب کہ وہ ہمارے معیار پہ پورا اترتا۔ مگر وہ سمجھی کہ اس کا نام ان دس اسٹوڈنٹس کی لسٹ میں اس لیے نہیں ہے کیونکہ یہ فہرست میں نے کمیشن لے کر تیار کی ہے۔ وہ میرے پاس آئی' ایک لمبی تقریر کی۔ کہ وہ کس کس طرح مجھے برباد کرسکتی ہے' بدنام کرسکتی ہے۔ لو۔ ہر قیمت پر اس بات کو یقینی بناسکتی ہے کہ اس کا بھتیجا وہ اسکالرشپ جیتے۔ میں ہر بات تحمل سے سنتی گئی۔ آخر میں میں نے اسے بتایا' وہی جو سچ تھا کہ یہ اسکالرشپ اس کے بھتیجے کو کبھی نہیں ملے گا۔"

سعدی یوسف بالکل سن' متحیر سا سنتا جارہا تھا۔ اسے اپنے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

"وہ سنتی گئی اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا' ایسے جیسے کسی سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کا بھتیجا کسی سے کم ہوسکتا ہے۔ بہت دیر لگی اس کو اپنی رائے سے ہٹنے میں۔ چاہے وہ غلط تھی مگر وہ کسی کی محبت میں ہی غلط تھی۔ کسی کی محبت میں غلطی کرنا پتا نہیں غلط ہوتا ہے یا نہیں۔ اور پھر زندگی میں پہلی دفعہ میری اس دوست نے مجھ سے ایک فیور مانگا۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ بولنا بھی نہیں چاہیے' لیکن اس کے لیے میں نے بول دیا اسی لڑکے

سے وہ میرے پاس آیا تو میں نے کہا اسے کسی دل کے امیر کوئی نے اسکالرشپ کے لیے اسپانسر کر دیا ہے۔ شاید یہ جھوٹ بھی نہیں تھا مگر اس کی پھپھو مجھے پابند کر چکی تھی کہ میں اسے نہیں بتاؤں گی کہ وہی اس کی فیس دے رہی ہے۔ بس ایک بات پہ مجھے حیرت ہوئی۔"

وہ بولتی جا رہی تھیں اور سعدی سانس روکے ان کو دیکھ رہا تھا۔ ساری دنیا ختم ہو گئی تھی۔ بس باتیں رہ گئی تھیں۔ جو وہ سن رہا تھا اور جو وہ اس دن زمر سے کر آیا تھا۔

"یہی کہ وہ اتنی امیر نہیں ہے، پھر اتنی بھاری فیس کیسے ادا کرے گی؟ میرے اصرار پہ اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک پلاٹ ہے جو اس کے والد نے اس کے نام کر رکھا ہے۔ اس کی شادی اس کے فیوچر کی ساری سیکیورٹی اس پلاٹ کے اوپر ہے۔ اس نے کہا، وہ اس پلاٹ کو بیچ دے گی۔ نجمل سی بات ہے، میں نے اسے منع کیا کہ اگر ایک لڑکا اپنی ذہانت یا محنت کے بل بوتے پر ایک بڑی یونیورسٹی نہیں جا سکتا تو کیا ضروری ہے اس کے پیچھے اپنی آرام دہ زندگی کی سیکیورٹی کو داؤ پہ لگا دو۔ تب اس نے مجھے ایک بات کہی۔ ساری زندگی تو نہیں مگر چند سال تو میں ضرور یاد رکھوں گی۔ اس نے کہا "میرے خاندان کی سیکیورٹی وہ پیسہ نہیں ہے۔ ہماری سیکیورٹی، ہمارے خاندان کا وہ پہلا بچہ ہے، جس کو میں نے انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا تھا۔ اب جب وہ بھاگنے کے قریب آیا ہے تو مجھے اس کے لیے راستہ تو بنانے دیں۔" اور پھر اس نے وہ پلاٹ بیچ دیا۔ اب وہ مسلسل میرے پاس رقم جمع کرواتی ہے۔ میں اس رقم کو ایک اسکالرشپ ڈونیشن فنڈ کے طور پر اس لڑکے کی فیس دے لیے اس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ ذرا سا جھوٹ لو۔ کسی کی زندگی بن گئی، برا سودا نہیں تھا مگر قربانی تھی۔ کیونکہ محبت ایک بہت سادہ مگر ایک بہت پیچیدہ شے ہے۔"

سعدی کا رنگ ایسے سفید ہو رہا تھا، جیسے سانس تک نکل چکی ہو۔ وہ بنا پلک جھپکے بس ان کو دیکھ رہا تھا۔

شاکڈ، حیرت زدہ، متعجب۔

"کیا یہ سچ ہے؟ کیا پھپھو نے۔" اس کے الفاظ حلق میں ہی ٹوٹ گئے۔ میڈم ریشمہ نے چونک کر اسے دیکھا اور حیرت سے پوچھتے ہوئے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"کیا؟ میں نے تو پچھلے پانچ منٹ میں تم سے کوئی بات نہیں کی۔ میں تو سوچ رہی تھی۔ شاید میں اونچا سوچنے لگ گئی ہوں۔ بوڑھے ہونے والے لوگوں کو یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ کسی دائمی مرض کی وجہ سے کسی انسان کو کانفیڈنشیلٹی توڑنے پر مورد الزام ٹھہرانا چاہیے، اور یہ اونچا بولنا ایک دائمی مرض ہی تو ہے۔ ونسوں۔" موبائل پرس میں ڈالتے ہوئے سر نفی میں ہلاتے، جیسے اپنے نفی بن کا افسوس کرتے ہوئے، انہوں نے اس کو مسکرا کر خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئیں۔



میڈم رمشہ کب کی جا چکی تھیں۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کاریڈور میں' آگے بڑھتا گیا۔ سفید چہرہ' خالی ویران آنکھیں لیے' وہ چلتا رہا' یہاں تک کہ ہسپتال کے دروازے آ گئے۔ باہر لان میں روش پہ بڑے ابا کی وہیل چیئر دھکیلتی حنین نے چونک کر اسے یوں ڈھیلا ڈھیلا سا چلتے دیکھا اور پھر رک کر دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ مخالف سمت چلتا دور ہو گیا۔ کوئی موڑ آیا اور وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

حنین کے چہرے پہ بے چینی بھری فکر مندی در آئی۔ وہ وہیل چیئر کو موڑ کر اسی سمت لے گئی۔ ساتھ میں بے دھیانی سے بڑے ابا کو سن بھی رہی تھی۔

"اور تنگ' زیب کاردار کو فارس کے اوپر سے ہاتھ یوں کھینچنا نہیں چاہیے۔ ان کو ایک دفعہ ہم سے بات کرنی چاہیے تھی۔"

"وہ زمر پھپھو کے علاج کا سارا خرچا اٹھا رہے ہیں' یہی بہت ہے۔" وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی وہیل چیئر آگے لا رہی تھی۔

"یعنی وہ فارس کو قصوروار سمجھتے ہیں' تب ہی بدلوا کر رہے ہیں۔" بڑے ابا افسوس سے سر ہلاتے کہہ رہے تھے۔ حنین نے توجہ نہیں دی۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔

یہاں درخت تھے' بیلوں کی باڑ تھی اور کونے میں واٹر کولر لگا تھا۔ سبزے میں ٹھنڈا میٹھا پانی۔ حنین کے قدم رکے نہیں' آہستہ ہو گئے۔ آنکھوں میں شدید صدمہ سا در آیا۔

کولر کے دائیں طرف درخت تھا' درمیان میں تھوڑی سی جگہ تھی' وہاں سکڑ کر' رخ دیوار کی طرف کیے' سعدی' کے خود کو یوں دیکھے جانے پہ شرمندگی کا ڈر وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھتی گئی۔ بڑے ابا گردن گرائے افسردہ سے اپنی کہتے گئے۔ حنین کی عینک کے پیچھے آنکھیں گلابی پڑتی گئیں۔ وہ رو رہا ہے۔ بھائی رو رہا ہے۔ مگر کیوں؟

"کیا پھپھو ٹھیک ہو جائیں گی بڑے ابا؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔ "اماں ان کی بیماری سے بہت اپ سیٹ ہے۔" وہیل چیئر دھکیلتی اب کولر کو پیچھے چھوڑ کر وہ دور جا رہی تھی۔ ساتھ ہی آواز بھی مدھم پڑتی گئی۔

بڑے ابا نے جواب میں کیا کہا' وہ حنین تک آواز نہیں پہنچی۔ وہ دور ہوتے گئے۔

☆ ☆ ☆

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

سعدی اکیلا بیٹھا بدستور رو رہا تھا۔

وہ شام سعدی کے دل کی ساری سوگواریت اپنے اندر سموئے اتری تھی۔ وہ سارہ کے گھر کے کچن میں رکھی کرسی پہ خاموش بیٹھا تھا۔ ندرت منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتیں سامنے کھانا رکھ رہی تھیں۔

"زمر کو خیال کرنا چاہیے تھا۔ جب زرتاشہ کے والد اور وارث کی بیوی فارس کو بے گناہ سمجھتے ہیں تو وہ کیوں ایسا کر رہی ہے؟" سعدی سر جھکائے سنجیدگی سے خالی پلیٹ کو دیکھتا رہا۔ ندرت نے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالا' روٹی نکال کر دی۔

"کھاؤ بیٹا۔" اس نے بے دلی سے روٹی کا لقمہ توڑا۔ پھر نظریں اٹھا کر اماں کو دیکھا۔ وہ پرامید سی' پریشان سی اس کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم پھپھو سے بات کرنا' وہ اپنا بیان واپس لیں۔" پھر تشکیک سے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "تمہیں کیا ہوا' آنکھیں سرخ پڑ رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں۔ فلو ہے۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ کر سر جھکا' پلیٹ پہ جھک گیا۔

"میں جوشاندہ بنا دوں گی' اس کے بعد پی لینا' ٹھیک ہو جائے گا۔"

کاش دل کی بیماریوں کا بھی کوئی تریاق ہوتا۔ گھول کر پی لو اور سب خوش باش ہو جائے۔ اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

"کیا تم نے دوبارہ پھپھو سے بات کی؟"

"نہیں۔"

"کوشش تو کرو۔ فارس میرا بھائی ہے سعدی! مجھے اس کی فکر ہے۔"

"زمر میری پھپھو ہیں اور مجھے ان کی فکر ہے۔"

"اس کا علاج ہو رہا ہے۔ وہ ان شاء اللہ جلد صحت یاب۔"

سعدی نے بددلی سے پلیٹ پرے کر دی۔ "ان کے علاج پہ جو خرچا ہو رہا ہے' وہ اورنگ زیب کاردار اٹھا رہے ہیں' ہے نا؟" ندرت کو تلخی سے دیکھ کر وہ ایک دم پوچھنے لگا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگیں۔

"ہاں' بڑے ابا چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکے۔ کیسے کرتے؟ ان کا سب تو زمر کے جہیز اور زیور پہ خرچ ہو گیا۔"

"اور وہ پلاٹ؟ پھپھو کے پاس تھا نا ایک پلاٹ' وہ کہاں گیا؟ شادی کا خرچا تو بڑے ابا نے مین مارکیٹ میں اپنے نام کی واحد دکان بیچ کر اٹھایا تھا' یہ بھی مجھے پتا نہ چلتا اگر آپ نہ بتاتیں۔"

"ہاں' وہ وسیم بھائی (ندرت کے کزن) کو بیچی تھی۔ اس لیے مجھے پتا چل گیا۔ پلاٹ تو زمر نے پہلے ہی بیچ دیا تھا۔" وہ اب اپنی پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھیں۔

"کسی مقدمے وغیرہ کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی' تو بیچ دیا۔ بڑے ابا نے ایک دفعہ میرے پوچھنے پہ بتایا تھا۔"

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں' پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ندرت نے روکا کہ کھانا تو کھا لے مگر وہ لاؤنج میں آ گیا۔

وہاں بڑے صوفے پر سارہ بیٹھی تھی۔ پیر اوپر کیے' بھورے رنگ کا دوپٹا سر پہ لپیٹے' وہ ہتھیلی پہ چہرہ جمائے' دیوار کو دیکھ رہی تھی یا شاید اس کے پار۔ اسے آتے دیکھ کر چہرہ سیدھا کیا' اداس سا مسکرائی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ مسکرا بھی نہ سکا' بس سامنے کھڑا ہو گیا۔ سر جھکائے' بے قصور مجرم۔

"بہتر ہوں۔ تم ٹھیک ہو؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔

"فارس کیسا ہے؟ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"ان کو وارث ماموں کے قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے' مگر ہم سب جانتے ہیں' یہ سب غلط ہے۔ آپ بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں نا؟" ذرا دیر کو وہ ڈرا ہوا لگا۔

"مجھے نہیں پتا سعدی! تم سب کہتے ہو تو ایسا ہی ہو گا۔ فارس اور قتل۔" اس نے سر جھٹک کر جھرجھری لی۔ سعدی کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ پھیکا سا مسکرایا۔

"ہم اصلی قاتلوں کو ضرور سزا دلوائیں گے خالہ!"

اور سارہ کے چہرے کی اذیت بڑھ گئی۔

"اس سے کیا ہو گا؟ وارث واپس نہیں آئے گا۔"

آج پھر سعدی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ لان میں کیاری کے ساتھ اہل بیٹھی گھاس پہ انگلیاں چلاتی کچھ لکھ رہی تھی۔ نادیدہ الفاظ' ان کہی باتیں۔

سعدی قدم قدم چلتا اس تک آیا۔ جوگرز اہل کے ہاتھوں کے قریب ہوئے تو اس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں مسکراہٹ سے چمکیں۔ "سعدی بھائی!"

"کیا تم بابا کے لیے دعا کرتی ہو؟" ہر دفعہ کی طرح آج پھر پوچھا۔ اہل نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

"روز کرتی ہوں۔"

"گڈ۔" وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔ گیراج کی طرف جاتے ہوئے اس کے دل سے بھی دعا نکلی۔ مغفرت کی' جنت ملنے اور جہنم سے آزادی کی۔ ایک دم وہ رک گیا۔ اہل کو کیا پتا جنت اور جہنم کا؟ معافی اور بخشش کا؟ وہ الٹے قدموں واپس آیا۔ اس کے مقابل پنجوں کے بل بیٹھا' آنکھیں سکیڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم کیا دعا کرتی ہو اہل! بابا کے لیے؟"

وہ جو گھاس پہ پھر سے لکھ رہی تھی' نظریں اٹھا کر سادگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہی کہ بابا واپس آ جائیں۔" رک کر پوچھا۔ "وہ واپس آ جائیں گے نا سعدی بھائی!"

سعدی شل سا اسے دیکھے گیا۔ ہیر بینڈ میں جکڑے بالوں والی اہل امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے

خود کو کہتے سنا۔

"وہ اب کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔ تم دعا کیا کرو کہ وہ جہاں رہیں، خوش رہیں۔" اہل چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر جھو رازداری سے قریب کیا۔

"اگر میں بابا کی قبر کھودوں۔۔۔ تو کیا وہ نیچے۔۔۔ ہوں گے؟" ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، مگر ان کی جو روح تھی، وہ اوپر چلی گئی ہے آسمانوں میں۔ مگر وہ قبر میں بھی ہیں۔" وہ سوچ سوچ کر الفاظ چن رہا تھا۔ اہل کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

"بابا دو ہو گئے ہیں؟" اس نے دو انگلیوں کی وی بنا کر حیرت سے پوچھا۔ سادہ سوال کے پیچیدہ جواب۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دعا کی پھر سے تاکید کی اور گیراج کی جانب بڑھ گیا۔

ایک قتل کتنے خاندان تباہ کرتا ہے، کتنی زندگیاں اجاڑ دیتا ہے۔

ایک قتل سب بدل دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم بھی کن جنگلوں میں بستے ہیں
بند جن میں تمام رستے ہیں

اسپتال میں وہی باسی پھولوں کی مہک رچی بسی تھی۔ زمر تکیوں کے سہارے قدرے ٹیک لگا کر لیٹی تھی۔ بال کیچر میں اوپر بندھے، اور چہرے پہ سنجیدگی چھائی تھی۔ خاموش نظروں سے کبھی سامنے ٹہلتے بڑے ابا کو دیکھتی اور کبھی ساتھ کرسی پہ آگے کو ہو کر بیٹھے ہاشم کو جو ایک فائل کھولے کہہ رہا تھا۔

"یہ صرف ایک رسمی کارروائی ہے۔ آپ کے کڈنی ٹرانسپلانٹ اور اس کے بعد کے بھی تمام میڈیکل بلز اورنگ زیب کاردار اٹھائیں گے اور اگر کل کو فارس غازی بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے تب بھی کوئی اس عمل کو روک نہیں سکتا۔" چیک اور دوسرے کاغذات اوپر نیچے کر کے موٹی موٹی بات سمجھاتے ہوئے اس نے سر اٹھالیا۔ بال جیل سے پیچھے کیے، گرے کوٹ، کف لنکس، ٹائی پن، آنکھوں کی سنجیدگی، وہ ہمیشہ کی طرح اچھی طرح تیار تھا۔

"آف کورس! ان کو میرے میڈیکل بلز پے کرنے چاہییں۔ ان کے بھانجے نے میری زندگی برباد کی ہے!" زمر کا انداز خشک تھا۔ ہاشم نے گہری سانس لے کر سر ہلایا۔

"اور جواب میں آپ اورنگ زیب کاردار کے بارے میں کسی قسم کا منفی بیان نہیں دیں گی۔"

"عدالت میں؟"

"پریس میں!"

بڑے ابا ناپسندیدگی سے گردن موڑ کر ہاشم کو بات کرتے دیکھتے رہے۔

"شیور، مگر۔" زمر نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر تیکھی نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔

"کیا اس کاغذ پہ یہ لکھا ہے کہ یہ مداوا کاردار صاحب اس لیے کر رہے ہیں کیونکہ ان کے بھانجے نے مجھے نقصان پہنچایا ہے؟"

"بالکل!" اس نے اٹھ کر فائل اور پین زمر کے ساتھ رکھا۔ وہ زرد کاغذ اٹھا کر باریک بینی سے ایک ایک شق پڑھنے لگی۔ پھر قلم کھولا۔ دستخط کیے۔ اور واپس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسی سپاٹ، روکھے انداز میں بولی۔

"مجھے کاردار صاحب سے کوئی گلہ نہیں، لیکن اگر آپ نے کبھی یہ معاہدہ توڑا اور میرا کوئی میڈیکل بل پے نہ ہوا تو میں بھی ان تمام شقوں کو ردی میں ڈال دوں گی۔"

"شیور میڈم پراسیکیوٹر!" وہ بہت تحمل سے کاغذ واپس فائل میں لگاتے ہوئے بیٹھا، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھالی۔ بڑے ابا نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

"یہ مداوے سے زیادہ خود کو فارس پہ لگے الزامات کی گرد سے بچانے کا معاہدہ لگ رہا ہے مجھے۔"

"بالکل ویسا ہی ہے۔" کلی رکھائی سے کہتے ہوئے اس نے بریف کیس اٹھایا، کھولا، کاغذ اس میں ڈالے۔

بڑے ابا نے کڑواہٹ سے رخ پھیر لیا۔ ہاشم ان کو ویسے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" بریف کیس بند کر کے وہ اٹھا۔ ایک رسمی مسکراہٹ سے زمر کو دیکھ کر سر کو خم دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی بڑے ابا نے سنجیدگی سے زمر کو دیکھا۔

"ہمیں ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔"

"مجھے تھی۔ آپ کا بینک بیلنس کتنا رہ گیا ہے میں جانتی ہوں۔" وہ زیادہ کڑوی ہو رہی تھی۔

"اگر میں معذور نہ ہوا ہوتا تو میں یہ بدلوا قبول نہ کرتا۔"

"یہ ان کا فرض تھا' ان کے بھانجے نے جو میرے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد اس کے خاندان کو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہیے۔"

"زمر!" وہ جیسے تھک کر بولے۔ "تم ایک دفعہ فارس کی بات سن لو۔"

"اس کی جو آخری بات سنی تھی' وہی کافی ہے میرے لیے' امر موضوع ختم ابا!"

دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ وہ گردن جھکا کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب حنین آئی تو ان کی وہیل چیر باہر لے آئی۔ نکلتے وقت اس نے گردن موڑ کر زمر کو دیکھا' وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز' چہرہ موڑ کر کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ تھی' پیشانی پہ بل تھے۔ ایک دفعہ بھی حنین کو نہیں دیکھا۔ وہ یاسیت سے سر جھٹکتی بڑے ابا کو باہر لے آئی۔

☆ ☆ ☆

رخت جاں کوئی لٹانے ادھر آ بھی نہ سکے
اے مشکل تو نہیں وشت وفا کے جلوے

ویٹنگ روم میں سعدی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ سر جھکائے' اپنے ہاتھوں کو باہم مسلتا۔ بڑے ابا کو آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہوا۔ اور سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں نے ٹیسٹ کروائے تھے۔ ابھی رپورٹس آجائیں گی۔"

"کس چیز کا ٹیسٹ۔؟" حنین چونکی' بڑے ابا نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

"کڈنی ڈونر نہیں ملا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے' قریبی رشتہ داروں کا گردہ زیادہ بہتر رہے گا۔"

"بھائی!" حنین کا سانس اٹک گیا۔

"سعدی!" بڑے ابا متحیر رہ گئے پھر وحشت سے آگے ہوئے۔

"تم نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"ڈاکٹر نے کہا ہے' میں ڈونیٹ کر سکتا ہوں۔ میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔"

وہ آنکھیں سکیڑ کر تیکھی نظروں سے دادا کو دیکھ کر چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا تم کسی بات پہ خفا ہو؟"

"اس کو چھوڑیں۔ مجھے صرف ایک گارنٹی دیں۔ اگر میرا گردہ میچ کر گیا تو آپ زمر کو نہیں بتائیں گے کہ یہ میں دے رہا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ زمر کبھی تم سے گردہ نہیں لے گی۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔" وہ تڑپ گئے تھے۔ حنین وہیل چیر تھامے ہنوز شاکڈ سی کھڑی تھی۔

"حنین! کیا تم باہر جا کر سسٹر حمیرا سے پوچھ سکتی ہو کہ رپورٹس آئیں یا نہیں؟" وہ سر اٹھا کر سپاٹ انداز میں کہنے لگا۔ حنین نے شل ذہن کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔ سعدی نے دوبارہ ان ہی نظروں سے بڑے ابا کو دیکھا۔

"اس وقت ان کو کڈنی چاہیے' میں دے رہا ہوں' مگر آپ ان کو نہیں بتائیں گے۔" اور ابا کو غصہ چڑھنے لگا۔

"میں تمہیں اول تو ایسا کرنے ہی نہیں دوں گا اور اگر تم نے ضد کی تو میں زمر کو یہ بات بتا دوں گا' پھر وہ ساری زندگی ڈائیلسز کروا رہی رہے گی' مگر تم سے گردہ نہیں لے گی۔ کوئی اپنے بچوں سے قربانی مانگتا ہے کیا؟

سعدی نے لب بھینچے اثبات میں گردن ہلائی، پیچھے ہو کر بیٹھا۔ "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میری فیس وہی دیتی ہیں۔"

بڑے ابا کو جھٹکا لگا، بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

"کیوں؟ کیا وہ نہیں دیتیں؟ کر دیں انکار۔"

وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔ صدمہ سا صدمہ تھا۔ اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

"دیتی ہیں نا؟" ایک آس پھر سے جوڑی۔ قدرے گیلی آواز میں، ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ بڑے ابا نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی۔ سر سمجھنے والے انداز میں ہلایا۔ نمی اندر اتاری۔

"تھینک یو بڑے ابا! اب اگر آپ نے زمر کو کچھ بتایا تو میں بھی انہیں بتا دوں گا کہ یہ فیس والی بات آپ نے مجھے بتائی ہے۔"

وہ حق دق رہ گئے۔ "میں نے کب...؟"

"ابھی تو بتایا ہے نا۔" خود کو سنبھال کر، اطمینان بھری بے نیازی سے کہہ کر وہ پیچھے کو ہو گیا۔ وہ بالکل ہکا بکا اسے دیکھ رہے تھے۔ آج لگا، سعدی بڑا ہو گیا ہے۔ یعنی وہ سری بلیک میلر اولاد؟ ایک زمر کم تھی کیا؟ حنین واپس اندر آئی، نفی میں سر ہلایا۔ کچھ کہنے سے فی الحال معذور تھی۔

"مجھے پتا ہے میرا کڈنی میچ کر جائے گا۔ مگر آپ دونوں میں سے کوئی زمر کو نہیں بتائے گا۔" وہ قطعیت سے باری باری ان کا چہرہ دیکھتا تنبیہہ کر رہا تھا۔

"اور امی؟" بالآخر وہ بولی۔

"ان کو میں سمجھا دوں گا، بے فکر رہو۔"

"مگر زمر کو کیا کہیں گے، کس کا گردہ ہے یہ؟" بڑے ابا کا لہجہ اب کمزور تھا۔

"وہ کون سا دیکھ رہی ہیں؟ کسی سے ملوا دیں گے انہیں، کہیں گے کہ یہ اس کا گردہ ہے۔"

"یہ بات ہمیشہ نہیں چھپے گی سعدی! اسے بتانا پڑے گا۔ تم خود بتا دو۔ وہ تو اب تک تم سے خفا ہے۔"

"اگر مان گئیں تو، پوچھیں گی نہیں کہ میں کدھر ہوں؟ ملنے کیوں نہیں آتا؟ بس انہیں کہیے گا میں واپس چلا گیا ہوں۔" وہ سب طے کر چکا تھا۔ دو دن سے یہی سوچ رہا تھا۔ بڑے ابا کو افسوس سا ہونے لگا۔

"ایسے وہ دل صاف نہیں کرے گی، میں اسے جانتا ہوں۔"

"میں بھی جانتا ہوں انہیں، وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔" مگر وہ غلط تھا۔

"اسے بتا دو سعدی! آپریشن کے بعد بتا دینا بے شک۔" وہ اب نیم رضامند لگ رہے تھے۔

"یہ میرا ٹیسٹ ہے۔ میں تیمارداری کر کے نمبر بنالوں یا پڑھائی کے بہانے نظروں سے غائب ہو کر اپنا قرض ادا کر لوں اور اگر برا بنتا ہوں تو بن جاؤں، مگر مجھے اس ٹیسٹ میں فیل نہیں ہونا!"

"تم اس سے بات تو کر کے دیکھو!"

"نہیں نا! اگر پھپھو کو پتا چلا کہ یہ میرا گردہ ہے تو وہ کبھی نہیں لیں گی۔ پھپھو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میں ان کا بھائی بھی ہوں، دوست بھی اور بیٹا بھی۔ وہ مجھے کبھی اس تکلیف سے نہیں گزارنا چاہیں گی۔"

"تو ہم پھپھو کو کیا کہیں گے؟" سوئی سوئی سی حنین جیسے جاگی۔ سارا کام کرنے لگا۔

"کسی سے ملوا دیں گے، کسی کو راضی کر لیں گے اس کام پر۔" یہ سعدی کو مسئلہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے گھڑی دیکھتا۔ اسے رپورٹس کا انتظار تھا۔

"مگر کس سے؟"

سعدی نے اکتا کر حنین کو دیکھا۔ "یہ بعد کی بات ہے۔" تبھی دروازہ ہلکا سا بجا۔

حنین چونک کر مڑی، چوکھٹ میں علیشا کھڑی تھی۔ مسکراتی ہوئی، سفید ٹراؤزر اور بھوری شرٹ میں۔ کہنی پہ بیگ ٹنگا تھا۔

"میں تمہاری آنٹی کو دیکھنے آئی تھی۔" وہ نرمی سے کہتی آگے آئی۔

حسین نے سعدی کو دیکھا‘ سعدی نے حسین کو۔ پھر دونوں نے علیشا کو دیکھا۔

"بھائی! کیا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو میں سوچ رہی ہوں؟"

"کیا یہ مان جائے گی تھوڑی سی اداکاری پہ؟" دونوں نے دبی دبی آواز میں فقروں کا تبادلہ کیا۔ علیشا نے باری باری ان کے چہرے دیکھے۔

"کیا سب ٹھیک ہے؟"

"آف کورس!" حسین کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا‘ جلدی سے ایک کرسی سے چیزیں ہٹائیں‘ اسے جگہ بنا کر دی‘ سعدی اٹھ کر چوکھٹ پہ جا کھڑا ہوا۔ نگاہیں راہداری میں لگے کلاک پہ ٹکی تھیں‘ بڑے ابا اپنی سوچوں میں الجھے تھے۔

علیشا نزاکت سے بیٹھی‘ گھٹنے ملا کر‘ پرس زمین پہ رکھا۔ حسین ساتھ والی کرسی پہ آگے ہو کر بے چین سی بیٹھی۔

"مجھے تم سے ایک کام ہے علیشا! کچھ دیر میں بتاتی ہوں۔" وہ بھی سعدی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ رہی تھی۔

"او کے!" علیشا نے شانے اچکا دیے۔

"اگر کنڈلی میچ نہ کیا تو؟" بڑے ابا نے اپنی ہی سوچ میں سوال کیا۔

"تو پھر کسی اور کو دینا پڑے گا۔"

"مگر کس کو؟" وہ حسین سے سوال کر کے خود ہی خاموش ہو گئے۔ حسین نے نظریں جھکا کر خود کو دیکھا‘ پھر اپنے بازو کو۔ آستین ذرا تنگ تھا۔ اس نے دو انگلیاں بیچ بٹن پہ رکھ لیں‘ جیسے اسے کھول کر آستین اوپر چڑھانے پر تیار ہو۔ انگوٹھے سے بازو کے اوپر لکیر کھینچی۔ کون سی رگ ہے بھلا جس سے ٹیسٹ کے لیے خون نکالا جاتا ہے۔

"تم نے بتایا نہیں میرا گفٹ کیسا لگا؟" علیشا موبائل پہ بٹن دباتی پوچھ رہی تھی۔ حسین نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا‘ پھر پھیکا سا مسکرائی۔

"وہ لاکٹ‘ اس پہ بھی تمہارے کی چین والی عبارت درج تھی۔" وارث کے قتل کی رات جب وہ اور فارس علیشا کے کمرے سے نکلے تھے‘ تب اس نے حسین کو جو دیا تھا اس میں سے سیاہ ہیرے کی شکل کا کٹا پتھر جڑا لاکٹ نکلا تھا۔ اس نے بہت دن بعد کھولا۔

"مجھے وہ بہت اچھا لگا۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"ہمیشہ کے لیے چوٹیاں" (Aunts for evtr)

وہ انگلی ابھی تک بازو کی رگ پہ رکھے بیٹھی تھی۔

علیشا نے آہستہ سے موبائل رکھا‘ اسے دیکھ کر تھکن سے مسکرائی۔ "تم نے مجھ سے کوئی کام کہنا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ وہ کیا۔۔۔ تم میری آنٹی کو یہ کہہ سکتی ہو کہ تم ان کو اپنی مرضی اور خوشی سے کڈنی ڈونیٹ کر رہی ہو؟ دراصل جو رشتے دار ڈونیٹ کر رہا ہے‘ وہ اس سے لینا نہیں چاہیں گی اور۔۔۔" وہ جلدی جلدی ساری بات سمجھا گئی۔

"مگر میں تو رات کی فلائٹ سے واپس جا رہی ہوں۔"

"او۔۔۔ کیا تم رک نہیں سکتیں؟ کیا تمہارا کام ہو گیا جس کے لیے تم آئی تھیں؟"

"نہیں۔۔۔ وہ تو نہیں ہوا۔ میں بھی کس امید پہ چلی آئی۔" تلخی سے مسکرا کر خود پہ افسوس کیا۔ حسین بے چینی سے آگے ہوئی۔

"تم بس پانچ منٹ کے لیے آنٹی سے مل لو۔ بعد میں ہم کہہ دیں گے کہ تمہیں دوسرے ہسپتال شفٹ کر دیا گیا ہے۔"

"او کے!" وہ متامل تھی مگر شانے اچکا دیے۔ حسین پھر سے مضطرب سی دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

"ٹرانسپلانٹ پہ تو کافی خرچا آ رہا ہو گا۔" علیشا نے جزئیات پوچھا۔

"پتا نہیں وہ سب اورنگ زیب انکل کا سردرد ہے۔"

علیشا کا سانس رک گیا۔ بنا پلک جھپکے وہ حسین کو دیکھنے لگی۔

”تمہارے وہی انکل جن کا تم بہت ذکر کرتی ہو۔“
”ہاں۔ پتا نہیں ہماری اکثر باتوں میں ان کا ذکر کیوں نکل آتا ہے؟“ یہ سوال سوچنے کا وقت ذہین حنین کے دماغ کو کبھی نہیں ملا تھا۔ اب بھی کہہ کر بھول گئی۔
”وہی علاج کا خرچا اٹھا رہے ہیں۔“
”مگر۔ کیوں؟“ حیرت زدہ سی وہ بمشکل پوچھ پائی۔ حنین نے شانے اچکائے۔ ابھی تک چوکھٹ کو دیکھ رہی تھی۔
”وہ فارس ماموں کے باپ کی جگہ ہیں اور پھپھو مسلسل فارس ماموں کو اس سب کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں تو اورنگ زیب انکل اپنے بھانجے کی طرف سے مداوا کرنا چاہ رہے ہیں۔“
علیشا سے اگلا سانس نہیں لیا گیا۔ اس نے چہرہ سامنے کو پھیر لیا۔ تھوک نگلا، آنکھوں میں آئی نمی اندر اتاری۔
”ان سے کسی نے رقم نہیں مانگی، وہ پھر بھی دے رہے ہیں، صرف اس لیے کہ وہ فارس کے باپ کی جگہ ہیں۔ حنین! کتنی رحم دلی ہے، ہے نا!؟“
حنین نے نفی میں سر ہلایا۔ چوکھٹ میں کھڑا سعدی گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ حنین کے ساتھ بیٹھی، سر جھکائے، ال جمن پہ انگلی پھیرتی کہے جا رہی تھی۔
”چیونٹی (Maricopa Harvester Ant) دنیا کا سب سے زہریلا کیڑا ہے۔ اس کیڑے کو انتقام پہ نہیں اکسانا چاہیے، ورنہ اس کے کاٹنے سے طاقتور انسان بھی مر جائے۔ پتا ہے ایک دفعہ کسی نے مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ تم ساری عمر چیونٹی رہو گی۔ مجھے وہ بات پہلے بہت بری لگی، پھر اچھی لگنے لگی، کیونکہ میں چیونٹی ہی تو ہوں۔ سب کمزور اور بے بس لوگ چیونٹیوں کی طرح ہوتے ہیں۔“ حنین بے دھیانی سے سن رہی تھی۔ وہ خاموش ہوئی تو وہ جلدی سے بولی۔
”کیا تم میری آنٹی سے مل لو گی؟ اتنا وقت ہوگا نا تمہارے پاس؟“
علیشا نے سر اٹھایا، مسکرا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔
”شیور۔ میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میں کچھ دن مزید ٹھہر سکتی ہوں، اپنا کام بھی مکمل کر لوں گی۔“
حنین کا چہرہ فرط مسرت سے دمکنے لگا۔ اس نے خوشی سے علیشا کا ہاتھ دبایا۔
”تھینک یو علیشا! تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ کتنا عجیب اتفاق ہے نا کہ عین ان دنوں میں تم آئی ہو، جب ہم اتنے کرائسز میں ہیں، مگر تم ہمارے ساتھ رہیں۔“
علیشا کا رنگ سفید پڑا۔ حلق میں کچھ اٹکا۔ وہ تو اورنگ زیب کار دار کے ایکشن کا سن کر گئی تھی اور وہ خود بھی بے خبر تھی کہ اگر یہ ایکشن نہ ہوتے تو وارث کو شاید مہلت دے دی جاتی مگر یہاں کے ایکشن امریکا سے بہت مختلف تھے۔ اور حنین اس سب کو ایک اتفاق سمجھ رہی تھی۔
”حنین! میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ مگر سعدی کسی کو آتے دیکھ کر فوراً آگے چلا گیا تو حنین امید اور خوف کے ملے جلے تاثر سے کھڑی ہو گئی، بازو کی رگ پہ پھر سے دوسرا ہاتھ رکھ لیا۔
”پھر کبھی سہی!“ علیشا اس کا دھیان نہ پا کر ڈھیلی سی واپس بیٹھ گئی۔ حنین چوکھٹ تک آئی۔ فکرمندی سے سامنے دیکھا۔ سعدی چند کاغذ کھول کر پڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بازو پہ رکھا اس کا ہاتھ مضبوط ہو گیا۔ لیچ بٹن کھول لیا۔ اب بس آستین موڑنا تھا۔ پہلے بلڈ ٹیسٹ ہوتا ہے۔ کیا؟ اسے علم بھی نہیں تھا۔
سعدی نے گہری سانس لے کر صفحات نیچے کیے اور لمبی مسافت کی تھکن سے حنہ کا چہرہ دیکھا۔ پھر سر اثبات میں ہلایا۔
”ہاں بیٹو!“
حنین کا بازو پہ رکھا ہاتھ بے دم سا پہلو میں آ گرا۔ اس نے زرد رنگت کے ساتھ سر کو خم دیا۔ سعدی اب پلٹ کر تیزی سے آگے جا رہا تھا۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔
السابقون السابقون۔ اولئک المقربون۔

ہر قربانی کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس وقت کی ایک ایکسپائری ڈیٹ بھی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

کیوں دل، غم بھی نے طلب کی ' برا کیا
ہم سے جہاں میں کشتہ غم اور کیا کیا نہ تھے

اور ہسپتال کے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی علیشا کو مشکوک انداز میں گھورتی' بیڈ تکیوں سے ٹیک لگائے' وہ زمر یوسف تھی اور وہ اتنی جلدی مان جاتی' ناممکن تھا۔

"اور آپ مجھے اپنا گردہ کیوں دینا چاہتی ہیں؟" اس کو ہضم نہیں ہوا تھا اس لیے تفتیش شروع کردی تھی۔

جواب میں علیشا نے کافی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"میں اس واقعے کا ذمہ دار خود کو سمجھتی ہوں۔ اگر میں آپ کے آفس آجاتی تو نہ آپ ادھر جاتیں' نہ دہشت گردی کا نشانہ بنتیں۔ میں نے ٹیسٹ کروائے ہیں' گو کہ مجھے کم عمری سے دمے کی شکایت ہے مگر اس کے علاوہ میں بالکل صحت مند ہوں اور ڈونیٹ کر سکتی ہوں۔"

"اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اس وجہ پہ یقین کر لوں؟" زمر نے تیکھی نظروں سے مسلسل اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہ کریں' آپ کی مرضی' مگر میں دوسری وجہ بھی ضرور بتانا چاہوں گی۔" علیشا ذرا رکی۔ سامنے بے چین سی کھڑی حنین اور قریب بیٹھے مضطرب سے بڑے ابا کو دیکھا' پھر اسی اعتماد سے پراسیکیوٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"مجھے اس قربانی کے عوض آپ کی فیملی ایک اچھی قیمت دے رہی ہے۔ جسے میں واپس جا کر یونیورسٹی فیس کے لیے استعمال کروں گی۔ اپنی زندگی بنانے کا اتنا اچھا موقع میں ضائع نہیں کروں گی۔ اگر مزید پیسے چاہیے ہوئے تو میں اس قربانی کو کسی ٹی وی شو میں اپنی کہانی چلوا کر کیش کروالوں گی۔" آخر میں اس نے بے فکری سے شانے اچکائے۔

حنین کے لب کھل گئے' وہ ہکا بکا سی علیشا کو سن رہی تھی۔ کیا اس نے فرض کر لیا تھا کہ اداکاری صرف زمر پہ ختم ہو جاتی ہے؟

"مگر یہ ال لیگل ہے۔" زمر کے فقرے پہ وہ سب چونکے۔ "قانون کے مطابق ڈاکٹر کبھی بھی ٹرانسپلانٹ نہیں کر سکتا اگر گردہ خون کے رشتے دار کا نہ ہو تو۔ آپ سب لوگ مل کر ایک غیر قانونی کام کیسے کر سکتے ہیں؟" ابرو بھینچ کر تادیبی انداز میں اس نے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔

اور بڑے ابا نے کئی دفعہ کی سوچی گئی خواہش دل میں دہرائی۔ کاش انہوں نے کبھی اس لڑکی کو قانون نہ پڑھایا ہوتا۔

"یہ خاتون تو غیر ملکی ہیں مگر آپ کو تو قانون کا علم ہونا چاہیے ابا!"

"ہم نے اس کا حل بھی نکال لیا ہے۔" حنین ہمت کر کے بولی تو زمر گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ "ہم پیپر پہ سعدی بھائی کا نام لکھوائیں گے۔"

زمر کے تاثرات بدلے۔ وہ شل کر رہ گئی تھی۔

"سعدی کا جل؟" وہ ایک دم تڑپ کر متوحش سی بولی' پھر غصے سے ابا کو دیکھا۔ "سعدی کا نام کڈنی ڈونر کے طور پہ۔ کبھی بھی نہیں لکھیں گے آپ لوگ یہ۔"

"ٹھیک ہے' نہیں لکھتے۔ لیکن اگر یہ فرنچ امریکن خاتون نہیں دیں گی" بڑے ابا نے علیشا کی طرف اشارہ کر کے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "تو کسی خون کے رشتے دار کو دینا پڑے گا۔ فہرست بناتے ہیں' پہلے نمبر پہ میں ہوں' میرا میچ نہ کیا تو پھر سعدی ہو گا اور پھر حنین' اگر اس کا بھی نہ لگ سکا تو اسامہ تو ہے نا۔"

"ابا!" اس کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ صدمے سے آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔

"بالکل بھی نہ کہنا زمر! کہ تم تندرست نہیں ہونا چاہتیں۔ ہر کوئی تندرست ہونا چاہتا ہے۔ تم الگ

نہیں ہو۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے تمہارے پاس۔" زمر بالکل چپ ہو گئی۔ بے بسی سے سر جھکائے لب کاٹنے لگی۔ دل بہت برے انداز میں دکھایا تھا حنین کی بات نے۔

"مگر۔ یہ غیر قانونی ہے۔" اس کی آواز اب کے کمزور تھی۔

"ہاں اور جو تمہارے ساتھ ہوا' وہ بھی غیر قانونی تھا۔"

زمر کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ طیش ابھرا۔

"ہوا نہیں' جو میرے ساتھ فارس نے کیا' وہ غیر قانونی تھا!"

"پھپھو! میں ادھر ہی تھی' ماموں نے آپ کو کوئی کال نہیں کی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" اس کے بیڈ کے دائیں طرف کھڑی حنین بے بسی سے بولی۔ زمر نے گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرتے ہوئے سر جھٹکا اور پیچھے ہوئی۔ اب کے بولی تو آواز سنبھلی ہوئی تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم جھوٹ نہیں بول رہیں۔ فارس بہت اسمارٹ ہے' اسے تمہیں ڈاج کرنے کے ہزار طریقے آتے ہیں۔"

حنین کو دھچکا لگا۔ بہت بے یقینی سے پھیلی آنکھوں سے اس نے زمر کو دیکھا' جو اب اپنا لحاف درست کر رہی تھی۔

"یعنی آپ مجھے جھوٹا نہیں سمجھتیں' بلکہ آپ مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں۔" یہ صدمہ زیادہ بڑا تھا۔

زمر ان سنا کرتی لحاف ٹھیک کر کے پیچھے کو ہو گئی۔ حنین کے لب بھینچ گئے۔ بڑے ابا کی معذرتی نظروں کو دیکھے بنا وہ سرد لہجے میں بولی۔

"اوکے پھپھو! ہم سعدی بھائی کا نام لکھوا کر آپ کو ہرٹ نہیں کریں گے۔ ہم حنین یوسف کا نام لکھوا دیں گے۔ اب ٹھیک ہے نا۔" وہ کہہ کر ایک دم مڑی' اور گو کہ اس نے دیکھا بھی کہ زمر بے ساختہ نرم پڑی تھی۔ اسے منع کرنے کو کچھ کہنے والی تھی مگر حنین ان تینوں کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ سعدی کاریڈور میں کھڑا تھا۔ بے ساختہ بڑھا ہوا۔ امید سے اسے دیکھا۔

"کیا انہوں نے یقین کر لیا؟"

"کرلیں گی۔ اپنی صحت کے لیے سب کر لیتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ سعدی کا دماغ کہیں اور الجھا تھا غور کیے بنا زمر کے کمرے کا بند دروازہ دیکھنے لگا۔

وہ سر جھٹک کر آگے چلتی گئی۔ کاریڈور عبور کر کے استقبالیہ سے بھی گزر گئی۔ لان میں مریضوں اور ان کے عزیز و اقارب کی ویسی ہی چہل پہل تھی۔ حنین خفگی سے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی گھاس کے بیچ روش پہ آگے چلتی جا رہی تھی۔ پھر یکایک ٹھہری۔ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر کون اور کدھر؟ وہ مڑی۔ گھوم کر ادھر ادھر دیکھا اور تب ہی دور ایک بینچ پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' ایک بازو بینچ کی پشت پہ پھیلائے بیٹھے ہاشم نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلایا۔ حنین کی آنکھیں اچنبھے سے سکڑیں۔ بہرحال وہ قدم قدم چلتی بینچ کے قریب آئی۔

"سعدی بھائی اندر ہیں۔" اس نے اپنے تئیں ہاشم کو درست سمت دکھائی۔ وہ بس مسکرا کر اسے دیکھے گیا۔

"ابھی مل کر آرہا ہوں اس سے۔ اس نے بتایا کہ ڈونر کڈنی مل گیا ہے' مگر جس شخص سے خریدا ہے' اس کے بارے میں زمر کو بتانے کے بجائے تمہاری کوئی فرینڈ۔" ہاشم نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔ یہ کور اسٹوری صرف ہاشم کے لیے تھی۔ سعدی اس پہ لاکھ اعتماد کرتا' مگر یہ اس کے خاندان کا اندرونی معاملہ تھا۔ اور ہاشم کو بتانے کا مطلب تھا' زمر کو کبھی نہ کبھی وہ بتا دے گا۔ اس کو صرف "حنین کی دوست گردہ دے رہی ہے" کہہ کر بھی نہیں ٹال سکتے تھے کہ علیشا اس اداکاری کے لیے دوبارہ مہیا نہیں ہو گی' ہاشم آتا جاتا رہے گا۔ اگر کھٹک گیا تو کھوج لگائے گا اور پتا چلنے پہ سعدی سے بد ظن ہو جائے گا۔ سو پہلے ہی اسے مطمئن کر دیا۔ وہ ہو بھی گیا۔ اس کی بلا سے گردہ غیر قانونی طور سے ہی خریدا ہو۔ اس کا مسئلہ تو صرف علیشا تھی جس نے اپنی فلائٹ آگے کروالی تھی۔

"میری فرینڈ علیشا۔ اس نے پھپھو کو کنونس کر لیا ہے' مگر آپ یہ بات پھپھو کو مت بتائیے گا۔" وہ سینے پہ بازو لپیٹے اس کے سامنے کھڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا یہ کہنے کی بات ہے؟" ہاشم نے حیرت سے پوچھا پھر گردن پھیر کر ہسپتال کو دیکھنے لگا۔

"علیشا۔۔ ہوں۔۔ کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتی ہو۔ ابھی اسی وقت؟"

"آ۔۔ اوکے!" وہ متذبذب تھی۔

"اور ہاں! تم بھی اس کو نہیں بتاؤ گی کہ تم اسے مجھ سے ملوانے باہر لا رہی ہو۔"

"شیور!" پلکیں سکیڑ کر اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی وہ مڑی اور اندر چلی گئی۔ سعدی اب وہاں نہیں تھا۔ اس نے دروازے سے ہی اندر' زمر سے باتیں کرتی علیشا کو اشارہ کیا۔ وہ معذرت کرتی اٹھ آئی۔

"تو باہر چلتے ہیں۔" حنین نے کہا تو وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ عینک اور فرنچ چوٹی والی' سوچ میں گم حنین اور ساتھ دراز قد' کھلے بالوں والی خوب صورت سی علیشا۔ انہوں نے راہداری عبور کی' تب علیشا نے پرس سے ان ہیلر نکالا' لبوں میں رکھا اور اسپرے اندر کو دبایا۔ حنین رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا وہ سب اداکاری نہیں تھی؟"

"سوائے دمے کے سب فرضی تھا۔" مسکرا کر اس نے کہتے ان ہیلر واپس رکھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے' تمہاری آنٹی نے میرا یقین کر لیا ہو گا؟"

"ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن ہے کیا؟" وہ الجھی الجھی سی سامنے متلاشی نظروں سے لان کو دیکھتی باہر آئی۔ "ہاشم کدھر گیا؟"

"مجھے بہت افسوس ہے جو ان کے ساتھ ہوا۔ کیا حملہ آور ابھی تک نہیں پکڑا گیا؟"

"پکڑا جائے گا۔" وہ اب گردن پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اپنا آپ ایک دم بے وقوف سا لگنے لگا۔ یہ ہاشم اسے بلا کر خود کدھر ہے؟

"ہیلو اگین علیشا!" وہ دونوں ایک ساتھ گھومیں۔

کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے ہاشم مسکراتا ہوا استقبالیہ کی سمت سے چلا آ رہا تھا۔ حنین نے گہری سانس لی۔ اور علیشا کا رنگ۔ نچڑ گیا۔ وہ سفید' ساکت سی سانس روکے کھڑی تھی۔

"علیشا! یہ میرے۔۔" حنین نے تعارف کروانے کو الفاظ تلاشے ہی تھے کہ وہ اسے نظرانداز کر کے گہری سرد نظروں سے علیشا کو دیکھتا' قریب آتے ہوئے بولا۔

"دوبارہ مل کر خوشی ہوئی علیشا!"

علیشا کی خوابیدہ سی ساکت آنکھوں میں حرکت ہوئی۔ وہ جلدی سے حنین کی طرف گھومی۔ "حنہ! کیا تم اکیلے میں میری بات سن سکتی ہو؟"

"کیوں۔ مجھ سے کیا مسئلہ ہے؟ آخر ہم ایک فیملی ہیں علیشا!" وہ سرد مسکراہٹ سے کہتا' حنین کے الجھے الجھے چہرے کے تاثرات بغور نوٹ کر رہا تھا۔

"حنہ' پلیز! میری بات سن لو پہلے۔" وہ بے چینی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے دور لے جانے لگی' مگر حنین اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ بس تعجب سے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

"فیملی؟"

"ہاں حنین! علیشا میرے والد کی غیر قانونی امریکی بیٹی ہے۔ اسی لیے تو وہ تمہیں جانتی ہے اور تمہاری اتنی اچھی دوست ہے۔ ابھی اس دن جب علیشا مجھے اور میرے باپ کو دھمکی دینے ہمارے آفس آئی تھی' تب ہی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے تمہارا اکاؤنٹ ہیک کیا اور۔۔ اوہ سوری۔۔ شاید یہ بات علیشا نے تمہیں نہیں بتائی تھی۔" آخر میں افسوس سے اضافہ کیا۔ وہ جو ابھی تک الجھی الجھی سی کھڑی تھی' لفظ ہیک پہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔ بے یقینی سے علیشا کو دیکھا۔ جانے کب ہاتھ سے ہاتھ چھوٹا۔

"اصل میں علیشا میرے ڈیڈ کے بارے میں کافی حساس ہے۔ چونکہ ڈیڈ اس سے مخاطب تک ہونا پسند نہیں کرتے' تو یہ ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتی ہے' جس سے وہ بات کرتے ہوں جیسے کہ تم حنین!"

"ہاشم' پلیز!" وہ نم ہوتی آنکھوں سے منت کرنے لگی۔ ہاشم کے چہرے کی سختی بڑھی' مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"کیوں۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟ کیا تم ہیکر نہیں ہو؟ کیا تم نے میرے ڈیڈ کا اکاؤنٹ ہیک نہیں کر رکھا تھا؟ کیا تم نے ان کی اور حنین کی میلز پڑھ کر حنین کا اکاؤنٹ بھی ہیک نہیں کیا تھا؟ کیا تم نے حنین کی توجہ لینے کے لیے وہاں گیم نہیں کھیلنی شروع کردی' جو یہ کھیلتی تھی؟"

"ہاشم! بس کردو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ بے اختیار حنہ کو دیکھا' جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اردگرد گزرتے لوگ اس وقت ان تینوں کو نظر نہیں آرہے تھے۔

"حنین! میں نے یہ سب صرف یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ تم کون ہو' ورنہ اس کے بعد ہم واقعی دوست تھے۔ یہ حقیقت ہے مگر میں نے تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تم نے میرے باپ کے لیے میرے خاندان کی بچی کو ٹارگٹ کیا اور پھر بھی تم میں اتنے گٹس ہیں علیشا! کہ یہ کہہ سکو کہ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

مگر وہ صرف حنین کو دیکھ رہی تھی۔ خوفزدہ' نم آنکھوں سے۔

"حنہ! میں تمہیں سب بتانے والی تھی۔ پلیز' وہ سب رئیل تھا۔ وہ گھنٹوں کی باتیں' وہ ڈرامے ڈسکس کرنا' وہ گیمز' وہ سب رئیل تھا۔"

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ تم نے میری فیملی کی اس بچی سے میرے باپ کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا؟"

علیشا بولتے بولتے لاجواب ہوگئی۔ حنین یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ ہاشم کو اب اس کی مسلسل خاموشی سے کوفت ہورہی تھی۔ وہ نامحسوس انداز میں حنین کے ساتھ جاکھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک طرف تھے' اور وہ سب آپس میں مس کرتی' پریشان' بھیگی آنکھوں والی علیشا دوسری طرف۔

"علیشا میرے ڈیڈ کو بلیک میل کرکے ان سے پیسے لینے آئی تھی' اس نے تم سے دوستی بھی ڈیڈ کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ اپنے دماغ پہ زور دو حنین! کتنی ہی دفعہ تم لوگوں نے بات بے بات ان کا ذکر کیا ہوگا' ہے نا؟" وہ کٹیلی نگاہوں سے علیشا کو دیکھتا حنین کو بتا رہا تھا۔

مگر حنین بالکل چپ کھڑی تھی۔

"حنہ' پلیز! میری نیت بری نہیں تھی۔ پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اور حنین کے پتھر لب ہلے۔

"اس گیم کا کیا' علیشا؟"

"کیا؟" علیشا کے بہتے آنسو رک گئے۔

"میں پانچ ماہ تک اس جیولر والی گیم میں پہلے نمبر پہ تھی۔ ٹاپ اسکورر۔ پھر فقط دو دن میں تم پہلے نمبر پہ آگئیں۔ تم نے یہ کیسے کیا علیشا!"

ہاشم نے بمشکل اکتاہٹ پہ قابو پایا۔ وہ کہاں سیاست' اسکینڈلز' بلیک میلنگ کی بات کررہا تھا' اور کہاں ان لڑکیوں کے دماغ سے گیمز نہیں نکلتی تھیں۔

علیشا ندامت بھرے آنسوؤں سے اسے دیکھتی رہی۔

"وہ کچھ پوچھ رہی ہے۔ جواب دو۔"

"میں نے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی' امید اور خوف سے ملی جلی نظریں ہنوز حنہ کے چہرے پہ تھیں۔ "میں نے کچھ چیٹ کوڈز استعمال کیے تھے اور۔"

"اوہ۔ اوہ۔ وہ۔" حنین نے ایک دم غصے سے سر جھٹکا۔ "تو تم چیٹنگ کرکے جیتی تھیں۔ او علیشا! مجھے بھی معلوم تھا کہ بے ایمانی کیسی کرتی ہے' مگر میں نے نہیں کی۔ صرف محنت کی۔ تین سال میں لگی رہی' دوسرے سے پہلے نمبر پہ آسکی مگر چیٹنگ نہیں کی کیونکہ میں حنین یوسف تھی۔ بھائی نے مجھے قرآن کے آخری پارہ اور چند بڑی سورتیں حفظ کرا رکھی تھیں' کیونکہ میں بنی اسرائیل میں سے تھی' آل یوسف۔ انبیا کی اولاد۔ میں نے بے ایمانی نہیں کی

اور تم۔ تم تین سال سے یہی کرتی آئیں۔" درد سے پھٹتے لہجے سے کہتی غصے سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلاتی وہ قدم قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ "تم نے مجھے استعمال کیا۔ ہم اتفاق سے نہیں ملے۔ سب کچھ تم نے پلان کیا۔ فارس ماموں ٹھیک کہتے تھے تمہارے بارے میں۔" وہ پیچھے ہٹتی ریلداری کے قریب ہو رہی تھی۔ علیشا نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ گرم آنسو بہتے رہے۔ اعمال کے نتائج ہوتے ہیں اور بھگتنا پڑتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں علیشا! کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ آج دل چاہ رہا ہے ان سے پوچھنے کا کہ کیا کوئی لڑکی بھی کسی لڑکی کی دوست بن سکتی ہے؟" نفی میں سر ہلاتی وہ مڑی اور تیز تیز اندر چلی گئی۔ مطمئن سے کھڑے ہاشم نے اب کے رخ پھیر کر فرصت سے علیشا کو دیکھا، جو آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔

"آئی ایم ریئلی سوری علیشا! لیکن اگر تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم ہاشم کاردار کو بلیک میل کرسکتی ہو۔ تو تم غلط تھیں۔"

علیشا نے بھیگی آنکھیں کھولیں۔ دکھ سے اسے دیکھا۔

"وہ میری دوست ہے۔"

"تھی۔ اب نہیں رہی۔ آئندہ۔" انگلی اٹھا کر سختی سے تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نے اس سے کوئی بھی رابطہ کیا تو میں اس سے بھی زیادہ کرسکتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

"تم شیطان ہو!" وہ نفرت سے اسے دیکھتی رہی۔ آنسو اب تھم رہے تھے۔ غصہ اس کی جگہ لے رہا تھا۔

"تھینک یو اس کامپلیمنٹ کے لیے۔ اب تم آنسو صاف کرو اور جاؤ۔ باہر نکل کر پہلی کالی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں ہوٹل لے جائے گی، سامان پیک کرو اور ایئرپورٹ جاؤ ورنہ تمہاری آج رات کی فلائٹ کا وقت نکل جائے گا، یہ کچھ رقم اس میں ہے، یہ رکھ لو۔" کوٹ کی اندرونی جیب سے خاکی لفافہ نکال کر بڑھایا۔ علیشا نے تنفر سے اس لفافے کو دیکھا۔

"مجھے یہ خیرات نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی کی فیس نہیں دے سکتے تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔"

"دراصل یہ خیرات نہیں ہے۔ یہ تمہاری ماں کے ہاسپٹل کے بلز جتنی رقم ہے۔ اوہ آئی ایم سوری! شاید آج تمہاری اپنی ماں سے بات نہیں ہوئی۔" وہ ایکدم بہت ہی ہمدردی سے بولا۔ علیشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ موبائل پہ کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"میں نے سنا ہے کہ چند گھنٹے قبل تمہاری ماں کو کسی نیم تاریک سڑک پہ ایک کار نے ٹکر ماری تھی۔ اتفاق سے اس گلی کے سی سی ٹی وی کیمراز خراب تھے، اور موقعے کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے۔ بہرحال جس ہسپتال میں وہ داخل ہے، جہاں ابھی اس کی حالت خطرے سے مکمل طور پہ باہر نہیں ہے، وہاں کام کرنے والے میرے ایک دوست نے یہ مجھے بھیجا تھا۔" ساتھ ہی نرمی سے مسکراتے ہوئے موبائل اسکرین سامنے کی۔ وہ جو دم بخود سی سنتی جارہی تھی۔ تیزی سے آگے ہوئی، اسکرین پہ ہسپتال کے بستر پہ اس کی ماں تھی۔ گردن میں کالر، ایک بازو پلستر میں۔ علیشا نے بے اختیار چیخ روکنے کو منہ پہ ہاتھ رکھا۔

علیشا کے بے بس آنسو بہہ رہے تھے اور اتنی ہی نفرت سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ "میں امریکی شہری ہوں، میں ابھی اپنے سفارت خانے فون کرسکتی ہوں، اور اس سب کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔"

"بالکل، اسی طرح کرو۔ بلکہ یہ کرنے کے لیے میرا فون استعمال کرلو۔" فوراً ہاشم نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ "امریکن قونصلیٹ کی فرسٹ سیکرٹری کا نمبر میرے اسپیڈ ڈائل کے پچیسویں نمبر پہ محفوظ ہے۔ میری بہت اچھی جان پہچان ہے اس سے۔ لو شاید تم بھول گئیں کہ میں، میرا بھائی، میری ماں، ہم سب بھی امریکی شہری ہیں۔ یہاں کرنے ہیں دستخط!" ساتھ ہی بہت سہولت سے کاغذ پہ اشارہ کیا۔ علیشا بے بسی سے اسے دیکھتی رہی، پھر بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے، کاغذ دیوار سے لگایا اور دستخط

کرتی گئی۔
"یاد رکھنا ہاشم! تم بھگتو گے۔ خداوند تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"
کہہ کر وہ آنکھوں میں آنسو لیے پلٹ گئی۔ ہاشم نے قلم بند کیا کاغذ سمیت جیب میں رکھا اور اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لی۔ چلو یہ باب تو ختم ہوا۔

☆ ☆ ☆

یہ کون لوگ ہیں جو روشنی پہ ہیں مامور
دیے بجھائے ہیں کتنے نئے جلائے نہیں

اگلی صبح ہاشم اور جواہرات ہشاش بشاش اور خوش گوار موڈ میں باتیں کرتے ہسپتال کی راہداری میں چلتے ہوئے آرہے تھے۔ حنین نے ویٹنگ روم کے دروازے سے ان کو آتے دیکھا اور پھر واپس اندر ہو گئی۔ ہاشم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا' جب ہی جواہرات سے کہا۔
"آپ ٹھہریں' میں آتا ہوں۔" وہ وہیں کھڑی ہو گئی اور ہاشم متلاشی نظروں سے دیکھتا آگے بڑھتا گیا' یہاں تک کہ ویٹنگ روم کے سامنے آرکا۔ اندر کرسی پہ حنین بیٹھی نظر آرہی تھی۔ گھٹنے ملائے' سرجھکا کر ویران نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی' وہ بالکل شل تھی۔ علیشا پچھلی رات کی فلائٹ سے واپس جاچکی تھی اور حنین غالباً" ابھی تک شاک میں تھی۔
"حنین۔ بیٹا! آپ ٹھیک ہو۔" وہ نرمی سے پوچھتا دو قدم اندر آیا۔ حنین نے چہرہ اٹھا کر خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
"آئی ایم سو سوری' مجھے پہلے پتا ہوتا کہ وہ تمہاری دوست ہے تو میں تمہیں خبردار کر دیتا۔ مگر پریشان نہ ہو' وہ اب تمہیں ہرگز تنگ نہیں کرے گی۔" تسلی دیتے ہوئے وہ مزید آگے آیا۔
حنین بس اسے دیکھے گئی۔ چپ چاپ۔
"اگر وہ دوبارہ تمہیں کوئی نقصان دینے کی کوشش کرے' تب تم سب سے پہلے مجھے بتاؤ گی' میں اسے سنبھال لوں گا' اوکے بیٹا؟" وہ نرمی سے ہمدردی سے جتاتا جا رہا تھا' حنین اسی طرح اسے دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ ہاشم چپ ہو گیا۔
تب ہی جواہرات وہاں آتی دکھائی دی۔ ہاشم نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور گردن پھیر کر حنہ سے بولا۔
"یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی' اوکے۔"
جواہرات اب قریب آچکی تھی۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ بس ہاشم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"آؤ' زمر انتظار کر رہی ہو گی۔"
"آپ جائیں' میں کل مل چکا ہوں۔" وہ دونوں بات کرتے کرتے باہر جانے کو پلٹے کہ
"کیا آپ کو معلوم ہے مسز کاردار! کہ آپ کے شوہر کی دوسری بیٹی کل یہاں تھی؟"
ہاشم ایک جھٹکے سے مڑا اور بے یقینی سے حنین کو دیکھا جو تیز نظروں سے اسے گھورتی' اٹھ کر ان دونوں کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ بازو لپیٹے اور تیکھے انداز میں جواہرات کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ کل ہاشم بھائی نے اسے یہاں سے نکالا تھا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تھا' وہ روتی ہوئی جارہی تھی۔" اس نے ہاشم کی معلومات میں اضافہ کیا۔
جواہرات کے تاثرات نہیں بدلے' وہ سرد سا مسکراتی رہی۔ ہاشم نے پریشانی اور غصے سے حنین کو دیکھا اور پھر ماں کو۔
"حنین! یہ کیا طریقہ ہے میری ماں سے بات کرنے کا۔"
"مجھے سب پتا ہے۔ بچے!" جواہرات نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا' ایک کٹیلی نظر ہاشم پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔ وہ بے حد طیش سے اس کی طرف گھوما۔
"یہ کیا تھا؟" مگر وہ بے خوفی اور تندہی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"اگر آپ کو بھول گیا تھا تو یاد کروادوں ہاشم بھائی! کہ میں زمر یوسف کی بھتیجی ہوں حنین یوسف' اور پھپھو کی طرح میں بھی معاف نہیں کرتی اور میں بالکل بھی سعدی بھائی جیسے لوگوں میں شامل نہیں ہوں جو آپ

کی اچھی لکس اور اچھے مینرز کی وجہ سے آپ سے متاثر رہتے ہیں۔ مجھے آپ پہلے بھی ناپسند تھے اور جو کل۔ آپ نے کیا' اس کے بعد تو میں آپ کو زیادہ ناپسند کرنے لگی ہوں۔"

چبا چبا کر بولتی اس کی آواز اونچی ہونے لگی۔ ہاشم غصہ ضبط کیے' لب بھینچے کھڑا رہا۔ "آپ نے مجھے استعمال کیا' اپنا اور علیشا کا جو بھی جھگڑا تھا' اس میں سے اپنا مقصد نکالنے کے لیے۔ آپ کو پتا تھا وہ میری دوست ہے' مگر آپ نے اس وقت نہیں بتایا' جب اسے لانے کو مجھے اندر بھیجا تھا۔ میں سعدی بھائی نہیں ہوں' جو آپ کی ہر بات کو صحیح سمجھ لوں گی۔"

پھر انگلی اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تندی سے وارننگ دی۔ "آئندہ مجھے کبھی استعمال کرنے کی کوشش کی آپ نے تو میں اس سے بھی برا کر سکتی ہوں کیونکہ مجھے اور میرے دماغ کو آپ ابھی جانتے نہیں ہیں۔"

گھور کر اسے دیکھتی وہ ساتھ سے نکل کر آگے بڑھ گئی اور ہاشم ضبط سے گہرے سانس لیتا وہیں کھڑا کھولتا رہا۔ کچھ دیر تک تو اسے یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شاک کے عالم میں نہیں بیٹھی تھی کیا؟ وہ غصے میں بیٹھی تھی؟

پھر تیزی سے اس نے فون نکالا۔ خاور نے پہلی گھنٹی پہ کال اٹھالی۔

"یس سر؟"

"کیا علیشا کا دوبارہ رابطہ ہوا سعدی کی بہن سے؟"

"نہیں سر! میں مانیٹر کر رہا ہوں۔ وہ علیشا کے کسی میسج کا جواب نہیں دے رہی۔"

"او کے!" ایک تسلی بخش احساس اندر اتر آیا۔

جب وہ باہر آیا تو حنین بڑے ابا کی وہیل چیئر زمر کے کمرے سے نکال رہی تھی۔ اس نے ایک تیز نگاہ حنہ پہ ڈالی' وہ بھی جواب میں اتنی ہی شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتی پلٹ گئی اور وہیل چیئر دور لے جانے لگی۔ ہاشم تیز تیز چلتا دوسری جانب مڑ گیا۔ اسے اب باہر گاڑی میں بیٹھ کر جواہرات کے آنے کا انتظار کرنا تھا۔

جواہرات اندر زمر کے سامنے کرسی پہ بیٹھی غصے سے کہہ رہی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حملو ایسا کرے گا۔ میں نے تمہیں بتائے بغیر کہ تم اسے عزت نفس کا مسئلہ نہ بنالو' حملو کو آسٹریلیا میں اپنی کمپنی میں جاب بھی آفر کی' بس شہر بدلنا پڑتا' مگر تین گنا زیادہ کما لیتا اور اس نے کیا کیا۔ جس منیجر سے اسے ملوایا' اسی کی بیٹی کو پھانس لیا۔" وہ گویا ابھی تک ورطہ حیرت میں تھی۔

تکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز زمر بس چپ سی اسے دیکھے گئی۔

"تم کہو تو میں اس منیجر کو ابھی فارغ کیے دیتی ہوں۔ اس کو معلوم تھا کہ حملو کی شادی ہونے والی ہے' پھر بھی اس نے اپنی بیٹی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ دنیا کتنی خود غرض ہے!" جواہرات نے جھرجھری لی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حملو نے درست فیصلہ کیا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔" وہ ویران آنکھوں سے کھڑکی کو دیکھنے لگی۔

"مگر تم کیسے اس زیادتی پہ خاموش رہ سکتی ہو۔ وہ تمہارا منگیتر ہے' تمہیں اسٹینڈ لینا چاہیے۔"

"اس نے کچھ غلط نہیں کیا مسز کاردار! میں جانتی ہوں' میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔ میری کبھی کوئی فیملی نہیں ہو سکے گی۔ ایسے میں اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

کرسی پہ بیٹھی جواہرات کے چہرے پہ ہمدردی ابھری۔ دل میں درد سا جاگا۔ "آئی ایم ریئلی سوری ہر اس چیز کے لیے جو تمہارے ساتھ ہوئی۔" ہاتھ بڑھا کر اس کے پیر کو ذرا سا دبایا۔ "بس تم کسی کو بددعا نہ دینا۔ کرنے والے کو کسی بات نے مجبور کر دیا ہو گا' ورنہ اتنا ظلم کوئی خوشی خوشی نہیں کر سکتا۔"

زمر نے آنکھیں اٹھا کر تھکان سے اسے دیکھا۔

"یہی تو سمجھنے سے قاصر ہوں' اتنے دن سے یہی تو سوچ رہی ہوں کہ فارس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ نہ کوئی دشمنی تھی' نہ پرانا بغض۔ میں تو اس کی ٹیچر تھی'

میرے کتنے کام کر کے دیتا تھا۔ پھر ایک دم وہ کیسے بدل گیا؟"

جواہرات کی آنکھوں میں چھائی ہمدردی غائب ہوئی۔ اس کی جگہ بے چینی نے لے لی۔ اس کے پاؤں سے ہاتھ ہٹالیا۔

"ہو سکتا ہے کوئی پرانا عناد ہو۔ کوئی رشتے وغیرہ کا چکر۔" وہ احتیاط سے لفظ لفظ ادا کر رہی تھی۔ زمر کی حمایت کی قیمت پہ نہیں کھونی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں تھا' کبھی بھی نہیں۔" وہ ناگواری سے ترش کر بولی۔ "وہ میرا اسٹوڈنٹ تھا بس!"

جواہرات جلدی سے مسکرائی۔

"میں تو محض ایک خیال کا اظہار کر رہی تھی۔ عموماً" قتل تین باتوں پہ ہوتے ہیں۔ زن' زر' زمین۔ یعنی' عشق' دولت یا اپنی طاقت کا غرور۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وجہ وہی ہو جو وہ کہہ رہا تھا۔ اپنے پہلے قتل کو چھپانا۔"

"نہیں۔" وہ لب دانت سے کچلتی نفی میں گردن ہلانے لگی۔ "صرف یہ بات نہیں تھی۔ اس روز وہ فارس لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے کبھی ایسے مجھ سے بات نہیں کی۔ پھر ایک دم سے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" وہ پلکیں سکیڑ کر کھڑکی کو دیکھتی سوچے گئی۔ پھر آنکھوں میں یاسیت ابھری۔ "کیا معلوم واقعی وہ فارس نہ ہو' کسی نے فارس بن کر مجھ سے بات کی ہو۔ شاید میں ہی۔۔۔"

جواہرات نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "اور اس کے فنگر پرنٹس؟ وارث کے ڈی این اے والی رسی کا اس کی کار سے ملنا؟ اس کی گن؟ ہوٹل میں اس کے نام کا کمرا۔ اس سب کی وضاحت کیسے کرو گی؟ تم شاید اپنے والد اور بھابھی کی باتوں کا اثر لے کر کمزور پڑ رہی ہو۔ میں سمجھ سکتی ہوں' اپنوں کے لیے انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔" سمجھنے والے انداز میں جواہرات نے سر کو تھپکا۔

"میں نہ کمزور ہوں اور نہ کسی کا اثر لے رہی ہوں۔" وہ ناگواری سے تیزی سے بولی۔ "میں صرف ان کے منفو۔۔نے کو دہرا رہی تھی۔ وہ فارس ہی تھا' اس نے مجھے شوٹ کیا' میں آج بھی اپنے بیان پہ قائم ہوں۔" شانے اچکا کر وہ خفگی سے رخ موڑ گئی۔

جواہرات کے لبوں پہ مسکراہٹ ابھری ستائش سے اسے دیکھا۔

"گڈ! تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ تمہیں خاندان والوں کا دباؤ نہیں لینا۔ تمہیں فارس سے اپنا انتقام لینا ہے۔"

"میں پراسیکیوٹر ہوں' انصاف پہ یقین رکھتی ہوں' انتقام پہ نہیں۔ کم از کم تب تک نہیں' جب تک انصاف کی امید باقی رہے۔ میں نے بیان دینا تھا' دے دیا۔ اب اور کچھ نہیں کرنا مجھے۔"

جواہرات کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ "تم۔۔۔ تم اس کو کورٹ میں پراسیکیوٹ نہیں کرو گی کیا؟"

"نہیں۔ ایک دوسرے پراسیکیوٹر اس کیس کو ہینڈل کریں گے۔"

"مگر تمہیں فارس کو اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے تمہاری شادی۔۔۔"

"میں اپنی مرضی کی مالک ہوں مسز کاردار! جیسے خاندان کا دباؤ نہیں لیا' ویسے ہی آپ کا بھی نہیں لوں گی۔ آپ چاہتی ہیں میں فارس کو سزا دلواؤں' کیونکہ اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے' میں جانتی ہوں آپ لوگوں کے جائیداد کے مسئلے ہیں۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے' سو ہم اب دوست ہیں۔" وہ کافی سنجیدگی سے جواہرات کو دیکھ کر کہہ رہی تھی' جو آگے سے پھیکا سا مسکرا دی۔

"اور میں آپ کی جگہ ہوتی تو یہی کرتی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے کیوں بار بار اس کے خلاف کارروائی پہ اکسا رہی ہیں۔ مگر میرا ایک خاندان ہے اور وہ شخص سعدی کا ماموں ہے۔ میں نے بیان دینا تھا' دے دیا۔ اب آگے عدالت جانے اور پولیس۔ فارس کا مجھ سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا' اس نے یہ کسی اور وجہ سے کیا۔ تم نہ طور پہ وہی جو اس نے بتائی تھی' اس لیے میں ذاتی طور پہ اس کے خلاف کچھ نہیں کروں

کی۔"

جواہرات بمشکل مسکرا پائی۔ "میں سمجھ سکتی ہوں۔ بہت سی چیزوں میں ہم ایک جیسے ہیں زمر! خیر تم نے درست فیصلہ کیا۔ اگر تم اس کے خلاف محاذ کھول لیتیں۔ تو ندرت یا اس کے بچے تمہاری شکل دیکھنے سے بھی رہ جاتے۔ مگر میں امید کرتی ہوں کہ تم اس کیس کو خود لینے سے احتراز اس وجہ سے نہیں برت رہیں کہ تم دور اندر کہیں اس کو بے گناہ سمجھتی ہو۔"

زمر لمحے بھر کو بالکل چپ سی ہو کر جواہرات کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا تم اندر سے اپنے ہی بیان پہ خود مشکوک ہو چکی ہو' مگر چونکہ خود کو غلط ماننے میں تمہاری ناک آڑے آتی ہے' سو تم اس پہ ڈٹی ہوئی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ اب کے کافی مضبوطی سے بولی۔ "کبھی کبھی مجھے متضاد خیالات آتے ہیں مگر میرا یقین ان کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہے۔ وہ فارس ہی تھا' کوئی بھی چیز مجھے اس بیان سے نہیں ہٹا سکتی۔ اپنی ناک عزیز ہے مجھے' مگر بے انصافی کی حد تک نہیں۔ اگر مجھے لگتا وہ بے گناہ ہے تو میں خاموش رہتی۔ وہ میرا اسٹوڈنٹ تھا۔ شاید اگر میرے ابا کو فالج نہ ہوا ہوتا تو میں خاموش بھی رہ جاتی' مگر اب نہیں۔"

جواہرات گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مسکرا کر اس کے شانے پہ ایک ہاتھ رکھا' دوسرے سے اپنا بیگ اٹھایا۔ "دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے' سو تم مجھے ہمیشہ اپنا دوست پاؤ گی۔"

زمر نے بنا مسکرائے سر اثبات میں ہلایا۔ جواہرات بیگ کندھے پہ لٹکاتی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہوا تو زمر کے تاثرات بدلے۔ سپاٹ چہرے پہ بے پناہ کرب امڈ آیا۔

اس نے مٹھی ہونٹوں پہ رکھی۔ آنکھیں بند کر کے ضبط کرنا چاہا' مگر آنسو امڈ آرہے تھے۔ وہ خبر جس پہ وہ سارا وقت ضبط کر کے بیٹھی رہی تھی' وہ پھر سے طمانچے کی طرح آن لگی تھی۔

حماد کی شادی ہو رہی تھی۔ حماد کہیں اور شادی کر رہا تھا۔ یہ سہنا اتنا آسان نہیں تھا' جتنا اس نے ابھی جواہرات کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ گردن جھکائے' ہاتھ ہونٹوں پہ دبا کر رکھے' وہ مسلسل بند آنکھوں سے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔



دروازہ بجا۔ زمر نے تیزی سے چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا' اور انگلی سے آنکھوں کے گیلے کنارے جلدی جلدی خشک کرنے لگی۔ ذرا کھنکار کر رندھی آواز کا گیلا پن دبانا چاہا اور بولی۔ "آجائیے۔"

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ حسین بڑے ابا کی وہیل چیئر اندر لا رہی تھی۔ زمر رخ موڑے سائیڈ ٹیبل پہ کچھ تلاشنے لگی' ساتھ بار بار پلکیں جھپک کر ان کا گلابی پن دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا تم سرجری کے لیے تیار ہو؟" پشت سے ابا کی آواز آئی۔ وہ "جی" کہتی سنجیدگی سے سیدھی ہوئی۔ آنکھیں اب ہلکی گلابی تھیں۔

حسین خاموشی سے بڑے ابا کی کرسی کے عقب میں کھڑی رہی۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" انہوں نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اسے تسلی دینا چاہی۔

وہ پھیکا سا مسکرائی۔ "مجھے پتا ہے۔" پھر قدرے بے چینی سے بند دروازے کو دیکھا۔ "سعدی کہاں ہے۔ اسے بھی بلا لیں۔"

بڑے ابا کی مسکراہٹ سمٹی۔ اس کی ذرا ذرا گیلی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور پھر ان سے چھلکتی بے کلی کو۔ لب کھولے' مگر بند کر لیے۔

"وہ آجائے تو میں اس کے سامنے حسین کو بتا دوں گی کہ میں تمہارے ماموں کے خلاف کیس نہیں لڑوں گی' نہ اس کے کیس کو فالو کروں گی۔"

"بھائی انگلینڈ چلا گیا ہے لن کا ٹیسٹ تھا ایک پھپھو!" سنجیدگی سے حسین نے بتایا۔

زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ بالکل یک ٹک' سانس روکے۔

"سعدی۔۔۔ چلا گیا؟" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔ حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔

"ہم تو ہیں نا بیٹا! اس کی مجبوری تھی۔"

ثمرہ ہنوز ششدر سی حنین کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا اسے میرے آپریشن کا پتا تھا؟"

(بھائی سے زیادہ کسے پتا ہوگا؟) حنین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ثمرہ کے لب بھنچ گئے۔ ابرو اکٹھے کیے، وہ خفگی سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"ندرت بھی آنے والی ہے، ہم سب تمہارے ساتھ ہوں گے سرجری کے دوران۔ سعدی بھی کال کرتا رہے گا۔"

کال کرنا پروا کرنے کے مترادف نہیں ہوتا تھا۔

ثمرہ لب بھینچے، دوسری جانب دیکھتی رہی۔ حنین ناگواری سے پلٹ گئی۔ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو رہا تھا۔

وہ باہر آئی تو سعدی منتظر کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ دونوں کی پشت دیوار سے لگی تھی اور نظریں سامنے تھیں۔

"کیا آپ ایک دفعہ ان کو خدا حافظ کہنے بھی نہیں جا سکتے تھے؟"

"میں نے ان سے بہت بدتمیزی کی تھی، اب نہیں سامنے جاؤں گا۔ وہ میری شکل دیکھ کر دل کی بات جان لیں گی۔"

"تو پھر زبان کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں؟" پھر ذرا نرمی سے بولی۔ "صرف مل ہی لیں۔" سعدی نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

"اونہوں۔۔۔ مجھے ڈر ہے ان کے سامنے جا کر میں رونے لگ جاؤں گا۔"

گویا حنین کا دل کسی نے دبا دیا ہو۔ اس نے بے اختیار مڑ کر سعدی کا چہرہ دیکھا۔ وہ اداسی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ جینز پہ آدھے آستین کی میرون شرٹ، چھوٹے کٹے بال، جو سامنے سے سیدھے اور سر کی پشت سے گھنگھریالے تھے۔ چہرے پہ چھایا ایک معصوم سا تاثر۔

"آپ انگلینڈ جانے کے بعد پہلی دفعہ آئے گھر تو ہم سب نے کہا کہ آپ بدل گئے ہیں، پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور عقل مند۔ مگر۔۔۔ آپ تو آج بھی ویسے ہی ہیں۔" سعدی نے نظریں پھیر کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"معصوم!" وہ اداسی سے مسکرائی تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"معصوم! کیا یہ میرا دوسرا نام ہے؟"

"پہلا کیا تھا؟"

"ہمارا سعدی!" اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ اداس سے ماحول میں زندگی کی کوئی لَے کسی نے چھیڑی تھی۔

"علیشا کا کچھ پتا چلا؟" اس سوال پہ حنین کی ہنسی تھمی۔ سر نفی میں ہلایا۔

"میں نے اس کی ساری میلز اور میسجز بغیر پڑھے مٹا دیے۔ ہر جگہ سے اسے بلاک کر دیا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں دوبارہ اس سے کبھی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم نے صحیح کیا۔"

"اور آپ نے دیکھا، کس طرح وہ اپنا بیان بدل کر چلی گئی۔ اس نے میرا غصہ ماموں پہ اتار دیا۔ شاید میں اس کی کال اٹھا لیتی، اگر مجھے یہ نہ پتا چلتا کہ اس نے اپنی گواہی بدل دی ہے۔ اپنے باپ سے مسئلہ تھا تو ان تک ہی رکھتی۔ مجھے، کیوں درمیان میں لائی۔" وہ سخت رنجیدہ لگ رہی تھی۔

"چلو اب تم دوبارہ ہاشم بھائی سے اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ ان کا اس سے خون کا رشتہ ہے، وہ لوگ ایک دن پھر اکٹھے ہو جائیں گے، ہم درمیان میں کیوں آئیں۔" وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

حنین بے دلی سے سر ہلاتی رہی۔

"اس نے کہا تھا، چوٹیل انتقام لینے پہ آئیں تو انہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ مگر ثمرہ کیوں ہار گئی بھائی! اس کو بغیر پیسے دیے، ہاشم بھائی نے بھیج تو دیا نا واپس!"

بس ایک یہی الجھن تھی جو اسے ستا رہی تھی۔

سعدی کچھ دیر بالکل خاموش ہو کر سوچتا رہا۔ حنین منتظر تھی۔

"کیا تم سارا وقت ڈرامے دیکھتی رہتی ہو؟ یا قرآن بھی پڑھتی ہو؟ جیسے انگلینڈ جانے سے پہلے ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔"

"کیا بھائی! پڑھتی ہوں نا۔" ایک دم بہت سستی سے کہتے ہوئے، وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اور کیا تمہیں وہ سورتیں یاد ہیں جو ہم نے حفظ کی تھیں؟"

حنین نے انگلی سے کان کے پیچھے بال کھجائے۔

"جی۔۔۔ یاد ہیں، میں ذرا سا اِدھر اُدھر کر سنا سکتی ہوں۔" (کہیں وہ ابھی کے ابھی سن ہی نہ لے۔)

"بہت اچھا۔" سعدی نے خفگی سے اس کو دیکھا، وہ ایک دم بہت معصومیت سے سر جھکائے اپنی عینک اتار کر شیشے سے کچھ صاف کرنے لگی تھی۔

"بہر حال، ہم نے ایک سورۃ حفظ کی تھی، سورۃ نمل، یاد ہے؟"

"جی، بالکل۔" عینک صاف کر کے آنکھوں پہ لگاتے ہوئے اس نے ذہن پہ زور ڈالنا چاہا کہ پہلی آیت کہاں سے شروع ہوتی تھی؟ اف۔۔۔ یاد کیوں نہیں آ رہا۔

"اور نمل کا مطلب کیا تھا؟"

حنین ایک دم کھل کر مسکرا دی۔ شکر بھائی نے سورۃ نہیں سنی تھی، یہ سوال تو بہت آسان تھا۔ ہسپتال کا کاریڈور ایک دم خوشگوار لگنے لگا۔

"نمل یعنی چیونٹی!" بہت اعتماد سے مسکرا کر بتایا۔

سعدی نے پہلے تعجب اور پھر خفگی سے اسے دیکھا۔ "یعنی کہ تم نے عرصے سے قرآن نہیں کھولا۔"

حنین ہکا بکا رہ گئی۔ "مگر میں نے صحیح بتایا ہے۔"

"غلط بتایا ہے۔ نمل کا مطلب چیونٹی نہیں ہوتا۔"

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟"

"چیونٹی کو "نملۃ" کہتے ہیں۔ نمل کا مطلب ہوتا ہے "چیونٹیاں"۔"

حنین کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے، نروٹھے پن سے بھائی کو دیکھا۔ "یہ ایک ہی بات ہوئی۔"

"اگر ایک بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سورۃ کا نام نملۃ رکھ دیتا۔ مگر نہیں۔۔۔ چیونٹی اور چیونٹیوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھو، باقی جتنی بھی سورتیں ہیں، حشرات الارض کے نام کی، وہ واحد ہیں۔ العنکبوت یعنی ایک مکڑی۔ نحل یعنی ایک شہد کی مکھی۔ لیکن چیونٹیوں کی سورۃ "جمع" کے صیغے میں ہے۔ بتاؤ ہے کیوں؟" اس نے ابھی ابھی کی سوچی گئی بات بہت پرجوش ہو کر کہی۔ وہ بہت دھیان سے سن رہی تھی، بے تابی سے بولی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ اکیلی چیونٹی ہوتی ہی نہیں ہے۔ کبھی دیکھی ہے اکیلی چیونٹی؟ اونہوں۔ چیونٹیاں ہمیشہ اپنی قطار میں، اپنے خاندان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اکیلی ہار جاتی ہے، پیر تلے مسلی جاتی ہے اور جو اکٹھی ہوتی ہیں، وہ کبھی نہیں ہارتیں۔ علیشا اکیلی تھی اور تم نے بھی اس کی مدد نہیں کی تو وہ کیسے جیت سکتی تھی۔"

وہ خاموش ہوا تو حنین بالکل چپ سی ہو گئی۔

"اگر وہ مجھ پہ پہلے بھروسا کرتی تو میں اس کی مدد کرتی مگر اب میں اس سے لاتعلق رہنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے۔"

دونوں پھر سے خاموش ہو گئے۔

"مگر وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی، اب وہ نہیں ہے، پھپھو نے بھی مجھے اکیلا کر دیا۔"

"چلو، میں تو ہوں نا تمہارا بیسٹ فرینڈ۔" وہ نرمی سے مسکرایا تو حنین بھی مسکرا دی اور ذرا سی بھائی کے قریب کھسک آئی۔ کندھے سے کندھا ملا۔ حنہ کی چھوٹی انگلی سے اس کی چھوٹی انگلی ٹکرائی۔ ایک تحفظ کا احساس۔ کوئی نہیں ہو گا تب بھی بھائی ہو گا۔ مرتے دم تک۔ آخری سانس تک۔ بھائی ساتھ رہے گا۔

اب پھر سے راہداری میں سے لوگ گزرتے جا رہے تھے اور وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

اتار لیتے ہیں دنیا کو یوں تو شیشے میں
اکیلے ہوں تو آئینے سے ڈرتے ہیں

جواہرات کار میں پچھلی سیٹ پہ آکر بیٹھی تو ہاشم ساتھ برا جمان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دروازہ بند کر کے ڈرائیور باہر ہی کھڑا رہا۔ جواہرات نے سوالیہ نگاہوں سے ہاشم کا چہرہ دیکھا جو آنکھوں میں ڈھیروں فکر مندی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس کو جانے کا کہو ہاشم!"

"ممی۔۔۔ آئی ایم سوری!" اس نے جواہرات کے گھٹنے پہ رکھے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے آنکھوں پہ سیاہ گلاسز لگا رہی تھی۔

"ہم بہت دفعہ یہ بات کر چکے ہیں مگر تم آج بھی اپنے باپ کے گناہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ مجھے اس کی بیٹی کے بارے میں سب علم ہے۔"

"ممی۔۔۔ آئی ایم سوری!" اس کا دایاں ہاتھ ہنوز جواہرات کے گھٹنے پہ ہاتھ پہ تھا۔

"اور اس لڑکی کی اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ میرے شہر میرے گھر پہنچ جائے مگر تم نے مجھے خبردار تک نہیں کیا۔ میں کیا کر لیتی؟ تماشا یا واویلا؟ کیا پہلے کبھی کیا؟ ہونہہ۔" تلخی سے اس نے سر جھٹکا۔ "تمہارے باپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اس کی بیٹی کے بارے میں جانتی ہوں۔"

"ممی۔۔۔ آئی ایم سوری!" وہ مسلسل نگاہیں اس پہ جمائے نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے ہاشم! اس لڑکی یا اس کے کسی مسئلے سے فرق نہیں پڑتا میں عمر کے اس حصے سے نکل چکی ہوں جب فرق پڑا کرتا ہے۔ مجھے کوئی پروا نہیں اگر وہ تمہارے باپ کا کاروبار یا عزت۔۔۔ کے لیے خطرہ نہیں ہے تو۔۔۔ اگر ہوئی بھی تو تم سنبھال لو گے۔"

"ممی۔۔۔ آئی ایم سوری!" وہ زیادہ نرمی اور زیادہ آہستہ سے بولا۔

جواہرات نے ایک ہاتھ سے گلاسز اوپر سر پہ چڑھائے اور آنکھیں گھما کر اسے خفگی اور دکھ کے ملے جلے تاثر سے دیکھا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ ادھر آئی ہے۔ مجھے بے خبر کیوں رکھا۔ شاید میں جانتی ہوں کیوں۔ تم مجھے ہرٹ نہیں کرنا چاہتے تھے۔" کہتے ہوئے آنکھوں میں کرب کی سرخی ابھری۔

"ممی۔۔۔ آئی ایم سوری!" اس نے ذرا سا اس کا ہاتھ دبایا۔ جواہرات نم آنکھوں سے مسکرا دی اور دایاں ہاتھ ہاشم کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ آنکھوں کی خفگی نرمی میں ڈھل گئی۔

"اٹس اوکے۔۔۔ میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتی۔"

وہ بھی مسکرایا پھر پیچھے ہوا۔ ڈرائیور کو واپس آنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے واقعی اس لڑکی سے فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت تو صرف یہ خیال دل کاٹتا ہے کہ ہم دونوں نے زمر کی زندگی برباد کر دی۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے، مجبوری نہ ہوتی تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔" اس کے چہرے پہ ایک دم اٹھ کر آتی تکلیف کو ضبط سے چھپا کر سیل فون نکالنے لگا۔

"مجھے ہر رات سونے سے پہلے زمر کا خیال آتا ہے۔ وہ اس سب کی مستحق نہیں تھی ہاشم!"

"خیر اگر آپ کبھی عدالت میں اس کے مقابلے پہ ڈیفنس اٹارنی کے طور پہ پیش ہوتیں تو اپنی اس رائے پہ نظرثانی ضرور کر لیتیں۔" وہ بظاہر بشاشت سے کہتا مسکرا دیا۔ ڈرائیور دروازہ کھول رہا تھا۔ جواہرات نے گلاسز پھر سے آنکھوں پہ گرائے اور پرسکون سی ہو کر ٹیک لگا لی۔

اب ساری دنیا اپنی مرضی کے رنگ میں نظر آرہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ظلم پر ہنسی ہوئی دکھ سے مگر دکھی ہوئی
ایسی آنکھوں ہی سے طوفان اٹھا کرتے ہیں

(دوماہ بعد)

بڑے ابا کے لاؤنج کم ڈائننگ روم میں دوپہر کے کھانے کی خوشبو پھیلی تھی۔ صداقت جو موجودہ دن سے چار سال قبل کافی دبلا پتلا اور کم عمر سا لگتا تھا، تازہ روٹی لا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ رہا تھا۔ سربراہی کرسی کی جگہ بڑے ابا وہیل چیئر پہ براجمان تھے اور گاہے بگاہے دائیں ہاتھ پر پہلی کرسی پہ سر جھکا کر لقمے توڑتی زمر کو دیکھتے تھے۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولتے، پھر خاموش ہو جاتے۔ اس کے آپریشن کو دو ماہ بیت چکے تھے اور اس کی رنگت تب سے اتنی ہی زرد رہتی تھی۔

دفعتاً میز پہ رکھا زمر کا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے آہستہ سے، سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "سعدی انگلینڈ کالنگ" لکھا آرہا تھا۔ بڑے ابا نے اسکرین نہیں پڑھی، اس کا چہرہ پڑھا اور کالر آئی ڈی جان لی۔ وہ بے تاثر نگاہوں سے موبائل کو دیکھتی رہی اور پھر دوبارہ لقمے توڑنے لگی۔ ان کو بے چینی ہوئی۔

"فون بج رہا ہے۔"

"میں کھانا کھا رہی ہوں۔" لقمہ منہ میں رکھ کر سر جھکائے اگلا توڑنے لگی۔ فون خاموش ہو گیا۔ ذرا سا وقفہ اور پھر بجنے لگا۔ زمر نے پانی کا گھونٹ بھرا اور موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ "ہیلو؟"

"السلام علیکم زمر۔" وہ رکا۔ منہ میں کچھ ہونے کے باعث آواز ذرا فرق لگی تھی۔ "زمر بول رہی ہیں نا؟"

"جی، زمر پھپھو بول رہی ہوں۔" سنجیدگی سے کہتی فون کان سے لگائے، وہ پانی گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔ بھوری آنکھیں میز پہ رکھے گلدان پہ جمی تھیں۔ چہرہ زرد اور نقاہت زدہ لگتا تھا۔ بڑے ابا بس بے چینی سے اس کو دیکھے گئے۔

"اوہ او کے۔ کیسی ہیں آپ زمر؟" وہ صبح سویرے کی نیلے اندھیرے میں ڈوبی سڑک پہ واک کرتے ہوئے موبائل کان سے لگائے "کان لگا کر" اور اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟"

"میں۔۔۔ بالکل ٹھیک۔ آپ کا درد کیسا ہے؟" وہ سڑک کنارے ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ محسوس کرنا چاہا۔

"درد نہیں ہے، یا پھر اب احساس نہیں ہوتا۔" وہ گلاس رکھ کر روٹی کا نوالہ توڑنے لگی۔

"نہیں، اتنی جلدی تو درد ختم نہیں ہوتا۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔ "ابھی تو کچھ وقت مزید لگے گا تا زخم بھرنے میں۔ بہت سے کام آپ نہیں کر سکتی ہوں گی۔" سامنے تیز تیز بھاگ کر جاگنگ کرتے ایک لڑکے کو دیکھ کر وہ بے خود سا بولا۔

"ہوں۔"

"اور۔۔۔ آپ۔۔۔ کیسی ہیں؟" اس کے سرد خشک رویے پہ وہ بس اتنا پوچھ سکا۔

"پہلے جیسی ہوں۔ ابھی کھانا کھا رہی تھی۔"

"اوہ ہاں، آپ کی تو دوپہر ہو گی۔ بڑے ابا جلدی کھانا کھا لیتے ہیں نا۔" وہ خفیف سا ہنسا۔ زمر خاموشی سے نوالہ منہ میں رکھ رہی تھی۔ سعدی چپ ہو گیا۔ پھر دوبارہ کوشش کی۔

"میں۔۔۔ آج جہاں جا رہا تھا دوست کے ساتھ۔۔۔ کچھ چاہیے آپ کو؟"

"صرف سکون۔ اور وہ ادھر سے نہیں ملتا۔"

وہ پھر چپ ہو گیا، مرجھا گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "چلیں آپ کھانا کھائیں میں فون رکھتا ہوں زمر۔" قدرے وقفے سے اضافہ کیا "زمر پھپھو!" تب احساس ہوا کہ بات کے آغاز میں اس نے کیوں یاد کرایا تھا۔ اکیس سال "زمر" رہی اب وہ پھپھو بن گئی تھی۔ بھتیجے نے فون بند کر دیا۔ زمر نے بھی موبائل میز پہ رکھ دیا۔

"اس سے کیوں ناراض ہو؟" وہ غور سے اسے

دیکھنے لگے۔
"میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ وہ میرا بچہ ہے' بچوں سے کون مقابلہ کرتا ہے؟"
"پھر اس کو یہ کیوں کہا کہ زمر پھپھو بول رہی ہوں؟"

"اوکے' آپ ہمارا کھانا خراب کرنا چاہتے ہیں تو ایسے ہی سہی۔" پلیٹ پرے ہٹائی اور سر اٹھا کر سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔ "وہ اس وقت کہاں تھا جب میں بیمار تھی۔ میرا آپریشن تھا ابا! احمد نے منگنی توڑ دی تھی۔ ایک اجنبی عورت مجھے گردہ دے سکتی ہے' مگر وہ سعدی جس کو میں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا' وہ ایک دن بھی میرے لیے نہیں رک سکا۔ وہ میرے پاس کیوں نہیں تھا اس وقت' جب مجھے اس کی ضرورت تھی؟"
"یہ تب کیوں نہیں کہا جب اس نے فون کیا تھا؟" اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ بولی کچھ نہیں۔
"تمہیں اصل غصہ اس بات پہ ہے کہ سعدی نے تمہارے مقابلے میں فارس کا یقین کیا۔" اور اس نام پہ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر گئی۔
"اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں آپ کو یاد کروا دوں کہ فارس کا نام میرے سامنے مت لیا کریں۔ اس نے مجھ پہ گولی چلائی' اس نے میری زندگی برباد کر دی' اور اب بھی وہ آپ سب کو معصوم لگتا ہے۔" زور سے نیپکن پرے ہٹایا۔
"تو پھر تم اس کے خلاف کیس خود کیوں نہیں لیتیں۔ اگر اتنا یقین ہے تمہیں اس کے مجرم ہونے کا؟"

"کیونکہ میں تکلیف میں ہوں اور میں اس تکلیف کو بڑھانا نہیں چاہتی۔ بیان دے دیا' گواہی بھی دوں گی' مگر آگے سرکار جانے اور فارس غازی۔" تلخی سے۔ گویا سمیٹے دل سے کہتی اس نے آخر میں بہت دکھ سے ابا کو دیکھا۔ "اور کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ ندرت بھابھی کیوں آپریشن کے دن سے آج تک مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ مجھے بار بار جھوٹا کہلوائے جانے کا شوق نہیں ہے۔"
موبائل اور پرس اٹھایا اور بیزاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"بابا جی ساری عمر کہتے رہے کہ وہ نہیں رکھتا تعلق تو میں کیوں رکھوں' سوچ سوچ کر ایک دن ہم تنہا ہو جائیں گے۔"
"میں تنہا ہو گئی ہوں۔۔ تھینک یو ابا!" کاغذات سمیٹے' پرس کندھے پہ لٹکایا اور کرسی پیچھے دھکیلی۔ انہوں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔
"اب کہاں جا رہی ہو؟"
"سعدی کی فیس جمع کروانی ہے۔"
اور وہ ایک دم لاجواب سے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔
"مگر۔۔ تم تو اس پہ غصہ تھیں زمر!"
"کیا مطلب؟ ہاں' مجھے اس پہ غصہ ہے' لیکن آپ نے کیا سمجھا ابا؟ میں اس کی فیس جمع کروانا چھوڑ دوں گی۔ اوہ ابا!" کراہ کر ناگواری سے ان کو دیکھا۔ "وہ بچہ ہے' میں نہیں۔" اور پرس لیے باہر نکل گئی۔
بڑے ابا نے ایک نظر ادھورے کھانے پہ ڈالی۔ یہ اگلے چار سال تک کے' اکثر ادھورے رہ جانے والے کھانوں کا آغاز تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے تک اس نے ایک دو مزید کالز سنیں جو آفس سے تھیں۔
اس کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی۔ لب کاٹتے ہوئے پرسوچ نظروں سے سامنے دیکھتی رہی۔ چہرے پہ الجھن تھی۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے ہاشم کو کیسے ملیں میرے گواہ کی معلومات؟" اچنبھے سے وہ بڑبڑائی۔ کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی' پھر ایک دم چونکی۔ بے اختیار موبائل کو دیکھا۔ چہرے پہ تعجب ابھرا۔ پھر غصہ۔
ہاشم کا نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔ لب سختی سے بھینچ رکھے تھے۔
"ہیلو میڈم پرائیکیوٹر! مجھے کیسے یاد کیا اتنے دنوں بعد؟" وہ ہمیشہ کی طرح خوشگوار سا بولا تھا۔
"بہت مبارک ہو۔ آپ نے نعمان اکرم بنام افضل کاٹھیاواری کو یعنی میرے کیس کو خراب کر دیا ہاشم!"

"اوکے تو میں نے کیا کیا ہے؟"

"میری سرجری سے پہلے آپ نے مجھ سے میرا فون لیا تھا' فارس کی کال ریکارڈز وغیرہ کے لیے' مگر درحقیقت آپ نے اس میں سے میرے گواہ کا نمبر اور پتا نکالا' اسے ٹریس کیا' اس کا پیچھا کیا' اسے یا فورڈز دے کر منہ بند کروالیا اور گواہی بدلوادی۔ تھینک یو سو مچ ہاشم!" ضبط کرتے کرتے بھی آواز بلند ہوگئی۔

"آپ کو لگتا ہے کہ آپ اندر آپریشن ٹیبل پہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوں گی اور میں باہر آپ کے فون کا غلط استعمال کر رہا ہوں گا؟"

"آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے میرے فون سے اس کا نمبر نہیں لیا؟"

"نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے ڈاکٹرز کے باہر آجانے اور آپریشن کی کامیابی کی اطلاع ملنے تک آپ کا فون کھولا بھی نہیں تھا' ہاں جب آپ کو ہوش آگیا' تب لیا تھا میں نے نمبر۔" وہ مزے سے بولا تھا۔

"تو! آپ کی انسانی ہمدردی!" تھک کر گہری سانس لی۔ "اور جب آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو میری بات پہ یقین ہے تو مجھے لگا کہ آپ بدل گئے ہیں' مگر نہیں' آپ آج بھی ویسے ہی ہیں۔"

"سو تو ہوں۔ سی یو ان کورٹ۔ تب تک آپ کوئی نیا گواہ تیار کریں۔" محظوظ سا کہتے ہوئے اس نے کال بند کی اور زمر نے "اف" کر کے جھرجھری لی۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ وہ دوبارہ بج اٹھا۔ نمبر دیکھ کر زمر کے ابرو تن گئے۔ ناگواری سے اس نے کال اٹھائی۔

"میڈم! آپ سے ایک۔"

"میرا جواب ناں میں ہے۔ اپنے کلائنٹ فارس غازی سے کہیے کہ بار بار مجھ سے ملاقات کے لیے اصرار نہ کیا کرے۔"

"آپ صرف ایک دفعہ اس سے مل کر تسلی سے اس کی بات سن لیں۔ اس کا پوائنٹ آف ویو بھی تو جاننے کی کوشش کریں۔ ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو کیس کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنی چاہیے۔"

"شاید آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس کیس کی وکیل نہیں ہوں۔ نہ پراسیکیوٹر' نہ ڈیفینڈر۔ میں اس کیس کی Victim ہوں اور Victim کے لیے کوئی دوسری سائیڈ نہیں ہوتی۔"

"اوکے' لیکن ایک دفعہ اس کی بات سننے میں کیا حرج ہے؟" وہ نرمی سے سمجھانے لگے۔ زمر نے بات کاٹ دی۔

"میں ضرور سنتی' اگر وہ کہتا کہ کسی نے اس سے گن پوائنٹ پہ کال کروائی ہے' تب میں اس کو بے گناہ بھی تصور کر لیتی' مگر جب وہ سرے سے ہر چیز سے انکاری ہے' جب وہ مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے تو میں کیوں سنوں؟"

"مگر ایک وکیل کی حیثیت سے۔"

"کیا وکیل وکیل کی رٹ لگا رہے ہیں آپ؟ جب ایک وکیل کی حیثیت سے اس کی منت کی تھی کہ اس کا کیس لڑوں گی اور وہ مجھے نہ مارے' تب اس نے سنی تھی میری بات۔ آئندہ مجھے فون مت کیجیے گا۔"

اور کھٹ سے کال کاٹ دی۔

☆ ☆ ☆

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

جیل کے اس کمرے میں بچھی میز کے ایک طرف فارس تھا اور دوسری جانب حسین اور ندرت۔ وہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔ پہلے والا غصہ' اکڑ' غصہ سب ندارد تھا۔ اس کے برعکس کافی ڈھیلا لگ رہا تھا۔

"یہاں مت آیا کریں' وہ بھی حنہ کو لے کر۔ کتنی دفعہ بتاؤں' یہ کوئی ماحول ہے آنے والا؟" اس نے خفگی سے ندرت کو مخاطب کیا مگر انداز میں تھکان تھی۔

"سعدی واپس جا چکا ہے۔ شوہر میرا مر چکا ہے' ایک بھائی قتل ہو چکا ہے۔ ایک۔ اور کیا کروں؟" ندرت روہانسی ہو گئیں۔

"امی! آپ یہ میلوڈراما کافی دیر سے کر رہی ہیں' اب بس کر دیں۔" وہ چڑ کر بولی تو دونوں نے بے اختیار اسے دیکھا۔

"اتنی دیر سے سن رہی ہوں میں یہ باتیں۔ بس کریں' آپ دونوں۔ اور امی! کرلیں نا آپ نے جو باتیں کرنی تھیں۔ اب باہر انتظار کریں۔ مجھے ماموں سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

"تمیز نام کی چیز میری اولاد کو چھو کر نہیں گزری' تم گھر پہنچو' میں بتاتی ہوں۔" آنکھ کا کنارا صاف کرتی ندرت اس کو سخت سست سنا کر چلی گئیں تو وہ اثر لیے بنا سنجیدگی سے فارس کی طرف گھومی۔ دوپٹا سر پہ لیے عینک لگائے' وہ خفا نظر آ رہی تھی۔

"کیا آپ کی پھپھو سے بات ہوئی؟"

"نہیں۔ وہ ملنا نہیں چاہتیں۔" وہ میز پر رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ حنین اس کو دیکھتی رہی' یہاں تک کہ ایک پرانا منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔

چھوٹی سی حنین خفا اور خاموش سی باغیچے کے کونے میں بیٹھی تھی اور فارس اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

"اور پھر امی نے تمہیں ڈانٹا؟"

"صرف ڈانٹا؟ وہ تب سے مجھے ڈانٹ رہی ہیں' جب سے میں نے گملا توڑا ہے۔ میرا دل کر رہا ہے میں مر جاؤں۔" (اس عمر میں اسے مرنے کی بڑی فینٹسی ہوتی تھی۔)

"اور؟"

"اور کیا؟"

"اور کیا دل چاہ رہا ہے تمہارا؟"

"یہی کہ میں جنت میں چلی جاؤں' وہاں میرے پاس بڑا سا گھر ہو۔"

"اور؟" وہ نرمی سے پوچھتا جا رہا تھا اور وہ بتاتی جا رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" اس کی آواز پہ حنہ چونکی۔ وہ تکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں نہیں کہتے وہ جو کہنا چاہتے ہیں؟ کب تک اپنی فیلنگز اور سوچ کو اندر دبا کر رکھیں گے؟ آپ کو پھپھو پہ غصہ ہے' نا تو کہہ دیں۔ جو بھی اندر ہے نکال دیں۔"

"ہاں۔ مجھے غصہ ہے اس پر۔ اس نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کہ۔۔۔ کہ میں۔" تلخی سے کہتے کہتے وہ رکا۔

"کہ میں؟"

"کہ میں کس تکلیف میں ہوں۔ جو مری ہے' وہ میری بیوی تھی اور مجھے بہت پیاری تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ میرے ساتھ کھڑی ہوتی اور میری بیوی کے قاتلوں تک پہنچنے میں میری مدد کرتی' وہ مجھ پہ الزام لگا رہی ہے۔ ہونہہ۔" مٹھیاں بھینچ کر کہتے اس نے سر جھٹکا۔

"اور؟"

"اور تمہیں پتا ہے جیل کیسی ہوتی ہے؟ تاریک اور خالی۔"

"اور؟" وہ سکون سے پوچھے گئی۔ فارس نے گہری سانس لی اور پھر سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

"اور جب رات ہوتی ہے اور بتیاں بجھا دی جاتی ہیں' میں تب بھی سلاخوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں' اس حصے میں جہاں روشنی کی کرن صبح سب سے پہلے گرتی ہو۔ اس اندھیرے میں سب سے زیادہ زرتاشہ یاد آتی ہے۔ اس کو اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ رات کو سوتے وقت بھی ڈریسنگ روم اور ٹیرس کی بتیاں جلا دیتی تھی۔" کہتے ہوئے وہ رکا۔ اب اس کا سر جھکا تھا' اور کہنیاں میز پہ رکھی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیشانی مسلتا رہا۔ حنین بس اسے دیکھے گئی۔

"اور؟" اس نے سر اٹھایا۔ تھکاوٹ سے چور آنکھوں سے بائیں جانب دیوار کو دیکھنے لگا۔ کچھ یاد آیا' چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ حنین نے عرصے بعد فارس کو مسکراتے دیکھا تھا۔

"وہ بہت پیاری تھی حنہ! جب شادی ہوئی' مجھے پسند نہیں تھی وہ۔ امیچور اور بے وقوف لگتی تھی۔ مگر ایک دفعہ میں پیار ہوا تو وہ بڑھتا ہی گیا' بڑھتا ہی گیا۔ ہاں' تو

اس نے اس رات بجھا دی۔ ساری بتیاں۔ کہیں میں ڈسٹرب نہ ہوں۔ اس دن سے وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ حنین! جب پولیس مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آ رہی تھی، تب بھی وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے یقین تھا میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

"اور؟"

"اور میں زمر سے مل کر اس سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ زرتاشہ کو وہاں کس نے بلایا تھا؟ اور یہ کہ اس نے آخری باتیں کیا کہی تھیں؟ ریسٹورنٹ والے کہتے ہیں، وہ دونوں کافی دیر وہاں بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں صرف اس لیے نکلوانا چاہتا تھا کہ دیکھ سکوں، وہ ناراض تو نہیں لگ رہی تھی۔ میں کل یہ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کر سکا تھا، مگر۔۔۔" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ "مگر ہر وہ فوٹیج جو میرے لیے ضروری تھی، وہ غائب ہے۔"

"نہ صرف ریسٹورنٹ کی فوٹیج، بلکہ وارث ماموں کے قتل کی رات ہوٹل انٹری اور ایگزٹ کی فوٹیجز بھی غائب ہیں۔ فائرنگ والے دن اتفاق سے اسی فلور کے کیمرے خراب تھے، کمرا بھی آپ کے نام تھا، جو ریسپشنسٹ اس وقت ڈیسک پہ تھی، جب اس کمرے کی چابی لی گئی، وہ بھی غائب ہے۔ آپ کو بری طرح پھنسایا گیا ہے ماموں! اس سب میں۔" وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اداسی سے کہہ رہی تھی۔

"مگر زمر ان تمام واقعات کو کیوں نہیں دیکھتیں؟ کیوں میری بات نہیں سنتیں کہ مجھے اس میں پھنسایا جا رہا ہے۔"

"وہ کہتی ہیں، ایک انٹیلی جنس آفیسر کو کون ٹریپ کر سکتا ہے؟"

"کیسے نہیں ٹریپ کر سکتا؟ یہ ہاشم کا سیکیورٹی آفیسر خاور، یہ بھی پہلے ایک ایجنسی میں تھا، پھر کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں نکالا گیا۔ ہاشم نے اس کا کیس لڑا اور اس کو بری کروا کر اپنے پاس رکھ لیا۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ وہ کافی دیر سے بول رہا تھا، اس لیے اب تھک چکا تھا۔

"آپ کے ایجنسی کے دوست سینئرز۔۔۔ کوئی نہیں ہے جو ہماری مدد کر سکے؟"

"حنین! یہ ایجنسیاں تب تک ساتھ دیتی ہیں 'جب تک آپ ان میں شامل ہیں۔ جب نکال دیے جاؤ تو سب ختم۔"

"مگر آپ کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ کسی پہ تو شک ہو گا آپ کو۔"

"دشمن تو بہت ہیں۔ کتنے کیسز دیکھے 'یاد بھی نہیں۔ مگر یہ میرے دشمن نے نہیں کیا۔ یہ وارث کے قتل کو کور کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اور۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ آنکھوں میں چبھن سی ابھری۔

"اور؟" حنین نے بغور اس کو دیکھا۔

"مجھے ہاشم پہ شک ہے۔"

"اوہ۔۔۔" حنہ گہری سانس لے کر پیچھے ہوئی۔ "مجھے معلوم ہے جو آپ نے بھائی سے کہا اور ہاشم بھائی نے سن لیا 'وغیرہ وغیرہ۔ ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔ آپ کی جگہ یہاں ہاشم بھائی کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔" اس نے مسکرا کر آنکھیں بند کرکے جیسے مزا لیا۔ "مگر ابھی آپ نے کہا کہ یہ سب کرنے والا آپ کا نہیں 'وارث ماموں کا دشمن ہے۔ تو ہاشم بھائی کی ان سے کیا دشمنی؟ اور ویسے وہ قاتل لگتے تو نہیں ہیں۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہاشم نے قتل کروائے ہیں۔ مگر مجھے اس میں وہ پھنسا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات۔ میری کار میں جو بھی ڈالا گیا 'سو ڈالا گیا 'مگر جس صبح میں اور تم علیشا کے پاس ہوٹل گئے تھے 'تب پیچھے سے میرے گھر کی بیسمنٹ سے میری گن چرائی گئی۔ نہ کوئی لاک ٹوٹا 'نہ دروازہ۔ اتنے گارڈ 'سیکیورٹی چیک پوائنٹس اور سی سی ٹی وی کیمروں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی کیسے میرے گھر میں داخل ہو سکتا ہے اگر ہاشم اس کی مدد نہ کرے تو؟"

"خیر جھول تو ہر سیکیورٹی سسٹم میں ہوتے ہیں۔ جب لوگ ہمارا کوئی پیچ سکتے ہیں 'تو کاروارز کا تعمر کیا چیز ہے؟" حنین کو بات دل کو لگتی ہوئی نہیں لگی تھی۔

"اور ہاشم کی بہن؟ وہ کیوں چلی گئی؟"

"بتایا تو تھا 'وہ میری وجہ سے گئی۔ مجھ پہ غصہ جو تھا 'وہی نکالا اس نے۔"

"اور اگر اس کو ہاشم نے ڈرا دھمکا کر بھیجا ہو تو؟ حنین! میں اس آدمی پہ اعتبار نہیں کرتا۔ وہ صبح اٹھتے وقت آنکھ کھولنے سے پہلے جھوٹ بولتا ہے۔ اب یہ مت کہنا 'وہ میرے لیے بہترین وکیل مقرر کر رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ مت مخلص ہے۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔" وہ بتاتے بتاتے رکا۔

"کہہ دیں۔ میں سن رہی ہوں۔ میں ہمیشہ سنوں گی۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

فارس نے سر اثبات میں ہلایا اور انگلیاں آپس میں مسلتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہم چھوٹے تھے تو ماموں ہم سب کے لیے کھلونے لائے۔ ہاشم کو ٹوائے پستول دیا 'مجھے ٹوائے رائفل۔ ہاشم میرے پاس آیا اور کہا 'تمہاری رائفل تو بالکل اچھی نہیں' اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ڈیڈ کو یہ واپس کرکے اس سے بہتر لے لیتا۔ میں یہ سن کر فوراً گیا اور ماموں کو وہ واپس کر دی۔ ماموں کو میرے رویے سے بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے ایک اور کھلونا مجھے تھما دیا اور وہ رائفل کافی دکھ سے سامنے کر کے پوچھا کیا کوئی یہ لے گا؟ ہاشم فوراً گیا اور بہت تابع داری سے وہ لے لی۔ بعد میں 'میں نے پوچھا کہ اگر خود لینے کا دل تھا تو مجھے یہ سب کیوں کہا؟ تو وہ بولا 'میں نے تو صبح سے تم سے بات بھی نہیں کی۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اس دن میں لپنے ماموں کے دل سے اتر گیا اور ہاشم میرے دل سے۔"

"مگر ہم یہاں اصلی گنز کی بات کر رہے ہیں ماموں! ہاشم بھائی بڑے ہوا کے کرپٹ اور جھوٹے بھی 'مگر ان کے پاس یہ سب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کوئی ایک بھی چیز آپ کے ماموں یا ان کے خاندان کو اس سب میں ملوث نہیں کرتی دکھائی دیتی۔ مجھے لگتا ہے 'اورنگ زیب کاردار کے علی الاعلان آپ سے اظہار لاتعلقی کے باعث آپ ان سے ناراضی کی وجہ سے ایسا سوچ رہے ہیں۔"

"ہوں شاید۔" وہ پُرسوچ نظروں سے دور دیوار کو دیکھتا نیم قائل ہو گیا۔ یا پھر اب بھی مشکوک تھا۔ اس کو خود نہیں معلوم تھا۔

ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ صدا دینے والے نے صدا لگائی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور ستے چہرے کے ساتھ مسکرا دیا۔

"تھینک یو حنین۔ دوسری دفعہ میری بات سننے کے لیے۔"

اور پہلی دفعہ کب تھا؟ حنین کو یاد آیا۔ وارث ماموں کے قتل والی رات' ہوٹل میں جب اس نے ذکر کیا تھا۔ اس لونگ کا۔)

"میں ہمیشہ سنوں گی۔ چاہے پھپھو نہ بھی سنیں۔" وہ رکی ذرا ہچکچائی۔

"جب آپ ان سے ملنا تو ان پہ غصہ نہ کرنا۔ وہ تکلیف سے گزری ہیں اور شاید ایسی تکلیف سے گزرنے کے بعد میں بھی یہی کرتی۔"

"یہی مسئلہ ہے حنین! کہ صرف وہی تکلیف سے نہیں گزریں۔"

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"سنو۔" وہ جا رہی تھی جب فارس نے پکارا۔ وہ بے اختیار مڑی۔

"جی؟"

وہ چند لمحے دیکھتا رہا' پھر آہستہ سے بولا۔ "میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ مجھے یہاں سے نکال لو گے؟" بدقت یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ڈھیروں بے بسی اور کرب در آیا تھا۔ حنین کو جھٹکا سا لگا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر۔

"کاش میں نجومی ہوتی۔" کہا اور باہر نکل آئی۔

فارس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ وہ ایک سرنگ کے اندر کھڑا تھا جہاں دونوں طرف اندھیرا تھا۔ اور دونوں طرف کا منہ بند تھا۔

☆ ☆ ☆

زمر سے بات کر کے ہاشم نے موبائل جیب میں رکھا اور سامنے دیکھا۔ وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا اور یہاں نشیب میں واقع فارس کا گھر نظر آتا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑے مگ سے کافی کی گھونٹ بھرتے ہوئے وہ ریلنگ پہ جھک کر' سوچتے ہوئے انیکسی کو دیکھنے لگا۔

جواہرات عقب سے چلتی اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

"میرا خوف بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سارا ڈراما اگر کھل گیا تو؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔ صرف دو لوگ ہمارے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ فارس اور زمر۔ اب دونوں مصروف ہیں۔ فارس کا وکیل کیس کو لٹکاتا جائے گا۔ پیشی پہ پیشی۔ کمزور دفاع۔ اور اگلے آٹھ دس سال تو فارس جیل سے نہیں نکلنے والا۔" کہتے ہوئے رک کر' گھونٹ بھرا۔ جواہرات مضطرب سی اس کو دیکھے جا رہی تھی۔

"رہی زمر۔ تو وہ اپنے علاج میں مصروف رہے گی۔ ہو سکتا ہے جلد ہی اس کی شادی ہو جائے تو وہ منظر سے بالکل آؤٹ ہو جائے۔"

کافی ختم کر کے مگ پیچھے میز پہ دھرا اور ریلنگ سے ٹیک لگا کر سینے پہ بازو لپیٹ کر اسے مسکرا کر دیکھا۔

"اور زرتاشہ کا خاندان تو ویسے ہی فارس کو مجرم گردانتا ہے۔ کوئی بھی میرے پیچھے نہیں آنے والا۔"

"تم سعدی کو بھول رہے ہو۔"

"سعدی؟ وہ تو چھوٹا معصوم سا بچہ ہے۔ اس نے فارس کو مجھ پہ چھوڑ دیا ہے' دو سال تک تو وہ پڑھائی کے لیے انگلینڈ رہے گا' پھر وہیں جاب کرے گا' کیا پتا فیملی کو بھی وہاں بلالے۔ باہر جا کر کون واپس آتا ہے۔ اس کی کیا فکر کرنی؟" لاپروائی سے ابرو اچکا کر وہ بولا تھا' جیسے اسے جواہرات کے ان وہموں پہ تعجب ہوا ہو۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے بھی اچھی امید کرنی چاہی۔ پھر دونوں ساتھ جا کھڑے ہوئے اور ویران انیکسی کو دیکھنے لگے۔

آج' چار سال بعد۔ وہ انیکسی اتنی ویران نہیں تھی۔

اس کی بیسمنٹ میں دیوار پہ لگی تصویروں اور تراشوں کے سامنے فارس کھڑا تھا اور پیچھے کہیں سعدی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

تراشوں کے اوپر چلتی چار سال پرانی فلم ختم ہوئی تو فارس چونکا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے کپ کو دیکھا۔ وہ ہنوز گرم تھا اور وہ اتنا لمبا سفر کر کے واپس بھی آگیا تھا۔ ذہن کی رفتار روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ تھی۔

"کچھ کھلائیں گے یا میں جاؤں؟" اپنا کپ خالی کر کے رکھتا سعدی اٹھا تو فارس چونک کر مڑا۔

جینز' جوگرز اور ٹی شرٹ میں ملبوس دراز قد لڑکا' چار سال قبل کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ' صحت مند' اور بڑا بڑا لگ رہا تھا۔ تول تول کر بولنے والا مگر اچھا بولنے والا۔

"مرضی تمہاری۔" ایک گھونٹ بھر کر اس نے میٹھی چائے رکھ دی۔ پھر کچھ سوچ کر موبائل اور والٹ اٹھالیا۔ "چلو ساتھ چلتے ہیں' کیا سے دو چار دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"جی مگر گھر میں پہلے دن جیسی خاطر نہیں ہوگی۔ بھنڈی بنا رہی تھیں امی۔ اب آپ دو ہفتے پرانے ہو چکے ہیں۔" سونف مٹھی میں بھر کر پھانکتے ہوئے وہ محظوظ سا کہتا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ فارس تبصرہ کیے بغیر پیچھے آیا۔

جب کار واپس روش پہ لاتے ہوئے وہ کاردار قصر کے قریب ہوئے تو سعدی نے دیکھا۔

ہاشم اور سونیا اپنے کتے سمیت ابھی تک لان میں کھڑے تھے۔ اب تھیم کی نوعیت بدل گئی تھی۔

"میں ایک منٹ ہاشم بھائی سے بات کر کے آتا ہوں!" وہ کار سائیڈ پہ روک کر باہر نکلا تو فارس نے بے زاری سے پیچھے سے پکارا۔ "جلدی آنا۔"

اسے آتا دیکھ کر ہاشم نے سونیا سے کچھ کہا' وہ سر ہلا کر ایک طرف کو چلی گئی۔ سعدی قدم قدم چلتا قریب آیا۔

"ہیلو سعدی۔" ہاشم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

دونوں میں سے کسی نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"بس ایک بات کہنی تھی ہاشم بھائی۔" وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتا کہنے لگا۔ "شہرین چاہتی ہیں کہ میں آپ سے بات کروں' اس لیے کر رہا ہوں۔ آپ سونیا کو ان کے ساتھ جانے دیں۔ انہوں نے اپنی فلائٹ بھی آگے کروالی ہے۔"

"اوکے میں اسے جانے دوں گا' ایک شرط پہ۔"

سعدی کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ "اور وہ کیا ہے؟"

"جو تم نے مجھ سے چرایا تھا' وہ واپس کر دو' اور میں سونی کو شہرین کے ساتھ جانے دوں گا' ڈیل؟" جیب سے دایاں ہاتھ نکال کر ہاشم نے اس کی طرف بڑھایا۔

سعدی نے اس کی سرد مسکراہٹ کو دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ کو۔ فیصلہ کرنے کے لیے بس چند سیکنڈ تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایمل رضا



چپ پھر ایسی لگی کہ سعدیہ بول بول کر اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر تھک گئی، لیکن دادی کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو سکی۔

"اللہ کتنا بولتی ہیں دادی۔"

سعدیہ اٹھتے بیٹھتے اللہ سے شکوہ کیا کرتی۔ سوال سنتے سنتے اس کے کان پک جاتے۔ جواب دیتے دیتے اس کی زبان سوکھ جاتی، لیکن دادی کی یادوں باتوں کا گھنا جنگل بنجر ہونے میں نہ آتا۔

"ادھر آجا۔ ادھر بیٹھ جا۔ کھانا کھالے۔ تھوڑا اور کھالے۔ کھا بھی لیا۔"

بھرے الگ۔

"اسکول نہیں گئی آج۔ آج جلدی واپس آگئی۔ پڑھائی کیسی۔ استانیاں کیسی۔ اسکول کی لڑکیاں کیسی۔ اسکول کیسا۔؟"

سوال الگ۔

دادی پوچھتے پوچھتے نہ تھکتیں، وہ بولتے بولتے ہلکان ہو جاتی۔

"ہے سعدیہ کتنی سہیلیاں ہیں تیری۔؟"

"پانچ دادی۔ پانچ۔" وہ پانچ کو پچاس کا زور دے کر کہتی۔

"کیا نام ہیں بھلا ان کے۔؟"

وہ نام بتائے جاتی گنوائے جاتی جھنجلائے جاتی۔ وہ ان سہیلیوں کے نام بھی بتا دیتی جن سے آج کل اس کی پکی ناراضی چل رہی تھی۔ کٹی موٹو۔ تنکا توڑ والی ناراضی۔ لیکن وہ ناراضی والا واقعہ گول کر جاتی، اب سارا قصہ کون سنائے نئے سرے سے۔ اوپر سے نئے سوال جواب پھر الگ۔ نصیحتوں فضیحتوں کے لیکچر تو دادی کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر ویسے ہی بھرے ہوئے تھے۔

"کس نمبر کی بس میں جاتی ہے اسکول۔"

"دس نمبر بس دادی۔"

"کتنا کرایہ ہے سعدیہ۔ ہے کتنا کرایہ؟"

"دس روپے دادی۔" حلق جواب دینے پر آجاتا۔

"دونوں دس۔" مصنوعی حیرانی۔

"ہاں۔ دادی۔ خدا کے لیے اب بس۔" لہجوں کا اتار چڑھاؤ کیا نظر آتا تھا دادی کو۔ جڑے ہاتھ بھی کوئی کمال نہ دکھلاتے۔

"آج کیا کھایا کینٹین میں تو نے سعدیہ۔"

"پیٹز دادی!"

"وہ کیا ہوتا ہے بھلا۔؟"

سعدیہ گھبرا جاتی۔ شمن نمبر ون بیکری کا ماہر بھی آجاتا تو دادی نے کم از کم اس دفعہ ترکیب پوچھے بنا چین کہاں لینا تھا۔

"آلو کی ٹکی کو انگلش میں پیٹز کہتے ہیں دادی۔"

"اچھا!" ناک سے ہنکارا ابھر آتا۔ ایسے کئی جھوٹ وہ دن میں ہزاروں بولتی تھی۔

اماں کو بھلا کیا پتا چلنا تھا کہ سعدیہ کیسے کرب سے گزر رہی ہے۔ آج کی وہ محلے در محلے چغلی میٹنگ سے فارغ ہو کر شام کو ابا کے آنے سے ذرا پہلے گھر واپس آتی تھیں۔ ابا بھی کام سے تھکے ہارے آتے تو کھانا کھا کر سو رہتے۔ گھر سے غیر موجودگی نے دونوں کو انجان رکھا کہ سعدیہ بے چاری پر کیا کیا بیت چکی اور



مزید کیا بیت رہتا ہے۔ ایسے ہی دنوں جلتے کڑھتے سعدیہ ایک دن دادی پر چیخ پڑی۔

"چپ کر جاؤ دادی... پڑھنے دو مجھے اب۔" اور پانچ گھنٹوں کے سوئے ابا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیسے بات کر رہی ہے میری ماں سے... معافی مانگ ابھی... اسی وقت۔" اور جو وہ شکایتیں کرنے بیٹھتی تو نجانے کس کس کو معافی مانگنی پڑتی پھر اس سے۔

ہاں پہلے پہل کبھی اسے دادی بہت بھلی لگتی تھیں۔ جب وہ ان کی گود میں بیٹھ کر جنوں پریوں کی کہانیاں سنا کرتی تھی۔ ابو قاسم کے جوتے 'مترشہزادی' علی بابا چالیس چور... سعدیہ خود ان ہی کرداروں میں الجھی ہوئی تھی ان دنوں... اسے تنمنٹ جانے میں دو دن رہ گئے تھے۔ کام آدھا بھی مکمل نہ ہوا تھا۔

ایسے ہی وقتوں میں اسے ابا پر بھی بہت غصہ آتا۔

ساری زندگی گوند کی طرح چھڑے کے گودام سے ہی چپکے رہے۔ گھر کا چھڑا تو نہ گرمی میں پھیلا نہ سردی میں سکڑا، وہی پرانے دو کمرے، صحن تو سمجھے بھی آدھا۔ ایک کمرے میں لبالب قابض۔۔۔ دوسرے میں دادی۔۔۔ سعدیہ۔۔۔۔

وہ تو دونوں کمروں میں تھی ہی نہیں بے چاری۔۔۔ کبھی کبھی وہ باہر صحن میں ٹھکانہ بنانے کا عہد کرتی۔ کبھی سوچتی چھت پر ڈنڈے لگا کر کپڑا تان لے اور اوپر ہی جا کر وطنی کاٹے، پھر چاہے شکر دوپہر کی دھوپ اسے جلائے یا ساون کی بارش اپنے ساتھ بہا لے جائے اس کی بلا سے۔ کبھی کچن یا باتھ روم میں بس جانے کا خیال دل میں آتا لیکن رات کے کیے فیصلے صبح کی شبنم کی طرح بھک سے اڑ جاتے۔۔۔ وہ کیوں جلائے اپنی جان بھری جوانی میں۔۔۔ یہ ہی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ بدقسمتی سے دادی جن کو رونے پیٹنے پر ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

ایک دن اسکول سے اس کی سہیلیاں آئیں۔ وہ جو اس کے عاجز آنے کے بیان پر یقین نہ کرتی تھیں، اپنے کانوں میں انگلیاں دینے لگیں۔ دادی نے سوال پوچھ پوچھ کر اتنی معلومات اکٹھی کرلیں ان سب کے بارے، کہ اب ان پانچوں کے شجرہ نسب گھر بیٹھے آسانی سے لکھ سکتی تھیں اور خود اپنے بارے میں وہ وہ جتایا۔۔۔ وہ وہ جتایا کہ۔۔۔ لڑکیاں دوہری ہو ہو گئی۔۔۔ کچھ ہنس ہنس کر کچھ شرم سے۔۔۔۔

سعدیہ ساری رات دعا کرتی رہی کہ یا تو اس کا اسکول تباہ ہو جائے راتوں رات یا اس کی سہیلیوں کی یادداشت گم ہو جائے ابھی کہ ابھی۔۔۔ ان سب کے مذاق کا نشانہ بننے سے اب وہ بھلا خود کو کیسے بچا پائے گی۔

دادی نے تو کوئی راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔

پھر وقت گزرا، رت بدلی۔ سعدیہ اسکول سے کالج میں چلی گئی۔ لیکن پانچ سہیلیوں کے نام وہی پرانے رہنے دیے اس نے۔۔۔ دس نمبر کی بس اور دس روپے کرایہ بھی وہی پرانا رہا کہ کبھی تو دادی کو پرانی چیزیں ازبر ہوں گی۔ کبھی تو وہ رٹے رٹائے سوال پوچھنا بند کریں گی۔

"ہونہہ۔۔۔ ڈراما کرتی ہیں کہ یادداشت کمزور ہے سب بھول جاتی ہوں۔" سعدیہ جل کر سوچتی۔

"سب تنگ کرنے کے طریقے ہیں بس۔۔۔" اور سعدیہ کو وہ بھلا تنگ بھی کہاں کرتی تھیں وہ تو جان جلاتی تھیں اس کی۔

"ہے سعدیہ۔۔۔! اتنا بڑا صحن تھا کہ چار لڑکیاں تیرے جتنی اکٹھی جھاڑو لگانا شروع کرتیں تو بھی پورا ایک گھنٹہ لگ جاتا۔۔۔ پھر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔۔۔ چارپائیاں بچھتیں۔۔۔ بستر بچھتے۔۔۔ سفید سفید چادریں اور سرخ گول تکیے۔۔۔ چالیس چارپائیاں ایک لائن میں بچھ جاتی تھیں۔ بڑے بڑے سرخ پایوں والی۔۔۔ دس تو میرے جہیز کی ہی تھیں۔۔۔" دادی بولتیں وہ کھیاں اڑاتی۔

"ہٹاؤ بھئی۔ کیا کیا ہوا ہجرت سے پہلے۔۔۔ کیا کیا کرتے تھے لوگ۔۔۔ چالیس چھوڑ اسی چارپائیاں بچھائیں۔۔۔ اور چھڑکاؤ کیا، چاہے روز فرش دھوتے ہوں۔۔۔ سیلاب لے آتے ہوں۔ جب دل کرے گا ایسے وقتوں میں جانے کو تو پڑھ لیں گے خدیجہ مستور اور الطاف فاطمہ کے ناول۔۔۔ بھری پڑی ہے مارکیٹ۔"

لیکن دادی تو یوں سناتی تھیں کہ جیسے وہ خود تاریخ کی چشم دید گواہ تھیں۔۔۔ بات کرتے کرتے ماضی میں ہی جا بستیں۔

"میری دیورانی، وہاں سے تو موسل نہیں پکڑا جاتا تھا ٹھیک سے۔"

"اور آپ کی ساس انگلی منہ میں دے کر حیران ہوئی تھی۔" سعدیہ یاد کرواتی کہ یہ قصہ پہلے بھی۔۔۔ بلکہ نجانے کتنی بار سنایا جا چکا ہے لیکن دادی سمجھ کر نہ دیتیں، یادداشت کمزور تھی نا ان کی۔۔۔ ہونہہ ڈراما کرتی تھیں بس۔۔۔ یادداشت کمزور ہوتی تو اتنے پرانے قصے یاد رہتے ان کو۔

"میرا جیٹھ تو یہ دیکھ کر حیران کہ میں من گندم پیس لوں چکی میں راتوں رات۔۔۔ اور میری ساس خوش ہو کر

دہی کا بڑا پیالا دے، مجھ کو ناشتے میں۔۔۔ دو کلو دودھ الگ، جتنا گھر کے باقی مل کر بھی نہ پیتے تھے۔"

ان کی ساس اب زندہ ہوتی تو پوچھتی میں کہ اتنی ہیوی خوراک دینے کی ضرورت ہی کیا تھی آخر۔۔۔ جب ہی تو زرین اب تک رکنے کا نام نہیں لے رہی۔ سعدیہ سوچ کر تڑپتی رہ جاتی۔

"پھر سب ختم ہو گیا سعدیہ ایک دن۔۔۔ سب ختم ہو گیا۔" دادی اداس ہو جاتیں وہ کیسے سمجھاتی کہ اس کے لیے تو اسی دن سے شروع ہوا یہ سب کچھ۔

اس کی رائٹنگ ٹیبل دادی کے پلنگ کے ساتھ تھی۔ دادی اسے دیکھ دیکھ کر بولتی جاتیں اور وہ لکھتی جاتی۔ دادی کا دل بہلا رہتا اور اس کا دم گھٹتا رہتا۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہو پاتا۔ صفحے کالے کر کر کے وہ گول کرتی جاتی۔ باسکٹ بھر جاتی۔ کانوں میں ٹھنسی روئی کے باعث درد ہونے لگتا۔ لوئیں سرخ ہو جاتیں لیکن دادی کی زنبیل باتوں کے خزانے سے خالی نہ ہو پاتی۔

بڑے قلابے ملائے۔ عقل کے گھوڑے دوڑائے' جیومیٹری پرکار لے کر بھی اندازہ لگایا گیا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ رائٹنگ ٹیبل یہاں سے سرکائی جائے تو کہاں لگائی جائے۔ کمرے کے دو کونے ٹرنکوں سے اٹے تھے۔ دو پلنگوں کے درمیان اس کی ٹیبل تھی اور سامنے کمرے کا دروازہ۔

سعدیہ نے پیسہ پیسہ جوڑا۔۔۔ کالج میں نان' سموسہ کھانا بھی بڑے دنوں ترک کیے رکھا۔ اور پیسے اکٹھے کر کے ایک ایم پی تھری خریدلی' ہینڈ فری کانوں میں لگائی۔ مدھم آواز میں گانے بجے۔۔۔ اور اس دن جیسے وہ جنت میں آ گئی۔ ایک رات میں ہی بچوں کی دو کہانیاں لکھ لیں۔

دادی بولتی رہیں۔۔۔ ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے بلایا بھی' لیکن وہ کمال ڈھٹائی سے دادی کی اس چھیڑ چھاڑ کو نظر انداز کرتی رہی۔

دو دن بعد غسل خانے سے واپس آ رہی تھی کہ دیکھا وہ لوبیار دادی اپنے کانوں میں ٹھونسے بیٹھی ہیں۔

"اس میں نور جہاں کے گانے نہیں لگتے سعدیہ۔ بے بول؟"

پلک جھپکتے میں سارا غصہ کافور ہو گیا۔ لو یہ خیال اسے کیوں نہ آیا بھلا۔

اس نے نور جہاں' فریدہ خانم' خورشید بیگم'۔ سب کے گانے بھروالیے ایم پی تھری میں اور سوچنے لگی۔

"رلو چاہے فقیر کو دے ایک دو روپے اب تو کام دکھائیں گے ہی۔"

لیکن ہائے ری قسمت۔۔۔ دادی کے اندر ایک مغنیہ بھی قید تھی' وہ بھی شام چوراسی گھرانے کی اس بات کا عقدہ بھی تب ہی کھلا پھر۔

سنتے سنتے دادی خود اتنی اونچی آواز میں گانا شروع ہو جاتیں کہ ایم پی تھری کی ترسیل اپنی کم حیثیتی پر خاموش ماتم شروع کر دیتی۔ سعدیہ لکھتے لکھتے لڑکھڑا جاتی۔۔۔ کبھی اپنے کسی کردار کو "سونے کی تلہڑی" پہنا دیتی' کبھی کسی لڑکی کی تعریف لکھتے وقت "جوانی اس کی بجلی اور طوفان اس کا نخرو تھا" لکھ دیتی۔۔۔ پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ جب اس نے بچوں کی ایک سادہ سی کہانی کا عنوان "او دلبر جانیاں۔۔۔" لکھ دیا بس پھر کیا۔۔۔

آر پار ہوا تیر نظر۔۔۔

ہفتے بھر بعد اسے ایڈیٹر کا خط مل گیا۔ سعدیہ کی تین چار ایسی ہی بہکی بہکی کہانیاں انہیں اکٹھی موصول ہو گئی تھیں۔ خط میں کی گئی سادہ اور نرم لفظوں کی نصیحت بھی اسے تپا گئی۔۔۔ ایم پی تھری دیوار سے مار کر اس نے توڑ ڈالی اور کالج کے فاقوں پر اسے رونا آگیا۔

"اے سعدیہ! وہ کانوں میں لگانے والا تیرا چھوٹا سا ریڈیو کہاں گیا بچی؟"

"جہنم میں گیا وہ ریڈیو۔۔۔" سعدیہ چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن چیخ نہ سکی۔ سامنے سے ابا جی گزر رہے تھے۔

"دادی! وہ خراب ہو گیا۔" بڑے ضبط سے اس نے دانت پیس کر کہا۔

"تو صحیح کروا لیتی۔۔۔ ذرا دل لگا رہتا تھا۔"

"اور میرا دل۔۔۔ جو جلا رہتا تھا۔۔۔ اس کی نہ سوچیں۔"

دادی نے اسے صحیح کروانے کے پیسے بھی دیے لیکن وہ آمیں' بائیں' شائیں کر کے ٹال گئی۔ ان پیسوں سے اس نے دس سموسے' دس پیٹیز اور دس کولڈ ڈرنک خرید کر اپنی کالج کی سہیلیوں کو کھلایا پلایا اور اپنے اوپر لگا کنجوس مکھی چوس کا لیبل اتروا لیا۔ سارے زخم تھوڑے بہت مندمل ہوئے۔ گھر آکر اس نے روئی کو دیسی گھی میں تر کیا۔ دونوں کانوں میں دھنسا اور اوپر سے کس کے مفلر باندھ لیا۔ لو اب چاہے ڈھول پیٹ لو۔ سعدیہ نہ تھرکنے کی۔

آج کل تو ویسے بھی وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔۔۔ ایک کردار تخلیق کرنے کی اسائنمنٹ ملی تھی اسے اقبال اکادمی کی طرف سے۔ اس کردار نے ملکی سطح پر ہونے والے مقابلے میں شرکت کرنی تھی۔ سعدیہ سوچ سوچ کر۔۔۔ تخلیق کر کر کے تھک گئی۔ ذرا جو سپر مین' اسپائیڈر مین سے آگے بڑھتی تو دادی کھینچ کھانچ کر اسے اپنے گاؤں کے چوہدری' نمبردار تک پیچھے لے جاتیں۔ وہ جھنجلائی ہوئی تھی ان دنوں۔

بیٹ مین' آئرن مین' ہولو مین۔۔۔ انگریزوں نے تو کسی اور کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔ سعدیہ نے بھی پھر ایسے ذہن کے خلا وسیع میدان بھر لیے پھر ایسے ویسی معلومات سے۔۔۔ کار مین سوچا۔۔۔ پھر فائر مین۔۔۔ شیر مین' گلہری مین' ہاتھی مین۔۔۔ آخر میں اسٹون مین پر بس ذہن اٹک ہی گیا۔۔۔ خود کو خوب خوب داد دی۔ ہاں یہ ٹھیک تھا۔ اسٹون مین۔۔۔ جو برا کام کرے اسے کھینچ کر پتھر دے مارے۔۔۔ آج کل وہ اسی کردار کو تخلیق کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

اسائنمنٹ بھجوانے میں دو ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ اور اس کا ابھی آدھا کام بھی مکمل نہ ہوا تھا۔ پانچ اسکیچ اس نے تیار کر لیے تھے۔ دس مزید تیار کرنے والے بھی باقی تھے۔۔۔ جامع کہانی الگ سے۔۔۔ رنگوں اور لفظوں سے وہ نئی دنیا بنا رہی تھی۔۔۔ تخلیقی' فرضی دنیا۔ اب یہ کردار ملکی و کیا دنیاوی سطح پر بھی ہر ایوارڈ

جیت سکتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ خود کو سراہنے لگی۔
دادی دو ایک دن تو برداشت کیے بیٹھی رہیں لیکن تیسرے دن انھوں نے سعدیہ کے کان سے مفلر کھینچ کر اتار دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔۔۔ اور دادی کے ماضی کے چلغوزے' مونگ پھلیاں' رضائیاں' کالی اندھیری

راتیں۔۔۔ تری کی بھیانک آواز' دادا ابا کی کہانیاں' پنجیری' مچھلی کا شوربا' پنیاں' لڈو اور نجانے کیا کیا باہر اہل پڑنے کو تیار تھا۔ سعدیہ اپنے ہر کام کو فائنل ٹچ دے رہی تھی۔ دادی کی اس حرکت پر تڑپ کر اٹھی۔ جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔
"صحن میں چولہا جلا کر روز کی روز مونگ پھلیاں بھونتے۔۔۔" دادی نے شروعات کی۔
"چپ دادی۔۔۔" سعدیہ نے چلا کر ٹوکا۔ ابا کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ آج اسے اپنی آواز پر کوئی پابندی لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ہٹی کٹی دادی نے سہم کر سعدیہ کا یہ روپ دیکھا۔
"بس بہت ہو گیا۔۔۔" وہ مزید بلند تر چلائی۔
"یہ لو ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے۔۔۔ نہیں دلچسپی مجھے تواڑی پلنگوں میں' چکی کے چلنے میں' گاؤں کے وڈیرے' سردیوں کی سوغاتوں میں۔۔۔" وہ نخوت سے مزید یاد کرنے لگی۔
"لحافوں میں پروئے موتیوں میں۔۔۔ بیڈ شیٹ کی کڑھائیوں میں' مہندی کا رنگ تیز کرنے کے ٹوٹکوں میں۔۔۔"
وہ بولتی چلی گئی۔ آواز تھمنے میں نہ آئی۔ دادی ساکت ہو گئیں۔ پلکوں کو جھپکنا بھول گئیں۔ جیسے ان کے ماضی کو کوئی گالی دے رہا ہو۔
"کام کر رہی ہوں میں بہت ضروری۔۔۔ آگے نکل آئی ہے دنیا بہت۔۔۔ بخش دیں مجھے خدا کے لیے۔۔۔ چھوڑ دیں میرا پیچھا۔۔۔ نہیں لینا دینا مجھے ہجرت کی بھوک پیاس' نفسا نفسی سے۔۔۔ اور ہو گا بھی تو بھری پڑی ہیں کتابیں۔۔۔ پڑھ لوں گی ان کو۔۔۔"
بول بول کر وہ تھک گئی تو ہانپتی دادی کے چہرے کو دیکھے

کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب کے کانوں میں روئی دینے کی نوبت بھی نہ آئی۔
رات دیر گئے تک۔ وہ کام کرتی رہی۔ سارے کاغذات کو پن اپ کر رہی تھی' جب ایک شرمندگی کی لہر نے اسے آن گھیرا۔۔۔ ٹیڑھی نظروں سے دادی کو دیکھا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی تھیں۔ دل میں اک ہوک سی

اٹھی۔
"کیا تھا جو سن لیتی۔۔۔ اکیلی تو ہیں بے چاری۔"
"دادی! لحاف لے لو۔۔۔ سردی لگ جائے گی۔"
اس نے چور آواز سے۔ کہا۔ دادی نے جنبش تک نہ کی۔
"دادی۔۔۔!" دادی' دادی پکارتی وہ قریب تر ہو گئی۔
چپ پھر ایسی لگی کہ سعدیہ بول بول کر اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر تھک گئی۔ لیکن دادی کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو سکی۔ اماں کو بلانے وہ دیوانہ وار دوسرے کمرے کی طرف بھاگی۔
رات کا اندھیرا مزید بڑھ گیا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر سعدیہ کا ایک نیا کردار تخلیق ہو چکا تھا اور پلنگ پر ایک جیتے جاگتے کردار نے ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لی تھی۔

☆

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زارا اور اریبہ۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ، الہڑ سی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں، مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ایبہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے، جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ایبہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے، اور دوبارہ نئے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ایبہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً آ جاتے ہیں اور ایبہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ایبہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی









دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے 'مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر حسن کے نکاح میں امتیاز احمد 'ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب 'ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے 'ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب 'معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے نہ اکیڈمی کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور اکیڈمی چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں 'زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز 'ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون 'معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی 'ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم 'ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے 'جہاں معیز اور عون 'بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد 'ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے پنا اپنا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے 'مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کر دیتی ہے 'مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملتے ہی ابیہا 'ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے 'مگر ثانیہ 'ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ایبہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کرکے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورونوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد بنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہی سمجھ رہی ہیں کہ ایبہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایبہا کا گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ایبہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن شمیم ایک اچھی لڑکی ہے۔ وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کرکے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس ورانا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ایبہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ایبہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ایبہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آکر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ایبہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ایبہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

۱۶
سولہویں قسط

معیز کی بات اس قدر غیر متوقع تھی کہ سفینہ بیگم ششدر سی اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ انہیں جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ پھر جب ان کے ذہن نے اس بات کو سمجھا تو جھرجھری سی لے کر بیدار ہوئیں اور جلبلا کر بولیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"مگر اس گھر میں ایسے ہی حالات چلتے رہے تو وہ دن دور نہیں ماما!"

معیز کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تم نے اس لڑکی کی زبان نہیں سنی معیز۔ اس کی ذہنی اڑان نہیں دیکھی...؟"

وہ تڑپ کر پوچھنے لگیں۔

"آپ وہاں کیوں گئیں؟ اسے اس اسٹیج تک کیوں لائیں کہ وہ اپنی پوزیشن کے بارے میں کوئی "دعوا"

کر سکے؟"

معیز نے رسان سے پوچھا تو لحہ بھر کو وہ چپ سی ہو گئیں۔ پھر تیز لہجے میں بولیں۔

"اس نے یہاں آکے گھر کے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"وہ اس گھر کی نوکرانی نہیں ہے ماما!" اس نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"مہو بھی نہیں ہے معیز احمد۔"

سفینہ بیگم نے تیزی سے جتانے والے انداز میں کہا۔

"نوکر وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی سے آکر نوکری کی درخواست کرتا ہے۔ آپ کسی کو زبردستی اپنا ملازم نہیں بنا سکتیں۔" معیز بے حد تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے۔ میں یونہی مہینے کا دس ہزار اس کے ہاتھ میں تھماؤں گی؟"

وہ جلبلائیں تو معیز ان کی بات سمجھ کر دنگ رہ گیا۔ پھر گویا ہوش میں آتے ہوئے ناگواری سے بولا۔

"فار گاڈ سیک ماما! وہ اس کا حق ہیں۔ اور اس کا حق دینے کے لیے آپ اسے استعمال نہیں کر سکتیں۔"

"حق، حق، حق۔" وہ یک لخت چیخیں اور ہاتھ مار کر سامنے رکھا کپ پرچ پرے گرا دیا۔

"ایک تم اور دوسرا تمہارا باپ۔ اس پر بھی دوسروں کا حق تھا اور تم پر بھی۔۔۔ میں تو کسی کی سگی ہوں ہی نہیں نا۔" ان کے انداز پر معیز دم بخود رہ گیا۔

"ساری عمر تمہارا باپ اس حرافہ کی یادوں میں ڈوبا میرا حق مارتا رہا اور اب اس کی جگہ اس کی بیٹی آ بیٹھی ہے تمہیں مجھ سے چھیننے کے لیے۔"

ابراز اپنے کمرے سے ننگے پاؤں بھاگتا آیا تھا۔ وہ یقیناً "ماں کی آواز سے بیدار ہوا تھا۔ بکھرے بال اور آنکھوں میں نیند کی لالی اس بات کی چغلی کھا رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔۔۔؟" وہ پریشان سا ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ سفینہ بیگم ہانپتی ہوئی گہری سانسیں لے رہی تھیں اور معیز۔۔۔ ماں کی بدگمانی پر خفا سا ہو کر کرسی دھکیلتا اٹھ کر چلا گیا۔

ابراز کرسی گھسیٹ کر ماں کے نزدیک بیٹھا اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"کیا بات ہوئی ہے ماما؟"

"اپنے بھائی سے پوچھتے نا۔ وہ تو ایسے بھاگتا ہے اس موضوع سے جیسے۔۔۔" وہ پھٹ پڑنے والے انداز میں بولیں۔

"کس موضوع سے۔۔۔ مجھے بھی تو بتائیں۔" ابراز نے پیار سے ان کے کاندھوں کو سہلایا۔

"اس لڑکی کے پیچھے اندھا ہو رہا ہے۔ باپ نے مرتے وقت پھانسی کا حکم دے دیا تھا اور اب یہ اس پھندے میں اپنی گردن فٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

وہ تلخی سے بولیں تو ابراز چونکا۔

"کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟"

"وہی۔۔۔ جسے باپ کے اشارے پہ بیاہ کے لے آیا ہے اور ماں کی منتوں کے بعد بھی طلاق نہیں دے رہا۔"

وہ سلگیں تو ابراز نے گہری سانس لی۔ پھر رسان سے بولا۔

"اس معاملے کو ان ہی پر چھوڑ دیں ماما! اگر واقعی وہ "بیاہ" کے لائے ہوتے تو ٹیکسی میں نہ لے جاتے۔ اس معاملے کی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز کو وہی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اپنے طور سے حل کرنے دیں انہیں۔"

"دس ہزار مہینے کا ڈال رہا ہے اسے اور وہ بھی بنا ہڈیاں گھسائے ہمارے حق میں سے۔"

انہوں نے دانت پیسے۔ پھر حقارت سے پُر لہجے میں بولیں۔

"اچھا بھلا کام۔ رکھ لیا تھا میں نے اسے۔ نذیراں کے ساتھ محنت کی کمائی لیتی تو اچھی بھی لگتی۔ یوں بد حراموں کی طرح ہمارے ٹکڑوں پہ پڑی ہے۔"

ایراز کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس خوب صورت سی ملازمہ کا چہرہ یک دم روشن سا ہو گیا۔

اس نے جھرجھری سی لے کر بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"وہ... وہ ملازمہ... جس کو میں خوب صورت کہہ رہا تھا...؟"

"دیکھنے میں سانپ بھی بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ رنگوں سے سجے۔ مگر اپنے اندر زہر چھپائے ہوتے ہیں۔" وہ نخوت سے بولیں۔

مگر ایراز ابھی تک صدمے کی سی کیفیت میں تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا ماما! جو بھی ہو۔ مگر فی الحال وہ بھائی کے نکاح میں ہے اور آپ نے اسے نذیراں کی طرح ملازمہ بنا لیا؟"

اس کے تاسف پر سفینہ کو اور غصہ آیا۔

"تو کیا کروں۔ تمہارے اس لاڈلے بھائی کے کمرے میں ملکہ بنا کے بٹھا دوں اسے؟"

مزید کچھ کہنا بے سود جان کر گہری سانس بھرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سفینہ بیگم نے گھور کے اسے دیکھا۔

"جو رشتہ جس عزت اور مقام کا اہل ہو اسے وہ ملنا چاہیے ماما! انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے ظرف سے نیچے نہیں بلکہ اوپر آکے لوگوں سے برتاؤ کرے۔"

وہ ایسی۔ نرمی سے بولا جو سفینہ بیگم کے نہیں۔ امتیاز احمد کے لب و لہجے کا خاصہ تھی۔

سفینہ بیگم نے حقارت سے سر جھٹکا۔

امتیاز احمد کی ستائیس برس کی صحبت ان کی فطرت کو نہ بدل سکی تھی تو یہ کل کے بچے کیا اثر ڈالتے۔

بہر حال ایراز کو بہت تاسف ہوا تھا اور وہ اس معاملے پہ معیز سے بات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔



وہ جاگ چکا تھا مگر اس کے باوجود بستر سے نہیں اٹھا تھا۔ ابا نے بھی سفر کی تھکن کا خیال کر کے اسے آواز نہیں دی اور خود ہی ریسٹورنٹ چلے گئے۔

بھابھی شاید ام والی سے ڈسٹنگ کروا رہی تھیں۔ امی ہی دل کے ہاتھوں مجبور۔ تین مرتبہ اسے دیکھ کے جا چکی تھیں۔ ان کے لاڈلے نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔ مگر تینوں بار ہی اسے سوتا پایا۔ ابھی چوتھی بار دروازہ کھلا تو کسل مندی سے کمبل بانہوں میں دبائے لیٹے عون نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اطمینان کی سانس بھرتی امی اندر چلی آئیں۔

"شکر ہے اللہ کا۔ تمہاری نیند بھی پوری ہوئی۔" عون اٹھ بیٹھا۔ امی اس کے بستر کے کنارے ٹک گئیں۔

"اب بتاؤ۔ شادی کیسی رہی اور سب لوگ کیسے ملے؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔ رات وہ لیٹ پہنچا تھا تو سب تفصیل جاننا ابھی باقی تھی۔

"ویسی ہی۔ جیسی سب شادیاں ہوتی ہیں اور باقی سب لوگ بھی ٹھیک ہی ملے۔"

وہ سستی سے بولا تو امی نے اسے گھور کے دیکھا۔

"یہ کیسا جواب ہوا...؟"

"آپ نے سوال ہی ایسا پوچھا تھا۔" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے' کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟" امی نے "اندرون خانہ" معاملات' جاننا چاہے مگر وہ بھی عون عباس تھا۔ مجال تھی کہ کسی بات کا سیدھا جواب دے دیتا۔

"بہت کچھ کہا۔ آپ کس کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہیں؟" امی بے دم ری ہار کر بولیں۔

"اچھا۔ ثانیہ کا ہی بتادو۔ اس نے شادی انجوائے کی؟" عون سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ سوال تو آپ اسی سے کیجئے۔ وہ بہتر طور پر جواب دے سکتی ہے آپ کو۔"

"تو پھر تم سے کیا پوچھوں میں۔۔۔؟"

وہ چڑ کر بولیں تو عون ہنسنے لگا۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہارے تایا جان کو اعتراض تو نہیں ہوا ہمارے شادی میں نہ شریک ہو سکنے پر؟"

"آپ کی بہو رانی تھی نا وہاں سب کے دانت کھٹے کرنے والی۔" عون نے طنز کیا تو وہ تاسف سے بولیں۔

"تم کبھی اسے ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتے عون! اتنی ٹھنڈی میٹھی طبیعت کی ہے میری بہو۔" عون نے آہ بھر کے اوپر دیکھا۔

"کاش۔"

"وہاں بھی اس سے لڑتے ہی رہے ہو گے تم۔" امی کو شک گزرا تو وہ خفا ہونے لگا۔

"یہاں کون سا میں تلوار لے کر اس کے پیچھے پڑا تھا جو وہاں بھی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔"

امی کو ہنسی آگئی۔ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا چلو۔ نہا دھو کے فریش ہو جاؤ۔ تب دماغ صحیح سے کام کرے گا تمہارا اور کچھ تفصیل بتا سکو گے۔"

وہ مسکرا دیا۔ امی کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ ناشتے کے دوران اپنی اور ثانی کی کھٹ پٹ کاٹ کر امی اور بھابھی کو شادی کی تفصیل سنا رہا تھا۔

"اور۔۔۔ ثانی کے ساتھ سفر کیسا رہا؟" امی کے اٹھتے ہی بھابھی نے "ثانی" پہ زور دیتے ہوئے کہا تو عون نے مذاق اڑانے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

"ہنہ۔ آپ کو تو جیسے میں بتا ہی دوں گا نا۔"

"اوہو۔ لفٹ نہیں کرائی ہو گی اس رضیہ سلطانہ نے' جب ہی۔۔۔ بڑے' آئے تم۔" بھابھی نے جواباً" اس کا مذاق اڑایا۔

ثانی کی ہٹ دھرمی سے سب ہی واقف تھے۔ یہ بات عون بھی جانتا تھا' مگر "سمجھ" تو اسے اب آنا شروع ہوئی تھی۔

"اچھا۔ آپ یہی سوچ لیں اور خوش ہو جائیں۔"

عون نے اطمینان سے کہتے ان کے تجسس کو اور ہوا دی۔

"چلو۔ دیکھ لیں گے۔ ابا نے کہہ دیا ہے دو ماہ بعد ثانیہ کی رخصتی کروالیں گے۔ دیکھتے ہیں اب وہ محترمہ کیا سیاسی بیان دیتی ہیں۔ پھر پتا چلے گا یہ سفر کتنا "رومانٹک" رہا تھا۔"

وہ بھی اسی کی بھابھی تھیں' دھماکا کرتے ہوئے بولیں تو چند لمحوں تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہ گیا۔

بھابھی نے شرارت سے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ چونکا' پھر انہیں ہنستے دیکھ کر خجل سا ہو گیا۔

"تم نے شاید یہی سنا ہے کہ ابا رخصتی کی بات کر رہے ہیں' لیکن یہ نہیں سنا کہ اب فیصلہ ثانی کے ہاتھ میں ہو گا۔" بھابھی نے جتایا تھا۔



ٹینشن نہ لو۔ گوراپن چاہیے لو
نساء لو
ایکسٹرا گلوئنگ
وائٹننگ کریم
EXTRA GLOWING
EXTRA GLOWING
EXTRA GLOWING
TREND

وہ ٹیبل پہ پڑا جار اٹھا کر کھول کر زیتون نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے اطمینان سے بولا۔
"بہت اچھی بات ہے۔ اپنی زندگی کا فیصلہ اسے خود ہی کرنا چاہیے۔" بھابھی نے اسے گھورا۔
"اور تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
"یہی کہ اب فیصلہ ثانیہ کرے گی۔ میں اس سے مزید کوئی فیور مانگوں گا اور نہ وقت۔"
وہ سنجیدہ تھا۔ پھر فوراً" ہی اٹھ گیا۔
"میں ذرا ریسٹورنٹ کا چکر لگالوں۔ ابا تو ہفتے بھر میں گھن چکر بن گئے ہوں گے۔"
بھابھی نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئیں۔



ثانیہ بہت پرجوش سی اس کے پاس آئی تو اس کے پاس ایمہا کے لیے خوش خبری تھی۔
"تم پہلی ٹیں سارے پیپرز دے سکتی ہو ایمہا!" ایمہا کا دل کھل اٹھا۔
"دیکھا' صرف پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو سفر اور کامیابی ان شاءاللہ۔"
ثانیہ اس سے پوچھ پوچھ کے فارم پر کر رہی تھی۔ ایک پرائیویٹ کالج میں سفارش سے بات بن گئی تھی۔
ایمہا نے ایک قدم اٹھایا تھا تو ثانیہ اس کی راہ میں سے مقدور بھر کانٹے اٹھا لینا چاہتی تھی تاکہ وہ گھبرا کر واپسی کی راہ نہ پکڑ لے۔
"مگر۔ میری کوئی تیاری نہیں ہے ایگزیمز کی۔" ایمہا ہکلائی۔
"بس۔ اب نالائق اسٹوڈنٹس والے ریزن مت دینا۔" ثانیہ نے اسے جھاڑا اور اسے یاد دلایا۔
"تمہاری ساری تیاری تھی۔ فیس کی عدم ادائی کی وجہ سے تم ایگزیمز نہیں دے پائیں۔ ایک دفعہ سب دہراؤ گی تو یاد ہو جائے گا۔"
ایمہا خاموش رہی۔ بیتے وقت کی تکلیف پھر اس کے ذہن پر حاوی ہونے لگی تھی۔
"پوزیشن نہ سہی ایمہا! اچھے مارکس لے کر پاس ہو جاؤ گی۔ ڈگری مل جائے گی بی اے کی۔"
ثانیہ نے سنجیدگی سے کہا' اس نے گہری سانس لے کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ثانیہ کو دیکھا تھا۔



عون ریسٹورنٹ پہنچا تو ابا اس کے حوالے سب کچھ کر کے گھر چلے گئے۔ عون سارا ڈیٹا رجسٹر سے لیپ ٹاپ پہ منتقل کرنے لگا۔ اس کی غیر موجودگی میں ابا کا سارا حساب کتاب رجسٹر پر ہی ہوتا تھا۔
تب ہی "ہا" وسٹر بجانے پر عون نے چونک کر نظر اٹھائی۔ "ہائے بڈی۔"
معیز کو بشاشت سے مسکراتے دیکھ کر وہ اٹھا اور گرم جوشی سے اسے گلے لگا' اور اسے ساتھ لیے قدرے سائیڈ پر ایک ٹیبل پہ آگیا۔ خوش گپیوں کے دوران ویٹر نے کافی بھی لا کر رکھ دی۔
"کراچی میں بھی سردی آ ہی گئی ہے۔ اسلام آباد کی سناؤ؟" معیز نے بھاپ اڑاتی کافی کا مگ اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔
"پنجاب کی سردی کا تو پوچھو ہی مت۔ خوب صورت اور رومانٹک۔"
"ہوں۔ رومانٹک۔" معیز کھل کے ہنسا۔
بے اختیار ہی عون کے ذہن پر ثانیہ کی بے اعتنائی اور بدتمیز رویے لہرا گئے تو وہ پہلو بدل کے رہ گیا۔
"تم سناؤ۔ کیا تبدیلی آئی ہے حالات میں۔؟"

عون نے فی الفور موضوع بدلا تو معیز کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔ اس نے مختصراً" سارا احوال سنایا تو عون کو تاسف نے گھیر لیا۔

"تم نے وہ شعر تو سنا ہو گا معیز! جس کا مصرعہ ہے۔

ع نہ چل سکو تو بچھڑ جاؤ دوستوں کی طرح

وہ قدرے توقف کے بعد بولا تو معیز اسے دیکھنے لگا۔

"مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ تم نے اس رشتے میں بچھڑنا طے کر ہی لیا ہے تو اس قدر بے رخی سے کیوں معیز ۔۔۔؟"

عون نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو معیز تپ گیا۔

"تو کیا کروں۔۔۔ سر آنکھوں پہ بٹھاؤں۔ جب طے ہی ہے کہ بچھڑ جانا ہے تو۔۔؟"

"وہی تو میرے یار!" عون سابقہ انداز میں بولا۔

"بچھڑنا دوستوں جیسا بھی تو ہو سکتا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا کہ رو رو کے جینے سے ہنس کے مرنا بہتر ہوتا ہے؟"

معیز خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"جو بات کسی کو غصے اور نفرت سے سمجھ میں نہیں آتی وہی بات دوستی اور نرم لہجے سے سمجھ میں آجاتی ہے معیز اور اثمال بھی صحیح رہتے ہیں۔"

عون نے نرم لہجے میں کہا تو معیز نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنا مگ اٹھا لیا اور بے تاثر انداز میں بولا۔

"کافی ٹھنڈی ہو جائے تو مزا نہیں دیتی۔"

"زندگی بھی کافی ہی کی طرح ہے معیز! جذبات کی گرمی سے عاری ٹھنڈی ہو جائے تو مزا نہیں دیتی۔"

عون نے ذو معنی انداز میں کہا مگر وہ خاموشی سے کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے شیشے کی دیوار کے پار دیکھتا رہا مگر جب ان دونوں نے تقریباً" اکٹھے ہی کافی ختم کرلی تو خالی مگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے معیز نے عون کی طرف دیکھتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔

"میرے خیال میں تم صحیح کہہ رہے ہو۔ میں اس پہ سوچوں گا۔"

عون نے بے اختیار اوپر دیکھتے ہوئے شکرانہ انداز میں چہرے پہ دونوں ہاتھ پھیرے تو وہ مسکرا دیا۔



اس نے کتنی ہی دفعہ کال کرنے کے لیے نمبر ملایا مگر ہر بار پریس کرنے سے پہلے وہ چھوڑ دیتی۔

اس کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی کہ وہ کال کر کے عون سے بات کرتی۔ بدتمیزی کرنا کتنا آسان اور اس کی معافی مانگنا کتنا مشکل ہے نا۔۔؟

ایسے ہی جیسے گناہ کا راستہ آسان اور نیکی کا مشکل۔

خالہ جان اس کے کمرے میں آئیں تو وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ موبائل ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور چہرے پہ پریشانی کا راج تھا۔ وہ آگے بڑھ کے بیڈ پہ ٹک گئیں مگر ثانیہ ان پہ توجہ دیے بغیر ٹہلتی رہی تو وہ اکتا کر بولیں۔

"تمہارا پیٹرول ختم ہو گا تو تم بیٹھو گی؟"

ثانیہ نے رک کر بے بسی سے انہیں دیکھا۔ پھر ان کے سامنے آبیٹھی۔

"کیا بات ہے۔ اتنی بری شکل بنا کے کیوں چکرا رہی ہو؟"

"شکل ہی ایسی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"خیر۔ شکل تو اچھی خاصی ہے۔ تمہیں شوق ہے منیبا کے پھرنے کا۔"
وہ آرام سے طنز کر رہی تھیں۔ ثانیہ نے انہیں ہلکا سا گھور کے دیکھا۔
"پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ آپ کو شادی کے لیے میرے لیے اتنے فضول ڈرامے لینے کی کیا ضرورت تھی؟"
"اچھا بس۔ ذرا سی اچھی لگ گئیں تو کوئی قیامت نہیں آگئی۔"
وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔
"عون سے بات ہوئی۔؟ جب سے آیا ہے ادھر کا راستہ ہی بھول گیا ہے۔"
خالہ جان نے بغور اسے دیکھا تو ثانیہ نے نظر چرائی۔
"تو یہ آپ اس سے پوچھیں نا۔ مجھے کیا پتا۔"
"ہوں۔" انہوں نے جانچتی نظروں سے ثانیہ کو دیکھا۔ وہ ہلکا سا نروس ہوئی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟"
"بھائی صاحب رخصتی کی بات کر رہے تھے۔ تمہاری۔" ثانیہ کے دل میں اتھل پتھل سی ہوئی۔ برافروختہ ہو کر خالہ جان کو دیکھا۔
"اب جیسا تم کہو۔"
"میں کیا کہوں۔ جو بڑوں کا فیصلہ ہو۔ اور پہلے کون سا مجھ سے پوچھ کے۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔
"تمہیں پتا ہے بھائی صاحب! تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہونے دیں گے۔ تمہیں ہی اعتراض تھا اب اس رشتے پر۔"
خالہ جان نے اسے جتایا۔ ثانیہ لحہ بھر کو ساکت ہوئی۔ پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔
"مگر میں چاہتی ہوں کہ اب کی بار فیصلہ عون کرے۔" اس کی بات اتنی ناقابل یقین تھی کہ خالہ جان بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
"میں اپنے اور آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ اس بار تو کراچی میں بھی سردی پڑنا شروع ہو گئی ہے۔"
وہ فوراً" ہی بات بدل کر کمرے سے نکل گئی تو آہستہ آہستہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
خالہ جان کو تو اس نے ٹال دیا مگر رات ہوتے ہی پھر سے اس کے اندر عون کو کال کرنے کی خواہش نے زور مارنا شروع کر دیا۔ اس نے سنجیدگی سے اس سارے معاملے کو سوچا تو احساس ہو رہا تھا کہ اب جبکہ سب ان کی آئندہ زندگی کے متعلق سنجیدگی سے فیصلہ کرنے والے تھے تو اسے اپنی بدگمانی اور بدزبانی دونوں ہی کے لیے عون سے "بات" کر لینی چاہیے۔
بات نہیں بلکہ معذرت۔ دماغ نے ڈپٹا۔

وہ اپنے بستر پر آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے عون کا نمبر نکالنے لگی۔ اس بار۔۔۔ وہ بیل جانے اور دھڑکتے دل کے ساتھ دوسری طرف بجنے والی رنگ ٹون سننے لگی۔



"میں ثانیہ کی رخصتی کی بات کرنا چاہ رہا ہوں۔" ابا نے کھانے کی میز پر کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر بات شروع کی تو کھانا کھاتے عون کے ہاتھ ٹھٹکے۔ بھابھی نے شوخی بھرے انداز میں دیور کو دیکھا۔ مگر وہ اب یوں بریانی ختم کر رہا تھا جیسے یہ دنیا کی آخری بریانی کی پلیٹ ہو۔
"بات کیا کرنی ہے۔ چل کے تاریخ طے کر لیتے ہیں بس۔" امی بڑی خوش ہوئی تھیں۔ ابا نے جتانے والے

انداز میں عون کو دیکھا۔
"اس بار تو فیصلہ ثانی کا ہی ہوگا۔ تمہارے لاڈلے نے تو اپنے انکار سنا ہی دیے تھے تمہیں۔"
"بعد میں اپنا فیصلہ بدل بھی تو لیا تھا اس نے۔ اب تو ثانی بھی راضی ہے۔" مگر ابا ہنکارا بھر کے خاموش ہو رہے۔ انہوں نے جو حکم صادر کرنا تھا وہ کر چکے تھے اور اب یقیناً "انہوں نے یہی کرنا تھا۔
مگر امی تو اب "لاڈلے" کا سنجیدہ بلکہ کچھ کچھ لاپروا انداز دیکھ کر جز بز ہو رہی تھیں۔
"اور اگر وہ ابھی بھی اپنی فضول ضد پر اڑی رہی تو کیا ہم اس کی بات مان ہی لیں گے؟"
"تو تمہارے لاڈلے نے کیا بہت اعلا فیصلہ کیا تھا؟ اس کی اپنی زندگی ہے۔ وہ بھی فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔"
امی نے ابا کی بات سن کر پہلو بدلا۔ مگر ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی عون گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بولا۔
"ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب فیصلہ کرنے کی باری ثانیہ کی ہے۔ اگر وہ اب بھی انکار ہی کرتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" امی اور بھابھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔؟" امی نے اسے گھورا تو وہ ہلکے سے مسکرا لیا مگر اندر کی بے چینی کا حال وہ خود ہی جانتا تھا۔
بھابھی نے موقع پا کر اسے گھیرا۔
"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔؟" انہوں نے اسے ڈپٹا۔ "امی بھی پریشان ہو گئی ہیں۔"
"وفوہ۔ پریشانی والی کون سی بات ہے۔ یہ تو پہلے ہی سے طے تھا کہ اب کی بار فیصلہ وہ کرے گی۔"
اس نے خود کو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا مگر وہ بچی نہیں تھیں۔ یونہی اسے گھورتے ہوئے طنز سے بولیں۔
"اور پہلے جب اس نے فیصلہ کیا تب تو بڑا "تائے" تھے تم۔"
"سمجھا کریں نا۔ میں اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتا تھا۔" وہ رازداری سے بولا۔
اب بھلے وہ جتنا بھی خود کو خوش باش اور لاپروا ظاہر کرتا مگر ثانیہ کے لیے اسے بے قرار اور جذباتی دیکھ چکی بھابھی اسے مشکوک نظروں ہی سے دیکھ رہی تھیں۔
"تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تیر تیر کے ہار چکے اور اب خود کو سمندر کے حوالے کر دیا ہو۔"
وہ گہری سانس بھرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر قصداً" مسکرا کر لاپروائی سے بولا۔
"دراصل مجھے ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے۔"
"کیا۔؟" بھابھی نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔
"یہی کہ۔ جہاں مچھلیاں نہ ہوں وہاں چارہ ڈال کے بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

اور اب وہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اور بھابھی کی الجھن بڑھ چکی تھی۔



اور یہ الجھن تو عون عباس کو بھی الجھا رہی تھی۔
اس نے ثانیہ کی بے اعتنائی اور بدتمیزی کو بھگتا تھا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی ثانیہ کی ناراضی کا خیال کرتا تو سوچتا کہ اس کی توجہ اور دوستانہ انداز ثانیہ کی سرد مہری کی برف کو پگھلا دے گا۔
مگر وہ برف ہوتی تو پگھلتی نا۔ وہ تو پتھر تھی۔ سرد پتھر۔ اسے جب جب ثانیہ کے الفاظ یاد آتے اس کا لب و لہجہ اور ارم کے تاثرات۔ تو اسے خود پر افسوس ہوتا۔ شاید وہ غلط جگہ پر اپنے جذبات لٹاتا رہا تھا۔

وہ سرد پتھر تھی۔ برف ہوتی تو جذبات کی گرمی اسے پگھلا کر رکھ دیتی۔
"پتھر گرم ہو کر پگھلتے نہیں۔ ہاں ٹوٹ ضرور جاتے ہیں۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی ثانیہ نہیں چاہتا تھا۔
وہ کپڑے بدل کر بستر پہ آیا تو اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے تولیہ کرسی کی پشت پر پھیلاتے ہوئے موبائل اٹھا کر دیکھا تو انداز سرسری سا تھا۔
مگر اگلے ہی پل وہ پوری طرح متوجہ ہوا۔
ثانیہ کی کال تھی۔
اوہ۔ تو اسے بھی اطلاع مل چکی ہوگی رخصتی والی "خوش خبری" کی۔
عون کے دماغ نے تیزی سے سوچا تو کال اٹینڈ کرنے تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔
"ہیلو۔" وہ بولا تو ثانیہ نے قدرے توقف سے سلام کیا۔ عون کے جواب کے بعد وہ پھر خاموش ہو گئی' جیسے کچھ کہنے کو الفاظ جمع کر رہی ہو۔
"کیسے ہو۔ خالہ جان کہہ رہی تھیں تم نے چکر نہیں لگایا ادھر۔" عون بھی نہیں بولا تو اس نے شاید بات برائے بات شروع کی۔
"ہوں۔ ٹائم نہیں ملا۔ فون کیوں ہے؟" وہ سیدھے سبھاؤ بولا تو لب و لہجہ اس قدر خشک تھا کہ ثانیہ جیسی کھری لڑکی بھی گڑبڑا سی گئی۔
"وہ۔ ایسے ہی۔ کیوں۔ کیا میں تمہیں فون نہیں کر سکتی۔؟"
سنبھلنے تک وہ کچھ برا مان چکی تھی۔
"نہیں' سونے لگا تھا ثانیہ! کیا تمہیں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" عون کے ٹھہرے ہوئے انداز نے اسے بے یقینی میں مبتلا کیا۔ اور یہ عون سے رشتے کے دوران پہلی بار تھا کہ ثانیہ کو رونا آنے لگا۔ وہ لاکھ شہر میں رہتی ہو مگر تھی تو گاؤں کی رہنے والی نا۔ تو اس کے اندر ایک صاف گو دیہاتن بستی تھی۔ وہ دل میں بات رکھنے کی عادی نہ تھی۔ اس کی صاف گوئی منہ پھٹ ہونے کی حد تک تھی مگر پہلی بار اسے عون سے کہنے کو کوئی لفظ نہ ملا۔
"تمہیں شاید کچھ نہیں کہنا' لیکن مجھے کہنا ہے ثانی۔"
عون نے ان چند خاموش لفظوں کو کھوجا تو کئی غلط فہمیوں کو بیچ سمجھ کر دل و ذہن میں بٹھاتے ہوئے اسی قطعیت بھرے انداز میں بولا۔
"تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے۔ میں نے کچھ فیصلہ نہیں دیا۔ تم جو کرنا چاہتی ہو کر لو۔ ان فیکٹ! میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا چکا ہوں۔ میں نے ارم کا نام لے کر تم سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اب گیند تمہاری کورٹ میں ہے۔ تم جو بھی چاہے فیصلہ کرو اور صاف لفظوں میں سب کو بتا دینا۔ مجھے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
اس کے لفظوں میں کوئی لچک نہ تھی۔ ہر لفظ مضبوط اور قطعی تھا۔
ثانیہ کے پاس کچھ نہ بچا۔
نہ کہنے کو۔ اور نہ۔؟
وہ اپنی مرضی کرنے کو آزاد تھی۔
عون نے تھوڑی دیر اس کے جواب کا انتظار کیا مگر دوسری جانب جامد خاموشی تھی۔ اس نے کال کاٹ کر سیل فون بیڈ پہ اچھال دیا اور آئینے کے سامنے آکر بال برش کرنے لگا۔
مگر جھنجلاہٹ آہستہ آہستہ اس پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی۔ بہت کچھ ان چاہا اور ناپسندیدہ ہو جانے کے خیال

نے اس کے ذہن کو پراگندہ کر دیا۔ وہ پلٹا اور آکر بستر پر اوندھے منہ گر سا گیا۔ یہ رات بہت بھاری تھی۔
اپنی جیت یا ہار کو کسی دوسرے کے حوالے کر کے فیصلے کا انتظار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔
وہ بھی اسی کیفیت میں تھا۔



وہ آفس جانے کے لیے نکلا تو ایراز اسے باہر ہی مل گیا۔
"چند منٹ ہوں گے آپ کے پاس بھائی! مجھے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ معیز نے مسکرا کر لان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں سرما کی نرم گرم سی دھوپ میں لان میں استعمال ہونے والی ٹیرس کے بینچ پہ آبیٹھے۔
ایراز نے چند لمحے خاموش رہ کے کچھ سوچا تو معیز نے مذاقاً" پوچھا۔
"کیا بات ہے۔ کہیں دل وِل تو نہیں لگا بیٹھے۔ شادی کا ارادہ ہے؟"
"ارے نہیں۔" وہ جھینپ کر ہنس دیا۔
"تو...؟" معیز نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں آپ کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے پریشان ہوں۔" معیز کی مسکراہٹ سمٹی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا...؟"
"میں نے اس سارے معاملے کو غیر جانب داری سے دیکھا ہے بھائی۔ ابو نے کسی کی زندگی اور عزت کو بچانے کی خاطر آپ کو نیکی کا موقع دیا۔ لیکن وہ نیکی اب ضائع ہو رہی ہے۔" ایراز بے حد سنجیدہ تھا۔
"ٹھیک ہے، آپ اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتے لیکن کم از کم اسے ڈی گریڈ ہونے سے تو بچائیں۔ ماما نے انہیں گھر کی نوکرانی بنا کے رکھا ہوا ہے۔ اس بارے میں ابو کی وصیت آپ سے کچھ نہیں کہتی...؟"
وہ خفا سا تھا۔ معیز کو برا تو لگا مگر بات تو واقعی حقیقت تھی۔
"مجھے بھی نہیں پتا تھا ایراز! لیکن اب میں نے ماما سے بات کر لی ہے۔ وہ لڑکی اب اس گھر کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ ان فیکٹ وہ اپنا گریجویشن کمپلیٹ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"
اپنی طرف سے مدلل جواب دے کر معیز اٹھ کھڑا ہوا تو ایراز نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ اب قدرے مطمئن نظر آتا تھا۔
"میں نہیں چاہتا کہ ہماری فیملی کسی کی بددعاؤں کے حصار میں رہے بھائی! اس لیے سوچا کہ آپ سے کلیئر کر لوں۔"
"ہوں۔" معیز نے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا پھر موضوع ہی بدل دیا۔

"اور تم کب سے جوائن کر رہے ہو۔ اپائنٹمنٹ لیٹر تو آچکا ہے نا تمہارا...؟"
"جی۔ اگلے ہفتے سے جاب اسٹارٹ ہو رہی ہے۔" وہ مسکرایا۔
"چھوڑو یار! اپنا بزنس دیکھو۔ اور کیا ہماری فیکٹری میں انجینئرز کی ضرورت نہیں۔ ان سے زیادہ پے کریں گے ہم تمہیں۔" معیز نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔
"بس تھوڑا سا جاب کا شوق پورا کر لینے دیں پھر ان شاء اللہ آپ کے پاس آجاؤں گا۔"
"ہاں۔ تھوڑا تجربہ لے آؤ۔" معیز نے برجستہ کہتے ہوئے ہاتھ ہلا کر پورچ کی طرف قدم بڑھائے تو ایراز بھی مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ پروڈکشن ڈپارٹمنٹ سے ہو کے آیا تو رباب کو بے چینی سے اپنے آفس میں ٹہلتے پایا۔ اس پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ مسکرا دیا۔ دل کی کیفیت یک لخت ہی بدلی تھی۔

"ویلکم۔ ویلکم....." وہ شرارت سے بولا مگر اس کے برعکس رباب رک کر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

سیاہ ٹائٹس اور عنابی مائل سرخ ٹاپ میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ خیال کرو کچھ۔ بندہ جان سے بھی جا سکتا ہے۔"

اس کی نظروں سے جھلکتی ستائش اور اس کے انداز نے رباب کا موڈ بدل دیا۔ اس کے ہونٹوں پر تفاخر آمیز مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

یہ وہی معیز احمد تھا جس کے پیچھے وہ بھاگا کرتی تھی۔ اور جسے وہ اپنی محبت میں پاگل دیکھنا چاہتی تھی۔ تو گیا وہ ہو رہا تھا؟ رباب کے اندر ایک غرور سا ابھرا۔ وہ عین معیز کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

معیز نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ رباب نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پہ رکھے تھے۔

"بس باتوں ہی سے ٹرخاؤ گے؟" وہ بڑے ناز اور ادا سے بولی تو اس ادا میں دعوت تھی۔ معیز نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

رباب نے قریب ہو کر سر اس کے سینے پر رکھا تو معیز کی سانس پل بھر کو رک سی گئی۔

خوشبو میں ڈوبا مہکا اور سجا سا وجود۔

عورت کی بدلتی نظر اور کیفیت مرد بہت جلدی پہچانتا ہے۔ معیز نے بھی رباب کی خود سپردگی کی کیفیت کو سرعت سے محسوس کیا۔ رباب نے چہرا اٹھا کے اسے دیکھا تو معیز نے سلگتی سانسوں کو خود سے چند انچ کے فاصلے پہ پایا۔

وہ ایک لمحہ ہی تھا جس میں معیز نے اپنا ذہن جاگتا ہوا محسوس کیا اور اس نے دوسرے لمحے میں ایک زخم آلود پیشانی، مضروب ہونٹ اور آنسو بھری دو سیاہ آنکھیں پتا نہیں کیسے ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ایسے کہ پل بھر کو رباب کا چہرہ معیز کو دکھائی ہی نہیں دیا۔

اس نے بے اختیار ہی رباب کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر نرمی سے خود سے الگ کیا۔ رباب کے چہرے پر حیرت سی چمکی۔

"بیٹھو۔" وہ پتا نہیں کیسے مگر ایک سرد مہر سے خول میں سمٹ گیا تھا۔ رباب کو اس کے بے اعتنا سے انداز نے تپا دیا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں معیز احمد!" وہ ترخ کر بولی تو اپنی سیٹ پر بیٹھتا ہوا معیز چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں یہاں تمہارے ساتھ کسی بزنس ڈسکشن یا ڈیل کے لیے بھی نہیں آئی۔"

وہ سینے پہ بازو لپیٹے ناراض لگ رہی تھی۔ معیز مگر اس وقت کچھ الجھی ہوئی کیفیت میں تھا۔

"بیٹھو، پلیز رباب!"

"نہیں، بلکہ تم بھی اٹھو۔ اتنے دن ہو گئے ہمیں لانگ ڈرائیو پر گئے۔" وہ آگے بڑھ کے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگی۔

"آج موڈ نہیں ہے یار!"
"میرا تو ہے نا۔" رباب نے دھونس جمائی تو ناچار معیز کو اٹھنا ہی پڑا۔
"دل لگانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ محبوب کے نخرے بھی اٹھانے پڑتے ہیں جناب!"
راستے میں رباب نے اسے جتایا تو معیز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ چاہے وہ رباب کی زبردستی کے نتیجے میں باہر آیا تھا مگر اس لانگ ڈرائیو نے اس کا موڈ واقعی بہتر کر دیا تھا۔
"دل لگی میں دونوں طرف ہی محبوب ہوتا ہے۔ لڑکی بھی اور لڑکا بھی۔ تو نخرے تو دونوں کو ایک دوسرے کے اٹھانے چاہئیں نا۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
"ہنہ۔" رباب نے سر جھٹک کر تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔
"اب کیا لڑکے نخرے کرتے اچھے لگتے ہیں؟"
"نہیں جی۔ یہ ادائیں تو آپ لڑکیوں کو ہی سوٹ کرتی ہیں۔" معیز نے ہنستے ہوئے ہار مان لی۔
وہ رباب کو اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ جہاں سے سمندر کا منظر بے حد پیارا تھا۔ نرم سی دھوپ موسم کو خوب صورت بنا رہی تھی۔
"پتا ہے معیز! تمہارا پہلا امپریشن مجھ پر کیا پڑا تھا؟" رباب نے کچھ سوچ کر محظوظ ہوتے ہوئے کہا تو معیز بھی دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"کیا...؟"
"یہی کہ تم ایک اکھڑ اور مغرور سے لڑکے ہو۔ لڑکیوں کو لفٹ نہ کروانے والے۔"
وہ ہلکا سا ہنسی۔ معیز کو بھی بات کا مزا آیا۔
"بالکل ٹھیک سوچا تھا تم نے۔"
"پھر تمہیں کچھ عرصے تک ایک انجان لڑکی کی فون کالز بھی آتی رہیں۔" رباب نے ڈرامائی انداز میں کہا تو معیز چونک سا گیا۔
"انجان لڑکی کی کالز...؟"
"ہاں۔ وہی جو تم سے دوستی کی ریکوئسٹ کرتی تھی۔" رباب کی آنکھوں میں ابھی بھی ہنسی جھلک رہی تھی۔
معیز کو وہ بدتمیز انجان لڑکی یاد آئی۔ ان دنوں جب وہ بے حد پریشان تھا۔ تب وہ کالز اسے مشتعل کر دیا کرتی تھیں۔
"مگر تمہیں کیسے...؟" رباب کو حیرت سے دیکھتے ہوئے وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر اسے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر بیچ ہی میں رک گیا۔
"تم... وہ تم تھیں رباب۔" وہ بے اختیار بے یقینی سے بولا۔ رباب نے ہاں یا ناں میں جواب نہیں دیا مگر معیز سمجھ چکا تھا۔
"او مائی گاڈ...!"
وہ ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں میں بے تحاشا ہنسی کے باعث اتر آنے والی نمی خشک کر رہی تھی۔
"وہ ہنسی مجھے بہت جانی پہچانی لگتی تھی۔ تب میں تمہیں اتنا قریب سے جانتا نہیں تھا۔ پھر جب تم سے دوستی ہو گئی تو ان کالز کا سلسلہ بھی رک گیا۔ ورنہ میں پہچان لیتا۔"
معیز بے اختیار کہا مگر وہ ہنسا نہیں مسکرایا بھی نہیں۔
اسے رباب کی اس شرارت نے کوئی لطف نہیں دیا تھا۔

"جی نہیں۔ ابھی ابھی میں نے ہی بتایا ہے۔ ورنہ تم نے تو آج تک کبھی ذکر نہیں کیا۔ ویسے کیسا لگتا تھا کسی لڑکی کا یوں فدا ہونا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بہر حال۔۔۔ مجھے تو وہ فون کالز بہت چیپ لگتی تھیں۔ اور میں نے ان کالز پر بہت برا بھلا بھی کہا۔ آئم سوری۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ تم ہو۔" معیز نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس میں چیپ والی کون سی بات تھی۔ ابھی بھی تو تم میرے ساتھ گھومتے پھرتے ہو۔ دوستی بھی ہے ہماری۔" رباب نے اختلاف کیا۔

"تم ایک ریسپکٹ ایبل گھرانے کی لڑکی ہو رباب! میں رانگ کالز پہ "رانگ لڑکیوں" سے دوستیاں کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

معیز کا انداز سرد ہوا۔ ساتھ ہی رباب نے اپنا انداز بدل لیا۔ اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے دلربائی سے بولی۔

"تب ہی تو۔۔۔ اس اکھڑ اور مغرور سے معیز احمد پہ یہ دل ہار دیا رباب احسن نے۔"

معیز ہلکے سے مسکرا دیا تو وہ تفاخر سے بولی۔

"یو نو معیز۔۔۔ میں خود سے منسلک چیزوں کے متعلق بہت پوزیسو ہوں۔ میری چیز صرف میری ہو اور بس۔۔۔ مجھے پتا تھا تم کسی اور لڑکی میں انوالو نہیں ہو۔"

"میں چیز نہیں ہوں رباب!" معیز نے اسے ٹوک دیا۔ رباب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کھلکھلا کے ہنس دی۔

کتنی ہی گردنیں ان کی طرف مڑی تھیں۔

اور ان میں سے چار آنکھیں تو حیرت اور بے یقینی سے معیز اور رباب کو دیکھ رہی تھیں۔

"اور بالفرض میں کہیں اور انوالو ہو جاؤں تو۔۔۔؟" معیز نے گویا اس کا امتحان لینے کی ٹھانی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ رباب احسن اتنی عام شے نہیں ہے کہ اس پر فدا ہونے کے بعد کوئی کہیں اور جانے کا سوچ بھی سکے۔" رباب کا انداز مغرورانہ تھا۔

"میں تمہارے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ انوالومنٹ تو بہت بڑی بات ہے معیز!"

اس کے لب و لہجے سے چھلکتی شدت پسندی نے معیز کو اپنے سیف میں رکھے نکاح نامے کی یاد دلا دی۔

جس میں معیز احمد اور ابیہا مراد کے نام ساتھ ساتھ لکھے ہوئے تھے۔

اور وہ جو باتوں باتوں میں رباب کو اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ بتانا چاہتا تھا اس کی بات سن کر چپ سا ہو گیا۔ اسی وقت کوئی ان کی ٹیبل کے پاس آن کھڑا ہوا۔

"ایکسکیوز می۔ کیا ہم بھی آپ کو جوائن کر سکتے ہیں؟" بڑا جانا پہچانا سا لہجہ تھا۔

معیز نے چونک کر دیکھا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جبکہ رباب بڑی ناگواری سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔



ثانیہ کی بڑی مہربانی تھی جو اس نے نہ صرف ابیہا کے داخلہ بھیجنے کا سارا کام مکمل کیا بلکہ اس کو اسی کالج کی ایک خاتون ٹیچر کی اکیڈمی میں ٹیوشن بھی دلوا دی۔

اور اب اپنے آفس سے آدھی چھٹی لے کر اسے گھمانے پھرانے نکلی ہوئی تھی۔

ایمہا تو اس کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی کم تھا۔
"اللہ کا شکر ادا کرو بیا! وہی بندوں کے لیے وسیلے بنا تا ہے۔"
"بندوں کا شکریہ ادا کرنا آجائے تو اللہ کا شکر ادا کرنا خود بخود آجاتا ہے ثانیہ!" ایمہا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
وہ دونوں اس خوب صورت اوپن ایر ریسٹورنٹ میں ہلکے پھلکے لنچ کے ارادے سے آئی تھیں۔
"پتا ہے اس ریسٹورنٹ میں پہلی بار مجھے عون لے کر آیا تھا۔" ثانیہ نے مسکرا کر کہا تو ایمہا دلچسپی سے اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھنے لگی۔
تب ثانیہ نے اسے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ عون کو ستانے کی خاطر بے ڈھلیے اور تیل چپڑے بالوں کے ساتھ یہاں چلی آئی اور پھر خوب پچھتاتی تھی۔
ایمہا خوب ہنسی۔ ثانیہ کو بھی اب وہ سب یاد کرنا 'دہرانا اچھا لگ رہا تھا۔ تب تو وہ عون کے ساتھ سے بھی چڑ رہی تھی۔
"ویسے عون بھائی بے چارے ہیں بہت اچھے۔" ایمہا نے تعریف کی بھی تو کن الفاظ میں۔
ثانیہ خوب ہنسی۔
"پہلے فیصلہ کرلو بے چارے ہیں یا اچھے؟" ایمہا جھینپی پھر تصحیح کرتے ہوئے بولی۔
"میرا مطلب ہے کہ دل کے بھی اچھے ہیں۔"
"اچھا۔ تمہیں کیسے پتا؟" ثانیہ مسکرائی۔
"دیکھیں نا۔ اس دن کتنے آرام سے آپ سے ڈانٹ کھاتے رہے۔ ایک لفظ بھی نہیں بولے بے چارے۔ یوں لگ رہا تھا ساری غلطی ان کے دوست کی نہیں بلکہ ان کی ہو۔"
ایمہا نے یاد دلایا تو وہ ہنسنے لگی اور پھر ہنستے ہوئے یک لخت ہی اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بہت جلد ایمہا کو پتا چل گیا کہ یہ ہنسنے سے آنکھوں میں آنے والی نمی نہیں تھی' جسے ثانیہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔
"کیا ہوا ثانیہ! آپ رو رہی ہیں؟" وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔
"کیوں رو رہی ہیں؟"
اور ثانیہ کیا بتاتی۔ کس خسارے میں گھر گئی تھی وہ۔ ایک محبت کرنے والا دل ہی نہیں بلکہ محبت کرنے والے شخص کو توڑ ڈالا تھا اس نے۔
کس کس طرح اور کن کن الفاظ میں وہ عون کی تذلیل کرتی رہی تھی۔ اس کے جذبوں کو تو ہمیشہ ہی اس نے جوتے کی نوک پہ رکھا تھا۔

وہ جو سب کو بتانا چاہتا تھا کہ ثانیہ کا اس کی زندگی میں کیا مقام ہے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ ثانیہ نے اپنی زندگی میں اس کا مقام کیا رکھا ہوا ہے۔
"نہیں۔ میں کیوں روؤں گی بھلا۔"
ثانیہ مکر گئی۔ ٹشو کے ڈبے میں سے دو تین ٹشو گھسیٹ کر چہرہ تھپتھپانے لگی۔
"ہاں۔ جس کے پاس عون عباس ہو اسے رونا بھی نہیں چاہیے۔"
ایمہا نے سادگی بھرے اطمینان سے کہتے اسے سن کر دیا۔
"تو میں یہ حقیقت اتنی دیر سے کیوں جان پائی میرے اللہ" ثانیہ کا دل کرلا رہا تھا۔

دل میں ایک بار کوئی گھس جائے تو یہ مکان خالی کروانا پھر بہت مشکل ہو جاتا ہے ثانیہ!۔ آپ دونوں کے درمیان تو پھر بھی محبت ہے۔ ہمارے درمیان تو فقط ایک نکاح نامہ ہے اور اس پر ان کے دستخط کے ساتھ میرے دستخط۔ اور مجھے لگتا ہے میں نے اپنی زندگی ان کے نام لگا دی تھی وہ دستخط کر کے۔ اب وہ برا کریں یا بھلا۔ ان کی مرضی۔"

یہ ایمہا مراد تھی۔ ایک نئی ایمہا مراد۔

زمانے کے تھپیڑوں اور ٹھوکروں نے اسے تراش کر اس کی ایک نئی صورت نکالی تھی۔

اپنا آپ عیاں کرنے والی ایمہا مراد۔ اعتراف کرنے سے نہ ڈرنے والی ایمہا۔

ثانیہ اپنا غم بھول کے اس کا تمتماتا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں نے تمہیں سمجھایا تھا ایمہا! یک طرفہ محبت اکثر دکھ ہی دیتی ہے۔"

ثانیہ نے اس کا پلو تھام کر اسے تتلیوں سنگ خواب نگر کے سفر پہ جانے سے روکنے کی سعی کی۔

ایمہا کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"محبت۔ محبت دکھ کا استعارہ کب سے ہو گئی ثانیہ! یہی تو وہ واحد خالص چیز ہے، جو آسمان سے جوں کی توں اتاری گئی ہے۔ کوئی کھوٹ نہیں ہے جس میں۔"

اسے تھوڑی ہی رکنا چاہیے تھا۔ اس راہ پر چلنے والے کسی کے روکنے سے نہیں رکتے۔

"تو تم نے زندگی معیز احمد کی راہ میں رولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" ثانیہ نے گہری سانس بھری۔

(اور میں نے عون کی راہ میں)

عون سے فون پہ ہونے والی گفتگو نے اس کی آس امید کے سارے جگنو اڑا دیے تھے۔ آگے کا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے بہت واضح سا کھینچ گیا تھا۔

"وہ میرے نصیب میں لکھے گئے۔ ان کا نام میرے نام کے ساتھ جڑا ہے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو گی مجھ بد نصیب کے لیے۔ اس سے زیادہ کی چاہ نہیں کروں گی میں۔"

وہ اتنے میں ہی خوش تھی۔ نمانی۔ محبت کی فقیرنی۔ پیار کے دو بولوں اور خوش نگاہی کے ایک سکے سے کاسہ دل لبالب بھر لینے والی فقیرنی۔ اور حد یہ کہ اسی پر مطمئن ہو جانے والی۔

یہ قناعت کا کون سا درجہ تھا۔ حرص و ہوس سے پاک۔ کسی کی ایک نیکی کے بدلے اپنی پوری زندگی وار دینے والا انداز محبت۔

ثانیہ کو اپنا عون سے رویہ خود کو جوتے مارتا محسوس ہوا تھا۔

"اگر تم نے سوچ ہی لیا ہے کہ یہ عمر معیز احمد کے ساتھ ہی گزارنی ہے تو تھوڑی سی ہمت اور کر لو ایمہا! انہیں اپنا بنانے کی ہمت۔"

ثانیہ نے اس کی ہمت نہ توڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

اسی وقت ایک بے حد کھلکھلاتی ہوئی ہنسی ان کے کانوں سے ٹکرائی تو کئی ایک کی طرح ان دونوں نے بھی بلا ارادہ و بے اختیار ہی اپنے سے دو ٹیبل پرے موجود جوڑے کو دیکھا۔ اور پھر حیرت اور بے یقینی سے دیکھتی رہ گئیں، مگر ثانیہ کی حیرت لحہ بھر ہی کی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کے ایمہا کو دیکھا۔

"یہ لو۔ موجود ہے پیا! معیز احمد کا لو موجود۔ رباب۔" ثانیہ کو لگا کہ یہ سب ایمہا سے کہنا سفاکی تھی مگر وہ اسے فریب میں رہنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایمہا نے بڑے حوصلے سے ثانیہ کو دیکھا۔

"میں جانتی ہوں ثانیہ!" پھر لحہ بھر کے توقف کے بعد ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"مگر حقیقت تو یہی ہے نا کہ "میں" معیز احمد کے نکاح میں ہوں۔"

ثانیہ کی ساری اداسی اور ٹینشن بھک سے اڑی۔ تو وہ کھل کے مسکرا دی۔ پھر ایشا کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی اسے اٹھایا۔

"او پھر ذرا۔ تھوڑی سی ہمت کرو اس رشتے کو آزمانے کی۔" ایشا کچھ سمجھی نہیں تھی۔ اور یونہی ناسمجھی کی کیفیت میں وہ اس کے ساتھ گھسٹنے والے انداز میں چند قدم چلی اور بھک سے تب اڑی' جب اس نے بڑے شائستہ انداز میں ثانیہ کو معیز سے مخاطب ہوتے پایا۔

وہ دونوں معیز اور رباب کو دیکھ تو چکی تھیں مگر ایشا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ثانیہ ایسی حرکت کرے گی۔ اس نے معیز کو بوکھلا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ ثانیہ کی اوٹ میں تھی۔ اب عزت سے بن آئی تو اس نے آریا پار والے انداز میں خود کو لمحہ بھر میں سنبھال لیا۔ لاپروا سی بن کے کھڑی ہو گئی۔ وہ رباب کے سامنے خود کو مزید ڈی گریڈ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"کیسے ہیں آپ معیز بھائی! واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔"

ثانیہ کی خوش مزاجی انتہا پر تھی۔

"یہ رباب ہے۔ اور رباب! یہ ثانیہ ہیں۔ عون کی مستقبل کی مسز۔" ثانیہ نے مسکرا کر رباب سے ہائے ہیلو کی۔

"آؤ نا۔ بیٹھو۔"

معیز کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ ثانیہ کے پیچھے کھڑی ایشا کی موجودگی سے وہ بے خبر نہ تھا۔

رباب نے کاٹ دار نظروں سے ایشا کو دیکھا۔ مگر کچھ کہا نہیں کہ بہرحال وہ (رباب کی نظر میں) عون کی کزن تھی۔ سو ثانیہ کے سامنے تو وہ ایشا پر کوئی طنزیہ جملہ نہیں کر سکتی تھی۔ ثانیہ تو مزید پیش قدمی کے موڈ میں تھی مگر ایشا کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ اس نے عقب سے ثانیہ کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"نہیں۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں ثانیہ!" وہ بعجلت بولی تو ثانیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور اس پل ایشا کی آنکھوں میں اتنی التجا اور خوفزدہ سا تاثر تھا کہ اسے ترس آ گیا۔

ہنس کر معیز سے بولی۔

"چلیں، آج ایشا نے آپ کی جان بچا لی۔ پھر کبھی سہی۔ ویسے بھی لنچ تو ہم کر چکے ہیں۔" معیز بمشکل مسکرایا۔

"او کے۔ ایز یو وش۔"

"اللہ حافظ۔ اور ایشا کا احسان یاد رکھیے گا۔" وہ جاتے جاتے بھی باز نہ آئی تھی اور ایشا کی ٹانگیں لرزنا شروع ہو چکی تھیں۔

وہ پبلک پلیس پہ کسی تماشے کا موجب بننے کے حق میں نہیں تھی۔

"یہ کیا ڈرامہ تھا۔" ان کے جانے کے بعد رباب نے ناگواری سے پوچھا تو معیز چونکا۔

"ہوں۔ کیا؟"

"تمہارے گھر کی ملازمہ ہے ایشا مراد۔ اور یہ لڑکی اسے یوں لیے مہنگے ریسٹورنٹس میں پھر رہی ہے۔" رباب نے نخوت سے کہا۔

"وہ ہماری ملازمہ نہیں ہے' رباب کچھ دنوں کے لیے اس نے ملازموں کو سپروائز ضرور کیا تھا مگر پھر چھوڑ دیا۔ اب تو شاید وہ اپنی اسٹڈیز کمپلیٹ کرنے والی ہے۔"

معیز نے نرمی سے کہا مگر اندر مچی ہلچل نے پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکا دیں۔
"مجھے تو چڑ ہے اس لڑکی سے۔"
رباب سے عادت کے برخلاف کوئی بات برداشت نہ ہوتی تھی۔ ایک بار جو ناپسندیدہ ہو گیا' وہ تاعمر اس کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہ ہوتی تھی۔
"کیوں۔ اچھی خاصی تو ہے۔" معیز کے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا۔ خود وہ بھی اپنے لفظوں پر حیران ہوا تھا۔
مگر رباب نے جیسے اسے گھور کے دیکھا۔ اس سے معیز کو لگا کہ ایک لڑکی کے سامنے کسی دوسری لڑکی کی تعریف کرنا شاید اخلاقیات کے خلاف تھا۔
وہ ہنس دیا۔
ادھر سیڑھیاں اترتی ایبہا بھی ثانیہ سے الجھ رہی تھی۔
"میں تو ضرور ہی آج وہاں بے ہوش ہو کے گرتی۔"
"ہاں تو ہو جاتیں نا۔ تمہارا تو ہزبینڈ موجود تھا تمہیں سنبھالنے کے لیے۔"
ثانیہ نے شرارت سے اسے چھیڑا تو وہ اداس سی ہو گئی۔
اور وہ رباب کے ساتھ موجود تھا۔ اور رباب اس کے ساتھ تھی پورے استحقاق کے ساتھ۔
وہ ٹیکسی میں بیٹھیں تو بھی ایبہا خاموش تھی۔ ثانیہ نے بھی کوئی بات نہ کی' ہاں مگر جب وہ اترنے لگی تب اس نے مضبوط لہجے میں ایبہا کو مشورہ دیا۔
"اگر تم اس تعلق کو نبھانا ہی چاہتی ہو ایبہا! تو یوں خاموش مت رہو۔ اسے اپنا احساس دلاؤ۔ لڑ کر ہارو گی تو شکست اتنا دکھ نہیں دے گی۔ یہ خیال تو نہیں ستائے گا کہ کوشش کرتی تو شاید اسے پا ہی لیتی۔"
ٹیکسی اسے لیے آگے بڑھ گئی مگر ایبہا کے لیے ثانیہ کے الفاظ مشعل راہ بن گئے۔



دوسروں کی الجھنیں سلجھانے والی ثانیہ کی اپنی زندگی کا ریشمی دھاگا کچھ ایسے الجھا تھا کہ سلجھانے کو کوئی سرا ہی نہ ملتا تھا۔
عون نے بات کرتے ہوئے ذرا سی بھی تو لچک نہ دکھائی تھی کہ وہ اپنے کہے کی معذرت کر سکتی۔
مایوس ہو کر وہ گاؤں چلی گئی۔ اب تو اتنے شوق سے کی جانے والی جاب میں بھی دل نہ لگتا تھا۔ ایک دم سے جاب سے استعفیٰ نہ دے سکتی تھی' سو فی الحال انہیں مطلع کر دیا۔ جاب چھوڑنے سے دو ماہ پہلے کمپنی کو مطلع کرنے کی شرط اپائنٹمنٹ لیٹر میں درج تھی۔ گھر آ کے وہ دادی سے بھینچ بھینچ کے ملی۔ ماں سے ملی تو خوب روئی اور یہ جذباتیت پہلی بار تھی۔
وہ تو یہاں سے جان چھڑا کے بھاگا کرتی تھی۔
"کام' کام' کام۔ کیا قائداعظم صرف میرے لیے فرما گئے ہیں؟" اسے دادی کی ذرا ذرا سی بات پہ آواز دینے اور ایک منٹ بھی فارغ نہ بیٹھنے دینے والی عادتوں سے چڑ تھی۔ سو گھر آتی بھی تو آتے ہی اعلان کر دیتی۔
"میں یہاں چند دنوں کی مہمان ہوں بس۔ چھٹیاں گزارنے آئی ہوں۔ سو ہر کام سے چھٹی۔ جیسے خدانخواستہ دنیا میں چند دن کی مہمان ہو۔ اور اب... امی اور دادی کا برافروختہ ہونا بنتا تھا۔
"کیا ہو گیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" امی نے اسے زبردستی خود سے الگ کیا۔

"میں جاب چھوڑ آئی ہوں۔"
"تو۔یہ تو بڑا اچھا کیا تم نے۔اب کیا ضرورت تھی اس موئی نوکری کی۔" دادی نے ٹھٹھا لگا کر داد دی۔امی بھی مسکرادیں۔
"لڑکیاں جتنی جلدی اپنے گھروں کی ہو جائیں ان کے لیے بہتر ہوتا ہے۔" ثانیہ کو اور رونا آیا۔
اور اگر میری بارات ہی نہ آئی تو؟۔
دادی تو بہرحال بہت خوش تھیں ثانیہ کی اس "پگھلی" ہوئی کیفیت سے۔
دو دن کے بعد ہی عون کی امی ابا اور بھابھی بیچ چلے آئے۔پتا چلا شادی کی تاریخ طے کرنے کا ارادہ ہے۔ابا نے بطور خاص بھانجی کو بلا کر اس کی مرضی پوچھی۔
اب بھانجی صاحبہ کیا کہتیں۔سر جھکا کے گونگے کا گڑ کھائے ہوئے کی تفسیر بنی رہیں۔ابا تو کیا باقی سب بھی سمجھ گئے اچھی طرح کہ یہ سو فیصد ہاں کا اشارہ ہے ورنہ اس سے پہلے تو اس کی زبان فراٹے سے چلتی تھی۔
امی نے اس کی جاب کی مجبوری کا بتا دیا تھا۔سو ابا نے دو ماہ بعد فوراً" شادی کی تاریخ رکھ دی تھی۔
مبارکبادیں،مٹھائی،خوش گپیاں،قہقہے۔مگر ثانیہ کا دل بجھا کا بجھا ہی رہا۔
"بھابھی عون نہیں آیا؟"
ثانیہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ ہی لیا۔
"دراصل اسے پتا نہیں تھا کہ شادی کی تاریخ لینے لڑکے کو خود آنا پڑتا ہے۔"
بھابی نے اتنی سنجیدگی سے شرارت کی کہ وہ گڑبڑا گئی۔اس کے چہرے پہ جیسے سرخ رنگ بکھر گیا۔
"نہیں۔میرا مطلب تھا کہ۔" اسے کوئی بات نہیں سوجھی تھی۔بھابھی زور سے ہنس دیں۔صاف گو اور منہ پھٹ سی ثانیہ کا جھینپا ہوا سا انداز انہیں بھی مزہ دے گیا تھا۔
"ویسے میرے دیور کی مستقل مزاجی کی داد دینی پڑے گی۔صحیح کہتا تھا۔کچے دھاگے سے بندھی آئے گی ثانیہ۔"
بھابھی نے پیار سے اس کا گال چھوا۔
"اسے پورا یقین تھا کہ تم اس کی غلطی کو اگنور کر دو گی۔اور پھر ضروری تو نہیں ہر پیار پہلی نظر کا ہی ہو۔دوسری اور تیسری نظر کا بھی تو ہو سکتا ہے۔"
وہ اسے چھیڑ رہی تھیں۔
اور ثانیہ کو احساس ہو رہا تھا کہ اپنی بے جا ضد میں اس نے کتنا محبت کرنے والا دل توڑ ڈالا تھا۔
اور اس میں تو کوئی شک رہا ہی نہیں تھا کہ اب اسے بھی اپنی غلطی کی تلافی کے طور پر اتنے ہی صبر سے کام لینا تھا،جتنے صبر سے عون لیتا رہا تھا۔
وہ بظاہر بھابھی کی باتیں سنتی در حقیقت سوچوں کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔



بیرونی دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن لاکڈ نہیں تھا۔دستک کی آواز نے ناشتا بناتی ابیہا کو حیران کیا۔اسے علم تھا کہ ثانیہ گاؤں جا چکی ہے۔
پھر اس کے دروازے پر دستک دینے والا کون تھا۔وہ ناشتے کی ٹرے ہاتھ میں تھامے دوسرے ہاتھ سے ایپرن کی گرہ کھولتی لاؤنج میں آئی۔تب تک دروازہ کھول کر معیز اندر آچکا تھا۔
ابیہا ہونق سی رہ گئی پھر بعجلت ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر کچن میں چلی گئی۔

معیز نے حیرت سے اس کی یہ حرکت دیکھی۔ مگر ذرا دیر بعد وہ ایپرن اتار کر سلیقے سے، دوپٹا شانوں پر ڈال کے آئی تو وہ اس کی عُجلت کی وجہ سمجھ گیا۔
وہ نروس سی انگلیاں موڑتی خاموش کھڑی تھی۔ اب اسی کے گھر میں اس سے بیٹھنے کا کہا کہتی۔
"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ اجازت مانگ رہا تھا۔ ایہا تو حیرت کے سمندر میں غرق ہونے لگی۔
"تم تو کچھ بولو گی نہیں۔" وہ خود ہی آگے بڑھ کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔
ایہا مارے حیرت و بے یقینی کے مرنے والی ہو گئی۔ بمشکل صوفہ تھام کے خود کو سہارا دے کر گرنے سے روکا۔
اب وہ ایہا کے بنائے ہوئے ناشتے کی ٹرے کا جائزہ لے رہا تھا۔
"ہوں۔ ناشتا ہونے لگا ہے۔"
اور بجائے اس کے کہ وہ معیز کا اس قدر دوستانہ انداز دیکھ کر خوش ہوتی، اس کا دل ہی نہیں ٹانگیں بھی لرزنے لگیں۔ معیز کا یہ انداز اس قدر غیر متوقع تھا کہ ایہا کو کسی خواب کا سا گمان ہو رہا تھا۔
"کیا ہوا۔ آؤ بیٹھو۔"
اب وہ اسے تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایہا کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بڑے احتیاط سے صوفے کے کنارے تک سی گئی جیسے ذرا زور سے حرکت کرنے پر خواب ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔
معیز نے ایک بار پھر بھاپ اڑاتی چائے' ہری مرچ اور ہرے دھنیے سے سجے انڈوں کے آملیٹ اور سنہری پراٹھے کو دیکھا۔ اور پھر ایہا نے اپنی زندگی کا ایک حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین منظر دیکھا۔
معیز نے صوفے پر آگے کھسک کر بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پراٹھے کا نوالہ توڑا اور اب وہ آملیٹ کے ساتھ کھا رہا تھا۔
وہ ہونق سی اسے دیکھ رہی تھی۔
یا اللہ! یہ خواب ہے یا حقیقت۔
اس نے تو آدھا پراٹھا آدھے آملیٹ کے ساتھ کھایا تھا۔ ایسے جیسے وہ یہاں ناشتا کرنے کی غرض سے ہی آیا ہو۔
اب وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔
اور ایہا تو مانو وہاں تھی ہی نہیں۔ نظر گم' حواس گم والا معاملہ تھا۔ معیز نے اس کی طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ ہلکا سا ہنس کر بولا۔
"آئم سوری۔ لیکن بہت عرصے بعد اتنا اچھا ناشتا دیکھ کر خود پر کنٹرول نہیں کر سکا۔"
"آپ۔ باقی بھی لے سکتے ہیں۔" اس کی آواز بمشکل نکلی۔
"یہ دوسرا دور تھا ناشتے کا۔ گھر سے ابھی کر کے آ رہا ہوں۔ لیکن زارا کو صرف انگلش بریک فاسٹ ہی بنانا آتا ہے۔ یو نو! ایگ' بریڈ جیم جوس وغیرہ۔ کبھی ماما ایسا ناشتا بناتی تھیں۔"
وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور ایہا شہزادی حیرت سے مر مر کے زندہ ہو رہی تھی۔
پرنس چارمنگ اس کی دسترس میں تھا۔ ہاتھ بڑھاتی تو چھو لیتی۔
"تمہاری پڑھائی کا کیا بنا۔؟" موضوع بدل گیا۔
"وہ ثانیہ نے کروا دیا ہے سب۔ ٹائم زیادہ نہیں ہے تو میں ٹیوشن لے لوں گی۔ آج فرسٹ ڈے ہے۔"
ایہا کے حواس نے آہستہ آہستہ کام شروع کیا تھا۔ احتیاط سے بولی۔
"جاؤ گی کیسے؟" وہ سنجیدہ تھا۔
"رکشا کر لوں گی۔" وہ ہچکچائی۔ معیز سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے پاس صرف یہ ناشتا ختم کرنے کا ٹائم ہے۔ ریڈی ہو جانا۔ میں تمہیں پک اینڈ ڈراپ کروں گا۔" وہ کہہ کر مزید رکا نہیں تھا۔ اور ایمہا۔۔۔ وہ ششدر بیٹھی تھی۔
"یا اللہ! یہ کیا کرشمہ ہے؟"
پھر معیز کی تلقین یاد آئی تو وہ جلدی سے ناشتا کرنے لگی۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
کیا اللہ اس پر مہربان ہونے لگا تھا؟
اس کی آنکھوں میں آنسو' ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور وہ بہت شوق سے معیز احمد کا چھوڑا ہوا ناشتا کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ معیز احمد نے کس "مقصد" کو پورا کرنے کے لیے یہ 'راستہ' اختیار کیا تھا۔
اور معیز احمد نہیں جانتا تھا کہ "دوستانہ" انداز میں "چھوڑنے" کے لیے اس نے جو طریقہ اپنایا تھا' اس نے ایمہا مراد کو خوش قسمتی کی کس بلندی پر لا کھڑا کیا ہے۔ حق سچ کیا ہے' جھوٹ و باطل کیا۔ ہے۔ یہ تو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔
تیار ہونے کے دوران بھی ایمہا کے ہاتھ پاؤں لرزتے رہے۔ وہ بے ترتیبی سے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ لاک کر کے باہر نکلی تو اس نے دور ہی سے پورچ میں معیز احمد کو اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھ لیا۔
وہ نروس سی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ زندگی کی طرف بڑھی۔



وہ ہلکی سی دھوپ میں دادی کے تخت پران کے پہلو میں منہ چھپائے کچھا مچھ اسی بنی لیٹی تھی۔
"اری جانا۔ میں کہتی ہوں اندر جا کے کھلی ڈلی ہو کے لیٹ۔" دادی تسبیح کرتے ہوئے کتنی بار ہی اسے ٹوک چکی تھیں مگر وہ ڈھیٹ بنی پڑی رہی۔
"کیا دادی!۔ ساری دھوپ تو آپ لے لیتی ہیں۔ میں تو کبھی کبھار ہی آتی ہوں۔ اور اب تو وہ بھی نہیں آیا کروں گی۔" (جذباتی حملہ) ثانیہ نے منمنا کر اور منہ گھسیڑا۔
دادی کا دل و کیا آنکھ بھی بھر آئی۔ جھک کر اسے زبردستی ماتھے پہ بوسہ دیا۔
"میں صدقے میں قربان۔ جم جم آ میری بچی۔ یہاں کی دھوپ چھاؤں سب تیری ہے۔"
ثانیہ نے مسکراہٹ دبائی۔
"ثانی! تمہارا فون بج رہا ہے کب سے۔"
امی نے اندر سے آواز لگائی تو پہلا خیال اسے ایمہا کا آیا۔ وہ تین روز سے یہاں براجمان تھی اور آج ایمہا کا کوچنگ کا پہلا دن تھا۔ اسے اپنی سستی پہ غصہ آیا اور تاسف بھی ہوا۔ وہ چلانگ سا لگا کر کمرے کی طرف بھاگی۔ نمبر دیکھا بھی نہیں اور کال اٹینڈ کر کے کان سے لگا لیا۔
"ہیلو۔" پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔
اور دوسری طرف سے جانے کیا صور پھونکا گیا کہ ثانیہ کے چہرے کی رنگت ایک دم سفید پڑ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے بستر کے کنارے ٹک گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عتیقہ ملک

مسکرائی ہے زندگی

عباس ملک کی دوسری شادی تھی۔ بارات تیار کھڑی تھی' زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پوری رسموں رواجوں کے ساتھ۔ دو دن پہلے مایوں کی رسم ہوئی تھی۔ پورا گاؤں مدعو تھا۔ سب خوش تھے مگر عباس ملک۔ وہ جانے کہاں تھا۔ اس کا ذہن آگے کا سفر طے کرنے کے بجائے واپسی کا سفر طے کر رہا تھا۔ اس سفر میں کٹھنائیاں تھیں۔ آنسو تھے' وحشتیں تھیں اور یہ وحشتیں اس کے جسم و جاں سے آسیب کی مانند لپٹی تھیں۔ آکاس بیل کی مانند اس کی روح کو ڈھانپ رہی تھیں۔

"میرے دل سے زندگی کی خواہش نکل گئی۔" کوئی اس کے کان کے پاس ہولے سے گنگنایا تھا۔

کس قدر شکستگی' اذیت' بے بسی اور بے چارگی ٹپکتی تھی ان الفاظ سے۔ الفاظ تھے یا کوڑیالے سانپ۔ اسے لگا جیسے یہ الفاظ اسے ڈس رہے ہوں۔

"میرے دل سے زندگی کی خواہش نکل گئی۔"

کوئی اس کے اردگرد کرلایا تھا۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتا تھا۔

✡ ✡ ✡

پمپ سے 'فیول' ڈلوا کر اس نے گاڑی آگے بڑھائی' اور پمپ کی حدود سے تھوڑا سا آگے جا کر ایک نسبتاً کم رش والے اسٹاپ پر روکی اور ایک ٹی اسٹال پر بیٹھتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا تھا۔ تب ہی اس کے سامنے

مکمل ناول





ایک ڈرائیور کی اور چند ایک مسافر اترے۔ سب سے آخر میں اترنے والی لڑکی کو عباس نے بے توجہی سے دیکھا اور پھر دور تک دیکھتا چلا گیا تھا۔ لڑکی کچھ فاصلے پر بنے واش روم کی طرف چلی گئی تھی۔

"صاحب! چائے تیار ہے۔ گرما گرم پکوڑے بھی ایک پلیٹ کردوں؟" ٹی اسٹال والے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں بس چائے کافی ہے۔" اس نے منع کرتے ہوئے کپ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ تب ہی وہ لڑکی واپس آتی دکھائی دی۔ اس نے گلابی سوٹ کے ساتھ میچنگ سویٹر اور میچنگ شوز پہن رکھے تھے۔ وہ اسی اسٹال سے کولڈ ڈرنک لے رہی تھی۔ پرس میں سے پیسے نکالتے ہوئے اس کی نظر بس پر پڑی، جس سے وہ نیچے اتری تھی۔

"میری گاڑی کدھر گئی؟" اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا تھا۔

"یہ کھڑی ہے آپ کی گاڑی۔" ٹی اسٹال والے نے بس کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"نہیں۔ میں اس گاڑی پر تو نہیں آئی۔"

"یہ ڈی آئی خان سے آرہی ہے۔ آپ اسی سے اتری ہیں۔" اسٹال والے نے پھر سے مطمئن کرنا چاہا۔

"نہیں...!" لڑکی نے زور و شور سے انکار میں سر ہلایا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ رو پڑے گی۔

عباس کے ہونٹوں پر دلچسپ مسکراہٹ آگئی۔ جب بس رکی تھی تو ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لڑکا موجود تھا، جو کچھ دور بنے اسٹال پر چائے پی رہا تھا اور اب اس کی جگہ ایک معمر سا شخص ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ لڑکی غالباً" ڈرائیور کے بالکل ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ لہٰذا اسے گاڑی کی پہچان ڈرائیور سے تھی۔

"آپ اسی گاڑی سے اتری ہیں۔ اس گاڑی کا ڈرائیور چینج ہوا ہے۔ پہلے والا ڈرائیور وہ سامنے بیٹھا ہے۔" عباس نے مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ مداخلت کی تو اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ وہ ادائیگی کرتی بس کی طرف بڑھی تو عباس کی نظر اس کی پشت پر جھولتی لمبی چٹیا پر پڑی جس پر سفید ربن بندھا ہوا تھا۔



"سلیپنگ پارٹنر بن کر بینک سے چیک کیش کرالینا کس قدر آسان ہوتا ہے اور یہ سب کچھ مینیج کرنا کتنا بڑا ہیڈک ہے۔" ایڈووکیٹ عباس ملک کو آج پہلی بار اندازہ ہو رہا تھا۔

رافع نیازی اس کے کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ عباس نے ایل ایل بی کے لیے پشاور یونیورسٹی کا انتخاب کیا اور رافع نے اسی یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی۔ عباس نے نزدیکی شہر سے پریکٹس کا آغاز کیا اور دن بدن ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ وہیں رافع جوتیاں گھساتا رہا۔ اپنی تند اور کھری فطرت کے باعث کئی نوکریاں چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"میں ایک آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہارا کالج روڈ والا گھر چاہیے۔"

عباس کا سارا خاندان گاؤں میں آباد تھا مگر ان کا بزنس کئی شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ شہروں میں ان کی پراپرٹی موجود تھی جو زیادہ تر ہاؤسنگ اسکیموں میں بنگلوز پر مشتمل تھی۔

"مہوز چچا سے بات کر کے ہی کچھ بتا سکتا ہوں فی الحال۔"

"میں تمہارے ساتھ پارٹنر شپ کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"تم جسٹ سلیپنگ پارٹنر ہوگے۔"

اور رافع کے ساتھ مل کر انسٹی ٹیوٹ کا آغاز کرنے کے بعد عباس کو اندازہ ہوا وہ بے حد باصلاحیت شخص تھا۔ محض ڈیڑھ سال کے عرصے میں ان کے انسٹی

ٹیوٹ کا شہر میں نام بن چکا تھا۔ سب کچھ رافع کی ذمہ داری تھی مگر اصل پریشانی یہ آن پڑی کہ عین ایگزامز کے دنوں میں وہ کسی ایمرجنسی میں پڑ گیا۔ پہلے سیشن کے اختتام تک ان کے ایگزامز یونیورسٹی کے کیمپس اور گردونواح کے سینٹرز میں ہونے تھے۔ پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد تمام اسٹوڈنٹس دو بسوں میں لاہور پہنچ چکے تھے۔ اور عباس اس کام کو سنبھالتے ہوئے بے حد بے زار تھا۔ اس پر رافع کی ہدایات اسے مزید گراں گزر رہی تھیں۔ لاہور پہنچ کر ابھی سانس بھی نہ لیا تھا کہ اس کے موبائل پر رافع کی کال آنے لگی۔

"عباس! ایک فی میل اسٹوڈنٹ ہے' فروا نام ہے اس کا' اس کو دس منٹ میں ڈائیوو اسٹینڈ سے پک کرکے ویمن ہاسٹل چھوڑنا ہے۔ ویمن ہاسٹل کا ایڈریس میں تمہیں سینڈ کرتا ہوں اور اس اسٹوڈنٹ کا نمبر بھی۔ وہ خود بھی تمہیں کال کرے گی۔"

"رافع۔ رافع!" اس نے دانت پیسے۔ "میں سلیپنگ پارٹنر ہوں۔" جواباً" رافع کی ہنسی اس کا خون جلا گئی۔

"یہ کام کرکے آرام سے سو جانا میرے سلیپنگ پارٹنر!" وہ فون بند کرچکا تھا۔ عباس اڈے تک جانے کے لیے اٹھ گیا۔

وہ ڈائیوو اسٹینڈ پر ہونقوں کی طرف منہ اٹھائے کھڑا تھا جب اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔

"یس۔!" اس نے فون کان سے لگایا تھا۔

"سر۔ آپ سر عباس بات کررہے ہیں؟"

"جی۔ آپ کہاں ہیں؟"

"سر! میں اتنی دیر سے آپ کا ویٹ کررہی ہوں۔" اور عباس کو یوں لگا آواز صرف فون سے ہی نہیں بلکہ کہیں آس پاس سے بھی سنائی دے رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا گلابی میچنگ والی لڑکی اس کے پیچھے کھڑی بول رہی تھی۔ اتنی ہی ہراساں اور پریشان جتنی آج دن میں بس اسٹاپ پر دیکھ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یار! یہ تم لوگوں کے سر رائج ہیں نا! ان کی عقل تو ٹخنوں میں ہے۔" عباس نے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے بیٹھے تھرڈ ایئر کے اسٹوڈنٹس پر ایک نظر ڈالی تھی۔

"کیوں سر؟" لڑکے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"یار! اتنی چھوٹی سی جگہ پر اتنے لڑکے کیسے رہیں گے۔"

جواباً لڑکے اپنی ہنسی دبانے لگے۔

"کیا ہوا' میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" اس نے ان کے ردعمل پر بازپرس کی۔

"سر! ابھی تو تھرڈ سمسٹر کے چھتیس اسٹوڈنٹ اور آئیں گے۔" اب وہ کھل کر ہنس رہے تھے۔

"اور وہ کہاں رہیں گے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"سر! اسی ہاسٹل میں۔" وہ اسے بتا کر اب لوٹ پوٹ ہورہے تھے۔

"لو تو!" اس نے سر تھام لیا تھا۔ ہر کمرے میں چھ چھ اور آٹھ آٹھ اسٹوڈنٹس ٹھہرے تھے۔ تب ہی اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔

"سر عباس بات کررہے ہیں؟" دوسری طرف روہانسی آواز سن کر وہ ابھرا۔

"جی!"

"سر! میں فروا بات کررہی ہوں۔ میں پیپر دینے آئی تھی۔ مجھے راستہ بھول گیا ہے۔ سر! مجھے ہاسٹل نہیں مل رہا۔"

"اوکے میں آپ کو پک کرلیتا ہوں۔ آپ کہاں ہیں۔" اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

گاڑی اس کے قریب روکتے ہوئے اس نے ارد گرد لوگوں پر نظر ڈالی تو اسے صورت حال کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی چلا تھا۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ جلدی سے اندر آ بیٹھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا لی تھی۔

"فروا! آپ سڑک پر کھڑے ہو کر رو رہی تھیں؟" عباس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی تھی۔

"نہیں سر...!" جواباً اس نے عباس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکیں اور اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ عباس نے گاڑی ایک طرف روک لی۔

"آر یو میڈ؟ آپ ماسٹرز کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ اتنا امیچیور بی ہیو کیوں کررہی ہیں؟" اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ اس نے فوراً ہی آنکھیں صاف کیں۔

"آپ راستہ کیسے بھول گئیں؟" اب کے اس نے کچھ نرم انداز میں استفسار کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"سر! دو بجے پیپر کا ٹائم ہے۔ سر رافع نے مجھے ڈیڑھ بجے فون کرکے پوچھا کیا میں سینٹر پہنچ گئی ہوں تو میں نے انہیں بتایا کہ میں تو ابھی ہاسٹل میں ہوں۔ انہوں نے مجھے کہا فوراً نکلو۔ میں نے ایسے ہی کیا' لیکن میں رکشے میں ملٹی پل چوائس کوئسچن ریوائز کرتی رہی۔ راستے پر دھیان ہی نہیں دیا اور اب..."

"تو آپ مجھے کالج گیٹ سے ہی فون کردیتیں؟"

"میں اپنا سیل ہاسٹل میں ہی چھوڑ گئی تھی کہ پیپر کے دوران ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی' پھر میں نے سوچا کہ ادھر سڑک پر خود ہی ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔ مجھے سر رافع کا نمبر زبانی یاد نہیں تھا' شکر ہے' سر آپ کا نمبر آسان تھا۔ میں نے پی سی او سے دو تین نمبر ڈائل کیے تو آپ کا نمبر مل گیا۔ ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا میں گم ہی ہوگئی ہوں۔" اس کا انداز پھر سے رونے والا ہوگیا تھا۔

"او کے۔ جو ہونا تھا۔ ہوچکا تھا۔ اب ریلیکس ہوجائیں اور خود کو کمپوز کریں ورنہ ہاسٹل کی گرلز آپ کو یوں روتا بسورتا دیکھ کر سمجھیں گی کہ آپ کی نقل پکڑی گئی ہے اور آپ پولیس کی مار کھا کر آرہی ہیں۔"

ہاسٹل کے گیٹ پر گاڑی روکتے ہوئے اس نے قدرے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو اس کے بھیگے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی اور نہ جانے اس کی اس مسکراہٹ میں کیا تھا کہ ایک برقی تیزی سے ایڈووکیٹ عباس ملک کے دل کو چھوگئی تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اتری اور گیٹ سے اندر چلی گئی' مگر وہ گاڑی ریورس کرنا بھول گیا تھا۔

جب کمرے میں آکر سونے کے لیے لیٹا' پھر تو نیند نہ آسکی۔ بار بار ذہن فروا کی طرف جارہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے فروا کا نمبر ملا ڈالا۔

✡ ✡ ✡

"کیا ضرورت تھی وہاں جاکر یہ سب کرنے کی' کوئی قیامت تو نہیں آرہی تھی کہ تم گردوپیش کو بھول کر ہاسٹل سے نکلیں اور واپسی کا ہوش ہی کوئی نہیں رکھا۔" ماما نے یہ سن کر بجائے پریشان ہونے کے اسے ڈانٹا تھا۔ ان کی ڈانٹ پر وہ ابھی بھی بیٹھی رو رہی تھی کہ اس کے موبائل کی بپ بجی اور اس نے نمبر دیکھے بغیر اٹینڈ کیا تھا۔

"فروا!" دوسری طرف کس شدت سے پکارا گیا تھا' کہ بے ساختہ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"آپ رو رہی ہیں؟"

"جی... نہیں سر!" اسے یاد آیا کہ سر عباس دن میں اس کے رونے پر کتنا ناراض ہوئے تو فوراً" مکر گئی' مگر دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا تھا اور آدھ گھنٹے بعد جب ہاسٹل وارڈن نے آکر اسے وزیٹر کے آنے کی اطلاع دی تو وہ جھجکتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی۔

"فروا! آپ کو کوئی پریشانی تھی تو ہمیں بتاتیں؟" وارڈن اس کے ساتھ وزیٹر لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عباس ان دونوں کو آتے دیکھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

"سر! ہمارے رولز کے مطابق دس بجے کے بعد وزیٹر نہیں آتے' مگر آپ کی خاطر ہم نے آپ کی اسٹوڈنٹ کو بلایا۔" یہ عباس کی شخصیت کا کمال تھا کہ وارڈن اس سے اس انداز میں مخاطب تھی۔

"تھینک یو میڈم... بیٹھیں فروا آپ۔" اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ خود بھی بیٹھ چکا تھا۔

"اب مجھے بتائیں کہ آپ کیوں رو رہی تھیں؟" اس کے بے حد کیئرنگ اور وارفتہ انداز نے فروا کو

نروس کر ڈالا تھا۔
"سر! میری ماما نے مجھے ڈانٹ دیا تھا کہ میں اس طرح یوں ہاسٹل سے نکل گئی۔"
"آپ کو کل تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی؟" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کچھ یاد آنے پر پوچھا تھا۔
"نہیں سر! اب میں نے اس جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔ ہمارا ہاسٹل تھانے کے بالکل سامنے ہے۔" اور عباس پریشانی سے اس کی طرف مڑا تھا۔ اس کے تاثرات اتنے ناقابل فہم تھے کہ فروا پریشان ہوگئی۔
"کون سا تھانہ کون سا ہے؟"
"سر! پولیس کا تھانہ۔"
"آپ کی بے وقوفی کی کوئی حد بھی ہے۔ سارے تھانے پولیس کے ہوتے ہیں اور اس شہر میں ایسے کم از کم دس تھانے موجود ہیں۔"
"دراصل پہلی میں پہلی بار ماما کے بغیر ٹوٹ آف سٹی آئی ہوں تو شاید مجھ سے غلطیاں ہورہی ہیں۔"
"شاید نہیں یقیناً" آپ سے غلطیاں ہورہی ہیں۔" اس نے قطعی انداز میں ڈپٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

جونہی پیپر کے اختتام پر اس نے موبائل آن کیا تو فوراً عباس کا میسج اسکرین پر ابھرا تھا۔
"میں کالج کے گیٹ پر آپ کا ویٹ کررہا ہوں۔"
کل عباس نے ہدایت کی تھی کہ ایگزامنیشن سینٹر کے باہر ایک ملازم لڑکیوں سے کچھ پیسے لے کر ان کی چیزیں سنبھال لیتا اور پیپر کے اختتام پر ان کے حوالے کردیتا تھا۔ سو آج یہ ترکیب کارگر ٹھہری تھی۔
باہر آکر اس نے گیٹ کے گرد دور دور تک کھڑی گاڑیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی تو بالکل قریب کھڑی گاڑی کا ہارن زور سے بجا تھا۔ وہ بے ساختہ متوجہ ہوئی تھی۔
عباس کو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان دیکھ کر وہ پاس آئی تو اس نے دروازہ کھولا تھا۔
"سر! آپ نے کیوں زحمت کی؟" اس نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ تکلفاً پوچھنے لگی تھی۔
"میں نے سوچا آج آپ کو لاہور کے سارے تھانے دکھا دیے جائیں تاکہ آپ شناخت کرلیں کہ آپ کا ہاسٹل کس تھانے کے سامنے ہے؟" اس کے پرلطف انداز پر وہ خجل ہوکر خاموش ہورہی تھی۔
"مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو۔ تھوڑی سی لانگ ڈرائیو کرلیتے ہیں۔ آپ کو اس شہر کے راستوں سے تھوڑی بہت واقفیت بھی ہوجائے گی اور میں اپنی بات بھی کرلوں

گا۔"

"جی۔!" وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آر یو اینگیجڈ؟"

"نہیں سر۔!" اس کی دھڑکنوں میں عجیب سا ارتعاش پھیلا تھا۔ وہ خاموش رہا تھا۔

پھر دھند بھری شام میں لاہور کی سڑکوں پر جہاں حد نگاہ بہت کم تھی' بہت ہلکی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے' بہت نرم سی گفتگو کرتا عباس ملک اس کے ہمراہ تھا۔ بہت عام سی باتیں تھیں۔ نہ کوئی عہد و پیمان ہوئے' نہ کسی سنہرے مستقبل کے خواب عباس نے اسے دکھائے' نہ جینے مرنے کی کوئی قسمیں تھیں' مگر نہ جانے' ایسی جادو بھری شام تھی یا پھر یہ عباس کی سحر انگیز شخصیت کا کمال تھا یا آنکھوں سے لپکتے ان کے جذبوں کا۔ فروا کا دل اس شام کا اسیر ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ چیمبر سے اٹھ کر الیاس کی طرف آیا تھا۔ گاڑی گیٹ سے باہر کھڑی کر کے اس نے دستک دی اور کھلے دروازے سے اندر چلا آیا تھا۔

"ارے عباس تم! اتنے دنوں بعد شکل دکھائی۔ خیریت تو تھی۔ کہاں رہے؟" الیاس جو دستک کی آواز پر نکلا تھا اسے دیکھ کر خوش اخلاقی سے ملا تھا۔

"انسٹی ٹیوٹ کی طرف اسٹوڈنٹس کو پیپرز دلوانے لاہور چلا گیا تھا پچھلے ہفتے واپس آکر چیمبر کی مصروفیات نمٹا رہا ہوں۔" وہ باتیں کرتا ہوا اندر کی طرف چلا آیا تھا۔

"آج بڑی خاموشی ہے۔ باقی لوگ کدھر ہیں؟" وہ وسیع و عریض لاؤنج میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر پوچھ رہا تھا۔

"گھر پر ہی ہیں۔" الیاس نے غائب دماغی سے جواب دیا تھا۔

"تم بیٹھو میں ذرا چائے کا کہہ دوں۔" الیاس اٹھ کر چلا گیا۔ وہ فرصت سے سوچنے لگا کہ آج جس معاملے میں وہ الیاس سے مشورہ کرنے آیا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔

ایک عدد منگیتر رکھتے ہوئے وہ فی الفور فروا کے بارے میں بات کر کے حویلی میں بھونچال لانے کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ وہ الیاس اور بھابھی کو فروا کے گھر بھیجتا اور فروا کی والدہ کا عندیہ جاننے کے بعد ہی حویلی میں بات کرتا۔ تب ہی کونے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور منہ بسورتی ہما بچی کو اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی اور اسی کمرے کے کھلے دروازے سے زور زور سے آنٹی کی آوازیں آنے لگیں۔ عباس کو احساس ہوا شاید وہ غلط وقت پر آگیا ہے۔ تب ہی پریشان سا الیاس واپس اس کے پاس آن بیٹھا تھا۔

"کوئی پریشانی ہے الیاس؟" ان کے درمیان اتنی بے تکلفی تھی کہ پوچھنے سے باز نہ رہ سکا۔ الیاس کی پوری فیملی کے لیے وہ گھر کے ایک فرد کی طرح تھا۔ اس لیے تو ڈرائنگ روم کے بجائے لاؤنج میں براجمان تھا۔

"ہما کے شوہر نے اس کی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔" ہما الیاس کی سب سے چھوٹی بہن تھی جس کی ڈھائی سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ اب وہ ایک بچی کی ماں تھی۔

"سخت ذلیل شخص ہے۔ باہر سے اسپیشلائزیشن کر کے آیا تھا۔ ہم نے سوچا برائٹ فیوچر ہے۔ مگر وہ تو فراڈ نکلا۔" وہ دانت پیس کر عباس کو بتانے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سیکنڈ سمسٹر کے ایڈمیشن کے لیے کالج میں فیسیں جمع ہو رہی تھیں۔ اس نے فروا کو کالج میں آنے کے لیے کہا اور اب رافع کے آفس میں انتظار کر رہا تھا۔

"سر! مجھے دیر ہو گئی۔ آئی ایم۔۔۔"

"اٹس او کے آئیں بیٹھیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کر صوفے پر آن بیٹھا اور اس پر ایک نظر ڈال کر

کاغذات کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"سر! آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے کوئی بات کرنی ہے؟"
"ہاں فروا۔ ایکچوئلی میں چاہتا ہوں کہ آپ نیکسٹ سیمسٹر کی فیس مت جمع کروائیں۔"
"کیوں سر!" وہ حیران ہوئی۔
"آپ اس ڈگری کا کیا کریں گی؟" جواباً وہ سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا۔
"سر! یہ بہت ویلیوایبل ڈگری ہے۔ سر لوگ کہتے ہیں اس کے ساتھ کسی بھی اچھی کمپنی میں جاب مل۔۔۔"
"آپ کو کبھی بھی کسی کمپنی میں جاب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا تھا۔
"آپ یہ بتائیں کہ میرے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آئی مین! میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہوں تو۔۔۔؟" وہ اس کے چہرے پر نظر جمائے انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"سر! آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ اتنے اچھے ہیں کہ آپ جیسا کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور میں بہت اچھا فیل کرتی ہوں آپ کے ساتھ۔ سر! مجھے لگتا ہے آپ اچھے ہیں مگر میں بہت عام سی ہوں۔۔۔"
اس کے معصومانہ سے اظہار نے اسے ہلکا پھلکا کر ڈالا تھا۔ مگر وہ خود کو عام سی کیوں کہہ رہی تھی، کتنی خاص تھی یہ تو کوئی عباس ملک کے دل سے پوچھتا۔ تب ہی تو عباس "فروا!" سے ٹوک گیا۔
"آپ بالکل بھی عام سی نہیں ہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں اور کتنی اچھی ہیں۔۔۔ یہ میں آپ کو تب بتاؤں گا، جب آپ، میرے گھر میری دلہن بن کر آئیں گی۔ کیونکہ میں وقت سے پہلے اظہار کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ جلد از جلد آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔"
جواباً وہ شرگیں نگاہیں جھکائے خاموش رہی۔
"فی الحال میں اپنے دوست اور اس کی مسز کو آپ کی مدر کے پاس بھیجوں گا۔"

✿ ✿ ✿

وہ دل ہی دل میں آج ہی مما سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے انسٹی ٹیوٹ سے نکلی تھی۔ اور سارا راستہ گاڑی میں یہی سوچتی آئی تھی۔ جونہی گاڑی گیٹ کے اندر رکی وہ بے ساختہ اپنے خیالوں سے چونکی تھی اور اسی بے ساختگی میں اس کی نظر آصف کی گاڑی پر پڑی اور حلق تک کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ اس کی مما فارینہ بیگم کا سوشل سرکل جتنا وسیع تھا۔ فروا کی زندگی اتنی ہی محدود تھی۔ اس کی زندگی پڑھائی اور مما کے گرد گھومتی تھی۔ وہ ان لوگوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جو مما کے بہت خاص ہوتے تھے مگر ان میں ڈاکٹر آصف ایسی ہستی تھی جسے وہ مما کی خاطر برداشت کرنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھ سکتی تھی۔
"فروا! ادھر آؤ۔" ڈرائنگ روم کے سامنے سے دبے پاؤں گزری تو مما نے پکار لیا۔ مجبوراً وہ دروازے پر ٹک گئی۔
"اتنی دیر کر دی۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" آصف نے بانہیں پھیلا کر کہا تھا۔
"آؤ بیٹھو۔ آصف کو کمپنی دو۔ مجھے ذرا کچھ کام ہے۔"
"مما پلیز! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ فریش ہو کر آتی ہوں۔" اس نے عذر تراشا تھا۔
"اوکے جلدی آنا۔" مما کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی تھیں۔
اور جلدی تو کیا اس کا وہاں سے بھی جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ پرس پھینک کر جو بستر میں گھسی تو شام ہونے پر مما کے حضور طلبی پر باہر آئی تھی۔
"آصف کے ساتھ تمہارا رویہ کچھ زیادہ روڈ نہیں ہو گیا؟ میں نے تمہاری تربیت ایسی تو نہیں کی تھی فری!" وہ خاصے سخت انداز میں بازپرس کر رہی تھیں۔
"مما پلیز! مجھے مجبور نہ کیا کریں کہ میں آصف صاحب کے ساتھ اخلاق کے مظاہرے کروں۔" وہ

ان کے پاس بیٹھتے ہوئے رکھائی سے کہہ رہی تھی اور فارینہ بیگم نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور خاموش ہو رہیں۔

"ہونا تو وہی ہے جو میں چاہوں گی۔ بس تھوڑا آصف کی بے تابیوں کو ہوا دے دوں۔ اچھا ہے۔ جتنا اگنور کرے گی۔ اتنا ہی بے تاب ہو گا۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"بیٹا! ایک ذرا سی خوش اخلاقی انسان کے کتنے بگڑے کام درست کر دیتی ہے۔ اس کا اندازہ ہے تمہیں؟" وہ نرم پڑ کر کہہ رہی تھیں۔

"اچھا ماما! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"ہاں بولو۔" انہوں نے چینل سرچ کرتے ہوئے اجازت دی تھی۔

"ماما! سر عباس ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں۔ بلکہ گھر والوں کو لانا چاہتے ہیں۔" فارینہ کا چینل سرچ کرتا ہاتھ ساکت رہ گیا تھا۔

"وہ ہمارے گھر کیوں آنا چاہتا ہے اور تم اتنی سمجھ دار کب سے ہو گئیں کہ ان باتوں کے فیصلے کرنے لگیں۔" ان کا انداز اتنا سخت تھا کہ فروا حیران ہو گئی تھی۔

"کیوں ماما! میں اپنی زندگی کے بارے میں اچھا برا سوچنے کا حق بھی نہیں رکھتی؟" جواباً اس کا سوالیہ لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کے انداز نے فارینہ بیگم کو بھی حیران کر ڈالا تھا۔ انہیں اپنا اطمینان خاک ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"میں مر گئی ہوں جو تم اپنا اچھا برا سوچنے لگیں۔ ساری زندگی میں نے تمہارے لیے وقف کر دی اور آج تم یوں بات کر رہی ہو، جیسے میں کوئی تھرڈ پرسن ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"یہ تم نے کیا بے وقوفی کی۔ اگر وہ پلاٹ تمہارے نام پر رہتے تو تمہیں کون ستا سکتے تھے۔" تمام صورت حال جان کر اسے غصہ آیا تھا ہما کی بے وقوفی پر۔

"بھائی جان! میں نے یہ سوچ کر ان کا پاور آف اٹارنی اس کے حوالے کیا تھا کہ بیچ کر ہاسپٹل بنائے گا تو یہ انویسٹمنٹ فیوچر میں ہمارے کام آئے گی مجھے کیا پتا تھا کہ وہ یوں راستہ بدل لے گا۔"

"عباس بیٹا! ہم نے اسے وہی دو پلاٹ ہی تو دیے تھے۔ باقی تو جہیز میں صرف پچاس تولے سونا گاڑی اور معمولی سا فرنیچر تھا۔ یہ تو سمجھو لٹ ہی گئی۔" الیاس کی والدہ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اس نے پلاٹ بیچ دیے۔ ان سے ہاسپٹل بھی بنا لیا اور اب اس بات کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اس طرح پراپرٹی ٹرانسفر ور سیل ہونے کے بعد کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی۔ اور تم اتنی بے خبر کیوں رہیں؟ اتنا اندھا اعتماد کیا ہی کیوں؟" اس نے ہما کی طرف توجہ کی جو سب کچھ لٹا کر بے بس بیٹھی تھی۔

"یہ تو اب بھی بے خبر ہی رہتی مگر مجھے اس کے اس کرپٹ عورت کے گھر آنے جانے کا پتا چلا تو کھوج لگالی ورنہ تو اس نے ابھی خواب خرگوش میں ہی رہنا تھا۔" الیاس سے بڑے اکرم کا انداز خاصا چبھتا ہوا تھا۔ والدہ نے جواباً "ایک تادیبی نظر اکرم پر ڈالی تھی۔

"یہ اس کے ساتھ بھاگ کر نہیں گئی تھی' تم لوگوں نے رخصت کیا تھا۔ سوالی ہوتی نا اتنی چھان بین کہ آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں اماں! پہلے ہی یہ دھوکا کھا کر بیٹھی ہے آپ لوگ۔ اسے اور کچوکے نہ لگائیں۔" بڑی بھابھی نے بھی انہیں ٹوکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تو جاؤ بھاگ جاؤ اس کے ساتھ' کر لو اپنی مرضی کا فیصلہ' کورٹ میرج کرا لو۔"

"ماما!" وہ ششدر ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیوں اپنے فیصلے میں شریک کر رہی ہو۔"

"ماما! وہ بہت اچھے ہیں آپ ان سے ملیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔"

"مجھے خوش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم خود ہی بھگوڑے ڈالنے کے لیے کافی ہو۔"

"ماما! آپ انہیں دیکھے بغیر کیسے ریجیکٹ کر سکتی ہیں؟"

"میں کسی انجان بندے پر تمہارے معاملے میں اعتبار کر ہی نہیں سکتی۔۔۔ لوگ نظر کچھ آتے ہیں' ہوتے کچھ ہیں۔"

"تو کون ہے اپنا جس پر آپ اعتبار کریں گی' ہمارا ایک دوسرے کے سوا ہے ہی کون۔۔۔ ایسے کون سے اپنے بیٹھے ہیں جن پر آپ اعتبار کریں گی۔" اس نے عاجزی سے پوچھا تھا۔

"کیوں آصف نہیں ہے' اتنا ویل ایجوکیٹڈ' ویل اسٹیبلشڈ۔"

"ماما!" وہ بدک گئی۔ جس سے مجھے بات کرنا گوارا نہیں' اس کے ساتھ آپ میری زندگی کا فیصلہ کرنے جا رہی ہیں۔"

"یہ تمہارا بچکانہ پن ہے اور دماغ مت چاٹو میرا۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔"

"ماما! میں عباس کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور فارینہ بیگم نے اس کے حتمی تیور بہت غور سے دیکھے تھے۔ انہوں نے اسی وقت آصف کا نمبر ملایا تھا اور اگلا دن فیصلے کا دن طلوع ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نیکسٹ ویک آصف کے ساتھ تمہیں منگنی کی ڈیٹ فکس کر رہی ہوں۔" انہوں نے ناشتے کی ٹیبل پر اطلاع دی تو اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"اگر آپ نے ایسا کیا تو میں واقعی کورٹ میرج کر لوں گی۔" اس نے اپنے تئیں انہیں دھمکی دی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر میرے زندہ رہنے کا تو کوئی جواز نہ ہوا نا؟" انہوں نے بے چارگی بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ فروا کے خیال میں یہ دھمکی برائے دھمکی تھی مگر انہوں نے اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ محض آدھے گھنٹے بعد ملازمہ چیختی ہوئی فروا کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی تھی۔

فارینہ بیگم نے سلیپنگ پلز کی ایک مقدار کھالی تھی اور بے ہوشی کی حالت میں انہیں فروا روتے ہوئے جھنجوڑ رہی تھی۔ ڈرائیور اور ملازمہ کی مدد سے وہ انہیں آصف کے ہی اسپتال لے کر آئی تھی کہ پتا نہیں کوئی اور اسپتال یہ کیس لینے کو تیار ہوتا یا نہیں۔

☆ ☆ ☆

پتا نہیں کیا بات تھی۔ فروا نہ تو اس کی کال اٹینڈ کر رہی تھی نہ ہی کسی میسج کا جواب دے رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ کالج چلا آیا تھا اور رفع سے کہہ کر اس کی ایک قریبی دوست کو آفس میں بلوایا تھا۔

"نہیں سر! مجھے تو نہیں پتا' بہرحال میں ایک دو روز میں پتا کر کے بتا دوں گی۔" اس کے استفسار پر حورعین نے کہا تھا۔

"آپ کبھی ان کے گھر نہیں گئیں؟"

"ایک دو بار' وہ بھی ضروری کام سے۔۔۔ اس کی مدر بہت اسٹرکٹ خاتون ہیں۔"

"اس کی مدر کا بوتیک کون سا ہے؟" اس نے پرسوچ انداز میں پوچھا تھا۔

"سر! میں آپ کو اس سے کنفرم کر کے بتا دوں گی۔" حورعین نے اسے یقین دلایا مگر اس کے مسلسل استفسار پر سوچ میں پڑ گئی۔

"سر! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔۔۔ آپ فروا کے بارے میں۔۔۔ آئی مین آپ اس کی بات مت کیا کریں۔۔۔ سر! شی از ناٹ آ گڈ گرل۔" عباس کو شاک لگا تھا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ حورعین بوکھلا گئی۔

"آئی مین سر! اس کی شادی ہو رہی ہے تو آپ۔۔۔" حورعین نے عباس کے سر پر گویا بم پھوڑ دیا تھا۔

"آئی کانٹ بلیو اٹ' آپ یہ سب کیوں کہہ رہی

ہیں۔" کافی دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا تھا۔

"سر! اگر آپ خاموشی سے سنیں تو میں فون پر اس سے بات کر کے آپ کو یقین دلا دیتی ہوں۔" وہ واقعی خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وہ بولنے کے قابل ہی کب تھا۔

حور عین نے دوسری طرف جاتی بیل کی آواز سن کر اسپیکر آن کر دیا تھا۔

"کیسی ہو فروا؟"

"فٹ فاٹ۔" دوسری طرف فریش سی آواز آئی تھی۔

"سر عباس تمہارا پوچھ رہے تھے۔ یار! تم انہیں کیوں نہیں بتا دیتیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

"کارڈ بنیں گے تو ایک کارڈ انہیں بھی بھجوا دوں گی۔ اب پہلے سے ہر ایک کو کیا انفارم کرنا۔ آج کل بزی بھی بہت ہوں۔" فروا کا انداز لاپروا تھا۔

"وہ بار بار پوچھ رہے تھے تو میں۔"

"تو تم انہیں بتا دیتیں میری طرف سے۔ یہ سر عباس تو بالکل پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ذرا سا فرینک ہو کر بات چیت کیا کرلی پتا نہیں کون کون سے خواب دیکھنے لگے۔" اور عباس مزید کچھ سنے بغیر ہی آفس سے نکل آیا تھا۔

"سر! اٹھ کر باہر چلے گئے ہیں۔" حور عین نے افسردہ سے انداز میں بتایا تو فروا کچھ دیر خاموش رہی۔

"میں نے ٹھیک کیا نا حور عین! محبت کے بجائے نفرت میں جینا آسان ہوتا ہے۔"

اگلے پل اس کی سسکیاں ابھری تھیں اور پھر فون بند ہو گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

زمانہ دوست ہو جائے تو بہت محتاط ہو جانا
کہ اس کے رنگ بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے
کوئی جو خواب دیکھو تو اسے فوراً بھلا دینا
کہ نیندیں ٹوٹ جانے میں ذرا سی دیر لگتی ہے
کسی کو دکھ کبھی دینا تو اتنا سوچ کر دینا
کسی کی آہ لگنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے
بہت ہی معتبر ہیں جن کو محبت راس آجائے
کسی کو راہ بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے



وہ تین دن سے کمرے میں بند تھی۔ اور آج نہ جانے کیوں اس کا دل اس قدر گھبرایا کہ بے اختیار حور عین کے طرف جانے کے ارادے سے نکلی تھی۔

پرس لے کر اس نے سر پر دوپٹا اچھی طرح سے جمایا اور آئینے میں اپنا ستا ہوا چہرہ ایک نظر دیکھ کر ماما کے کمرے کی طرف آگئی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے آنے والی آواز نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

"میری پلاننگ کی داد دو' کیسے ڈراما رچا کر میدان مار لیا میں نے۔ آصف تو اور بھی لٹو ہو گیا ہے۔ میری بوتیک میں انویسٹمنٹ کر رہا ہے۔" فارینہ بیگم کی کھنکتی ہنسی اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"یہ جو آصف کے سسرال والے ہیں۔ ان کو جس دن خبر ملی اسی دن شہزادی کی واپسی ہو جائے گی۔" آصف شادی شدہ تھا۔ یہ جان کر وہ حق دق تھی۔

"میں ایسا ہی کوئی رئیس زادہ دوبارہ ڈھونڈ لوں گی' اور پھر میرا دل کرتا ہے واپس آئے ابدال کا باپ تو اسے بتاؤں طوائف کیا ہوتی ہے۔ کسی فقیر کی جھگی کے باہر سے بھی بچہ اٹھا لیا جائے تو پولیس پیچھے۔ مگر یہ تو میرے شوہر کی عنایت ہے۔ بڑھاپا سنواروں گی اپنا۔" وہ زور سے ہنسیں اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔ الفاظ ٹکرا ٹکرا کر اس کے کانوں کو کانچ کی مانند زخمی کر رہے تھے۔ اسے مصلوب کر دینے والی ہستی کس قدر سرشار تھی۔

وہ دبیز کارپٹ پر قدم ہٹاتے ہوئے واپس مڑی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کہر آلود شام میں وہ سڑک بالکل سنسان تھی۔ بے خبری کا یہ عالم تھا کہ معلوم نہ تھا پاؤں کہاں رکھ رہی تھی کہاں پڑ رہے تھے اور اسی بے خبری میں اس نے اپنے قریب کچھ لوگوں کو محسوس کیا تھا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر ایک مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر آن ٹھہرا اور اس کی چیخ نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے گیٹ پر ہارن دے رہا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ ڈیش بورڈ سے اٹھا کر اس نے موبائل اسکرین پر نظر ڈالی۔ الیاس کا نمبر تھا۔ اس وقت نہ تو وہ کسی سے بات کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں تھا مگر الیاس۔۔۔

"ہیلو!" اس نے انتہائی بیزار انداز میں موبائل کان سے لگایا تھا۔

"عباس! فوراً گھر آؤ۔۔۔"

"میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو کل صبح میں چکر۔۔۔"

"نو نو عباس! پلیز اٹس ایمرجنسی۔" اس نے ایک نظر کھلے گیٹ پر ڈالی اور چوکیدار کو کچھ بتائے بغیر گاڑی موڑلی تھی۔

الیاس اور اکرم اس کے منتظر تھے۔ اندر لے جانے کے بجائے بیرونی راستے سے ہی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے اور دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

"بات یہ ہے عباس کہ ہم نے اس لڑکی کو کڈنیپ کروالیا ہے۔" الیاس نے اس کے بیٹھتے ہوئے بتایا تھا۔

"کس لڑکی کو؟" وہ بری طرح چونکا تھا۔

"وہی جس سے آصف شادی کرنے والا تھا۔"

عباس حیران پریشان ان دونوں بھائیوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"ہر مسئلے کا کوئی جائز حل بھی تو ہوتا ہے نہ کہ اپنی ہی گردن پھندے میں پھنسا لینا۔"

"چھوڑو بس۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟" اکرم نے اسے ٹوکا تھا۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"بازار کے عقب میں ہمارا ایک بنگلہ ہے وہاں رکھا ہوا ہے۔"

"آپ لوگ فوراً اس لڑکی کو چھوڑ دیں۔"

"یہ ناممکن ہے۔" الیاس نے قطعی انداز میں کہا تھا۔ عباس بھڑکا

"وجہ بھی تو سن لو۔۔۔ ہم ایسا ہی کرنے والے تھے۔ اسے ذرا دھمکا کر چھوڑ دیتے۔ اس کی ماں کو فون پر دو چار دھمکیاں دلوا دیتے لیکن ہم سے ایک غلطی ہوگئی۔ ہم ہما اور آسیہ کو لے گئے تھے تاکہ ملازمین تک بات نہ پہنچے۔ وہ لڑکی بار بار دروازہ پیٹ کر پوچھ رہی تھی کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ طیش میں آکر ہما نے دروازہ کھول دیا اور اسے بتادیا کہ وہ آصف کی بیوی ہے۔ اور آصف کے ساتھ دوستی کرنے پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔ اب اگر ہم اسے چھوڑتے ہیں تو تھانے عدالت میں وہ ہما کو بھی ملوث کرسکتی ہے اور اگر آصف کو پتا چلا تو وہ ہما کو فارغ کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگائے گا۔ ان ماں بیٹی نے اس کی عقل پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ وہ اپنی بچی کی بھی پروا نہیں کرے گا۔" الیاس نے اسے تمام تر تفصیل بتائی تھی۔

"اب میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"اصل میں ہم نے سوچا تھا کہ الیاس سے وقتی طور پر اس کا نکاح کردیتے ہیں۔ بعد میں اس کو طلاق دے دے گا لیکن آسیہ نے طوفان کھڑا کردیا۔" اکرم نے ایک بے تکی بات بیان کی۔

"عباس! تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ تم پر میرا ایک قرض ہے اور اگر زندگی نے تمہیں موقع دیا تو تم یہ قرض ضرور اتارو گے۔"

اس نے ناسمجھی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"میں اتنا کم ظرف تو نہیں کہ محض دو بوتل خون کی قیمت مانگوں مگر آج بہت مشکل میں ہیں ہم۔ آج تم میرا وہ احسان برابر کردو گے؟ کرو وقتی طور پر اس لڑکی کو اپنالو۔ بھلے بعد میں چھوڑ دینا۔ اور عباس یقین کرو تم ایک مرتبہ اس لڑکی کو دیکھو۔۔۔ اگر اس لڑکی کا کردار ٹھیک ہوتا تو کوئی اچھے سے اچھا انسان بھی اس کو رد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔"

"الیاس! اگر اس لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کریں اسے بتائیں کہ آصف کتنا بڑا فراڈیا ہے۔

شاید وہ سمجھ جائے۔"

"انہیں آصف کے کردار سے نہیں اس کی دولت سے دلچسپی ہے۔ میرے خیال میں وہ آصف کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ اب زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں ہے ہمیں فوراً نکلنا ہوگا۔"

"نام کیا ہے اس لڑکی کا۔" عباس نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"فروا۔" اکرم نے جواب دیا۔ عباس بری طرح چونکا تھا۔

اپنے سامنے عباس کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرانی سے پھٹ گئیں۔

"کیا سر عباس نے۔" اس نے سوچا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"اپنی ماں کو کال کرو اور اس سے کہو کہ تھانے سے تمہارے اغوا کی رپورٹ واپس لے۔" عباس نے اسے گھورتے ہوئے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہاری ماں نے میرے خلاف تمہارے اغوا کا پرچا کٹوایا ہے۔" فروا پر حیرانی کا ایک اور حملہ ہوا اور لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھاما۔

"آپ تھانے سے اغوا کی رپورٹ واپس لے لیں۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔"

"میری بات سنو۔ میں اتنی آسانی سے رپورٹ واپس نہیں لینے والی۔ میں اس ملک زادے کو تھانے' عدالت اور میڈیا میں اتنا خوار کروں گی کہ یہ خود ہی بدنامی سے گھبرا کر تمہیں چھوڑ دے گا۔" اس کی ماں بھپری تھی۔

"اگر آپ نے آج ہی درخواست واپس نہ لی تو میں آپ کے خلاف اپنے باپ کے قتل کا پرچہ درج کرا دوں گی۔"

ڈھیر سارے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کا چہرہ بھگو گئے تھے۔ دوسری طرف فارینہ بیگم کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ کال منقطع کر کے وہ واپس مڑی تھی۔

"آپ میری بات سنیں پلیز۔ مجھے آپ سے۔"

"نو نیور! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی ہے تم بس ایک بات یاد رکھنا' میں نے تم جیسی لڑکی کو اپنے نام سے صرف اس لیے باندھا ہے کہ تم جس لڑکی کا گھر تباہ کرنے جا رہی تھیں وہ میرے لیے بہنوں کی طرح ہے' اور زندگی میں مجھ سے کبھی کوئی توقع مت رکھنا۔" اس کا پتھریلا لہجہ اس کے اندر خوف کی ایک لہر دوڑا گیا تھا۔

"عباس پلیز۔" اس نے روک کر اس کا بازو تھاما۔

"ڈونٹ ٹچ می۔" اسے شدید غصے سے دھکیل کر وہ گھر کا مرکزی دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سے فروا کو اندازہ ہوا تھا۔



اس کی نیند اور تھکن سے بھری آنکھوں میں سناٹا جیسے ٹھہر گیا تھا۔ دریا کے کنارے بنی سڑک پر گاڑی اپنی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ ایک طرف دور تک شفاف دریا پھیلا تھا تو دوسری طرف سرسبز پہاڑوں پر لگے بڑی شان سے سر اٹھائے پھل دار پیڑ اپنے جھکاؤ پر نازاں تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود عباس ملک کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک بے رحم جذبہ تھا۔ اس جذبے کی سفاکی سے پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ بے خبر نہ رہی تھی۔ فروا کی آنکھیں ایک پل کے لیے اٹھیں' جہاں ماضی اونچی دیواروں کے درمیان بنے گیٹ پر گاڑی کا ہارن بج رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں گیٹ وا ہوئے تو جھٹکے سے گاڑی اندر آ کر روش پر رک چکی تھی۔ الیاس کے کہنے پر وہ اسے اپنی آبائی حویلی لے آیا تھا۔

عباس ملک اسی تند' تیز انداز میں نیچے اترا اور اتنے ہی تیز قدم اٹھاتا حویلی کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی اور اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد ایک نظر حویلی کے وسیع و عریض تاحد نظر پھیلے ہوئے دیواروں میں گھرے رقبے پر ڈالی تھی۔ سیاہ بل دار مونچھوں اور داڑھی والا

شخص گاڑی کے قریب آیا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹھٹھک گیا تھا۔

"آپ ملک عباس کے ساتھ آئی ہیں؟" وہ شاید گاڑی کو یہاں سے ہٹا کر پورچ میں لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو آپ اندر چلی جائیں نا۔" وہ گاڑی سے قدرے ہٹ کر اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تو مجبوراً اسے اترنا پڑا تھا۔

"سوہنی... اوئے سوہنی!" گاڑی سے اتر کر جب اس نے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا تو اس بندے نے سامنے سے گزرتی لڑکی کو آواز دی تھی۔

"یہ پروہنے ہیں ملک جی کے ان کو اندر لے جاؤ۔"

وہ سوہنی کی معیت میں اندر آئی تھی۔ اسے تو عباس نے یہ بتانا بھی گوارا نہ کیا تھا کہ وہ اسے کہاں لے کر آیا ہے۔ البتہ اس شخص کی بات چیت سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ یہ عباس ملک کی حویلی ہے۔

حویلی کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے بنے سٹنگ ایریا میں اس وقت حویلی کے شاید تمام افراد ہی جمع تھے۔ سوہنی کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی تھی۔

"کون ہے سوہنی؟"

"یہ میرے ساتھ آئی ہے بی بی جان!" سوہنی کے جواب دینے سے پہلے عباس خود ہی بول پڑا تھا اور اس کے جواب نے یہاں موجود افراد کو مزید حیران کر دیا تھا۔ اور بی بی جان کی آنکھوں میں کئی سوال اترے تھے۔

"ادھر آؤ بچی... یہاں بیٹھو میرے پاس۔" انہوں نے فی الوقت ان سوالوں کو ملتوی کرتے ہوئے اسے پاس بلایا تھا۔

"کون ہے یہ اور کس رشتے سے اسے یہاں لائے ہو عباس؟" اس کی ماں یعنی ثریا بانو کا انداز خاصا چبھتا ہوا تھا۔

"اماں! یہ میرے دوست کی دور پرے کی رشتہ دار ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں' یہاں رہ لے گی۔" پچھلے چند دنوں سے عباس کے رویے کو دیکھتے ہوئے فروا کو اس کے رویے پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔

"یہ یہاں رہے گی۔ کس حیثیت سے؟"

"کوئی حیثیت نہیں اماں! بس حویلی میں کام کاج کرے اور بس..." اور فروا کی نگاہیں اپنے پیروں پر ٹک گئیں۔

"ملازمائیں بھی ہم خاندان دیکھ کر رکھتے ہیں... ہمارے نوکر بھی نسل در نسل چلتے ہیں عباس! اس لڑکی کو یہاں لاتے ہوئے یہ بات نہیں سوچی تم نے؟" ثریا بانو نے علی الاعلان اپنی ناپسندگی کا اظہار کر ڈالا تھا۔

"بس کرو ثریا!" بی بی جان نے انہیں ٹوکا تھا۔

"جاؤ سوہنی جاؤ' اس بچی کو میرے کمرے میں چھوڑ آؤ۔" بی بی جان نے اسے ملازمہ کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت دی تھی۔

"مردانے حصے کی طرف بالکل مت جانا' گھر میں مرد آئیں تو بی بی جان کے کمرے میں بیٹھنا' اتنے سارے ملازم ہیں مگر پھر بھی ماشاءاللہ حویلی کے اتنے افراد کے کام پورے نہیں پڑتے... اب یہاں رہنا ہے تو کام کاج کرتی رہنا۔" دوسرے دن ثریا بانو نے اسے بلا کر ہدایات دی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو گویا ٹھہر سے گئے تھے۔ کیوں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا بس وہی جانتی تھی کہ اس مختصر سے عرصے میں اسے کیا کچھ برداشت کرنا پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ثریا بانو عملی طور پر حویلی کی کرتا دھرتا تھیں۔ عباس ملک اور عباد ملک کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں حویلی کی بڑی بہو ہونے کا درجہ بھی حاصل تھا۔ بی بی جان کے منہ سے جو بات نکلتی وہ ان کے بھائیوں اور بھابیوں کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی مگر عملی طور پر بی بی جان اپنے کمرے میں ہی مقیم رہتیں۔ وہ بے حد ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کے کمرے میں رہتے ہوئے فروا کو ان کی بے ضرر طبیعت کا اندازہ ہوا تھا۔

کچن سے ملحق ڈائننگ روم میں اس وقت ناشتے کے لوازمات پہنچائے جا رہے تھے' جب وہ بی بی جان

سے پوچھ کر ان کا ناشتا بنا لائی تو اس کے کان اپنے ذکر پر متوجہ ہوئے تھے۔

"بی بی جان! سارے ہی مرد باہر آتے جاتے آپ کے پاس سے ہو کر آتے جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ لڑکی ہر وقت آپ کے کمرے میں موجود ہوتی ہے تو انہیں جھجک ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں۔ اسے یہاں آئے اتنے دن ہو گئے اور عباس ایک بار بھی آپ کے کمرے میں نہیں گیا۔ ناشتے کھانے پر ملاقات ہو تو الگ بات ہے۔"

"بھابھی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ معوز کو بھی کوئی کام ہو آپ سے تو مجھے بھیجتے ہیں۔ خود جانے سے احتراز کرتے ہیں۔" چھوٹی چچی سائرہ نے بھی تائید کی تھی۔

"میرا خیال ہے اس بچی کو بچیوں میں سے کسی کے کمرے میں شفٹ کر دیں۔" معوز چچا نے رائے دی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے نمرہ بیٹا! آپ فروا کو اپنے کمرے میں ساتھ سیٹ کر لیں نا۔" بی بی جان نے روئے سخن نمرہ کی طرف موڑا تھا۔

"او ہلو بی بی جان۔۔۔ آپ کو پتا ہے مجھے اکیلے رہنے کی عادت ہے۔ یوں بھی میرے پیپرز شروع ہونے والے ہیں۔ مجھے اسٹڈیز کے دوران ڈسٹربنس ہو گی۔"

نمرہ دو ٹوک جواب دیتے ہوئے ذرا نہ ہچکچائی تھی۔

فروا نے ایک نظر لاتعلق بنے عباس پر ڈالی تھی۔

ثریا بانو کو پہلے دن سے اس کا وجود ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ انہوں نے سوہنی سے پوچھا تھا کہ اس کے کمرے میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس کے مثبت جواب پر وہ اس کے کمرے میں شفٹ کر دی گئی۔

بی بی جان کو اعتراض تو ہوا مگر اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

"بی بی جان! مہمان ایک دن کا ہوتا ہے' دو دن کا ہوتا ہے۔ مجھے کب تک رہنا ہے' پتا نہیں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کی ساتھ کہا تھا۔

انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

بی بی جان فروا کی زبانی جان چکی تھیں کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور وہ بھری دنیا میں اکیلی ہے۔ انہوں نے وہ رات اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی تھی۔

سوہنی نے اسے بتایا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس حویلی میں شادیاں راس نہیں آتیں' اس کی ایک مثال تو بی بی جان تھیں۔ ناکام ازدواجی زندگی کے بعد زندگی کے ماہ و سال بھائیوں کے ساتھ گزار رہی تھیں۔

دوسری مثال ایاز ملک تھے۔ جو دو شادیوں کے بعد چار بچوں کو یتیم کر کے روڈ ایکسیڈنٹ میں چند سال پہلے ملک عدم سدھارے۔

پھر ممتاز ملک تھے' جن کی پہلی شادی اس وقت انجام کو پہنچی جب ان کی بیوی دوسرے بچے کو جنم دیتے ہوئے فوت ہو گئیں پہلی اولاد فواد تھا جو دوسری ماں کی عدم توجہ اور باپ کے دبئی شفٹ ہونے کے بعد بی بی جان کی توجہ کے باوجود اپنی ایک الگ روش اپنا چکا تھا اور جو نفرت اسے دوسری ماں سے ملی تھی' وہ ہر جگہ تقسیم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ایسے میں اس کی نظر کرم فروا پر پڑی تھی۔ اور اس کی نظریں فروا کو لرزا دیتی تھیں۔ بی بی جان دوسری حویلی رہنے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ حویلی کے اس اسٹور نما کمرے میں اسے اکیلے سوتے ہوئے تیسرا دن تھا۔ سوہنی کی ماں بیمار تھی اور وہ تین دن سے اس کی تیمارداری میں مصروف تھی' ایسے میں شبنم کے ساتھ کام نبٹاتے ہوئے اس پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ وہ دن بھر کے تھکے وجود کو لیے بستر پر دراز تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا اس اسٹور نما کمرے کے دروازے کو کوئی دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کے دروازے کے اندر سوہنی نے اینٹیں رکھ دی تھیں۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اگلے پل آہستگی سے دروازے کا پٹ وا ہوا اور اندر آتے وجود کو دیکھ کر فروا کی آنکھیں نہ صرف پوری کی پوری کھلیں بلکہ خوف کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

اس کا دوپٹا بستر میں رہ گیا تھا اور وہ دوڑتے قدموں

سے لاؤنج سے ہوتی ہوئی حویلی کے مکینوں کے رہائشی کمروں کی طرف دوڑی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ لٹیرے بھلا کب میدان میں ٹھہرتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ فواد تو اسے ہاتھ سے جاتے دیکھ کر کب کا مردانے حصے کی طرف رفوچکر ہو گیا تھا۔ اسے کس دروازے پر دستک دینی ہے۔ کہاں بچاؤ کے لیے فریاد کرنی ہے اور کہاں پناہ کی درخواست کرنی ہے۔ یہ سوچنے کی اس کے پاس فرصت نہیں تھی۔ بس لاشعور کے اندر یہ احساس تھا کہ کوئی اس کے سر پر اپنے سہاگ کی چادر ڈال کر یہاں لایا تھا۔ چاہے کسی اور کے علم میں نہ ہو مگر اس پر اس کی عزت و ناموس کی حفاظت فرض تھی۔ بھلے سے ان حالات میں سہی۔ مگر وہ جو رشتہ کاغذ پر بنا تھا۔ وہ اتنا مضبوط ضرور تھا کہ اس کے ننگے سر پر چادر ڈالنے کی ذمہ داری ضرور پوری کرے گا۔

اس احساس نے اسے عباس ملک کے دروازے پر دستک دینے پر مجبور کیا تھا۔ اور دستک کیا دیتی۔ وہ تو گویا دروازے سے ٹکرا کر اندر گرنے کے انداز میں داخل ہوئی تھی۔ اور عباس جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نیند کے احساس سے پلکیں موند چکا تھا' اس کے طوفانی انداز سے یک دم ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس پر نظر پڑتے ہی انتہائی خشمگیں انداز میں دریافت کیا تھا۔

"عباس۔۔۔!"

"کیا بات ہے آخر بولو بھی۔۔۔" اس کے لرزتے کانپتے سردی میں کسی دوپٹے یا چادر سے بے نیاز وجود پر ایک نظر ڈالی تھی۔

"وہ۔۔۔ مجھے۔۔۔ بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"بند کرو بکواس۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے۔۔۔ اگر اس وقت تمہیں یہاں کوئی دیکھ لے۔" طیش سے اس کی حالت بری تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ سوہنی نہیں ہے تو۔۔۔"

"بازاری عورت! اب یہ ہتھکنڈے استعمال کرو گی مجھ پر۔" اگلے پل اس نے دھکا دے کر باہر کرنا چاہا اور اس کا سر دروازے کے ہینڈل سے ٹکرایا تھا۔ اس کے سر میں درد کی ایک لہر اٹھی مگر۔۔۔ عباس کے الفاظ تھے یا پھر کوڑے۔۔۔ اس نے الفاظ ادا کیے تھے یا اسے کانٹوں پر گھسیٹ لیا تھا۔

چوٹ کے احساس سے سنبھل کر وہ لڑکھڑا کر باہر نکلی تھی اور اس نے کھٹ سے دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ مگر فروا نے وہ رات اس کے دروازے کے باہر گزار دی تھی۔ کئی بار سردی سے سن ہوتے وجود کے ساتھ اس کا دل چاہا وہ سامنے کچن میں جا کر چولہا جلا کر اس کے پاس بیٹھے مگر۔۔۔ وہ اتنی ہمت بھی نہ کر سکی کہ فواد کا خوف اس کے انگ انگ میں رچ گیا تھا اور جو تذلیل عباس نے سونپی تھی وہ روح سے لپٹ گئی تھی۔



کتنی سخت جان تھی وہ کہ گزری رات کے بعد بھی زندہ تھی۔ نم آنکھوں کے ساتھ وہ سر کی دھوپ کے نرم گرم احساس تلے حویلی کے صحن میں گھاس کو نوچتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

سوہنی واپس آ گئی تھی۔ اس کی طبیعت خراب محسوس کر کے اس کے کام بھی اپنے ذمہ لے لیے تھے۔

"اگر کبھی سوہنی پھر سے چھٹی پر ہوئی اور مجھے اکیلے سونا پڑا تو؟" صبح سے کتنی مرتبہ یہ سوال اس نے خود سے کیا تھا۔

سوچتے سوچتے یونہی اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کی نظر حویلی کے سامنے والے حصے پر پڑی تھی جہاں بیٹھا فواد کب سے اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رات تو پھر رات ہوتی ہے یہاں تو دن میں کئی بار اسے اس کی غیر مہذب نظروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں طیش کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اس کے سر پر آن ٹھہری تھی۔

"زہے نصیب! آج تو لوگ خود ہمارے پاس چل کر آ گئے۔"

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"کیوں نہیں بھئی آپ کی بات نہیں سنیں گے تو۔" فواد نے شاید اس کا تم کہنا محسوس نہیں کیا تھا۔

"فواد! میں تمہارے بھائی کے نکاح میں ہوں۔ میرا نہیں تو اس کی عزت کا کچھ خیال کر لو۔" فواد کی آنکھوں میں دنیا جہاں کا استعجاب آن سمٹا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کیوں اتنے آسان الفاظ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے؟" اس کا لہجہ قہر آلود تھا۔

اگلے پل اس نے فواد کی نظروں میں ایک عجیب سی لہر دوڑتے دیکھی تھی۔ جسے شدید خوف یا غصہ یا پھر... وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"اگر ایسا ہوتا تو عباس خود نہ بتا دیتا... اسے کون سی مجبوری تھی؟"

"تمہارے ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو اپنے بھائی سے خود پوچھ لو۔"

فواد کی نظریں یوں جھکیں کہ پلٹنا ہی بھول گئیں۔ فروا نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے قدم واپسی کے لیے بڑھائے تھے۔ اور فواد تو رہائشی حصے کی طرف اگلے کئی دن نہیں آ سکا تھا۔ وہ بھلا عباس سے پوچھتا تو کیسے؟ اور عباس کو کیا جواب دیتا کہ اگر ایسی کوئی بات تھی تو اسے فروا سے کیوں پتا چلی تھی۔ جو بات فروا نے کسی اور کو نہیں بتائی' وہ فواد کو کیوں بتائی اور اس سے پہلے کہ وہ اس معاملے کا کھوج لگاتا' سب کچھ خود ہی سب کے سامنے آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عباس کا رشتہ ثریا بیگم کی بھتیجی سبحانہ سے طے تھا۔ وہ دبئی میں اپنے والدین کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ اگلے ایک دو سال میں جب اس کی تعلیم مکمل ہو جاتی تو شادی ہو جاتی۔ ممتاز کے بیٹے تھے تو وہ ارباز کی دوسری حویلی میں مقیم بیٹیوں یعنی عباس کی چھوٹی بہنوں سے منسوب تھے۔ عباد تھا۔ عباس کا چھوٹا بھائی' اس کا رشتہ نمیرہ سے ہونا زیر غور تھا اور فواد... بھلا وہ اس لڑکی کو کیا تحفظ دے سکتا تھا۔ کئی ہفتے بی بی جان نے فروا کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارے اور مہوز ملک سے بھی مشورہ کر ڈالا تھا۔ مہوز کا بھائیوں میں دوسرا نمبر تھا اور وہ بی بی جان سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ دونوں بہن بھائی پہلے آپس میں مشورہ کرتے اور پھر حویلی کے باقی مکینوں کو اس معاملے میں شریک کرتے تھے۔

ان کے ساتھ مشورے کے بعد انہوں نے غیر متوقع طور پر دوسری حویلی کا ایک چکر لگایا تھا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بھائی افراسیاب کی دلہن راحیلہ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھیں۔ راحیلہ کے بڑے بھائی سکندر کی شادی کے چند ماہ بعد بیوی سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ وہ آرمی میں میجر تھا اور بے حد سلجھی ہوئی عادات کا مالک... اس کے والدین پھر سے لڑکی کی تلاش میں تھے۔ راحیلہ نے کئی بار ذکر کیا تھا کہ انہیں کسی اچھی' خوش شکل لڑکی کی تلاش تھی' باقی بھلے سب کچھ واجبی ہو۔

"زریں! آپ کی راحیلہ سے بات ہوئی؟" واپسی سے اگلے دن ڈائننگ ٹیبل پر مہوز ملک بی بی جان سے پوچھ رہے تھے۔

"ہاں میری بات ہوئی تھی... راحیلہ تو سن کر بہت خوش ہوئی... فون ملا کر ماں سے میری بات کرائی تھی۔ ندرت تو میری بہت شکر گزار ہو رہی تھی کہ میں نے ان کے بارے میں اتنا اچھا سوچا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ شہر کی بڑے خاندان والیوں سے بھر پائی... بس کوئی گھل مل کر گھر بسانے والی لڑکی مل جائے تو سکون سے زندگی گزرے... دو ہفتے تک سکندر آ کر لڑکی دیکھ لے گا۔ باقی جس لڑکی کی تعریف آپ کریں گی۔ وہ یقیناً قابل تعریف ہی ہو گی۔" بی بی جان نے خوشگوار انداز میں ساری تفصیل بتائی تھی۔

"کس کی بات کر رہی ہیں بی بی جان؟" تمام افراد خاص توجہ سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ سائرہ نے تجسس سے سوال کر ڈالا تھا۔

"ارے یہ اپنی بچی فروا کی۔۔۔ میں نے راحیلہ سے بات کی ہے۔ اگر وہ سکندر کے لیے اس کا رشتہ لے لیں۔"

اور سب سے زیادہ لاتعلق بنے عباس کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ کر پلیٹ میں گرا تھا۔

"کیا مطلب بی بی جان! کیا بات کر رہی ہیں آپ؟" اس کے انداز پر سب کی توجہ اس کی طرف گئی تھی' بالخصوص فواد نے اس کی توجہ کو طنز سے دیکھا تھا۔

"تو اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ بچی اب ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کا اچھا برا سوچنا ہمارا فرض ہے۔" معوز ملک نے ناصحانہ انداز اختیار کیا تھا۔

"آپ لوگوں کو یہ سب سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا انداز ترش تھا۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اب کیا وہ اس حویلی میں ساری عمر پڑی رہے گی۔ ہم ہی اس کے سرپرست ہیں۔ اس کے مستقبل کی فکر نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔"

بی بی جان کی دلیل پر اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ یہ جانے بغیر کہ فواد اس کے متفکر انداز کو غور سے ملاحظہ کر رہا تھا' اس نے چمچہ دوبارہ اٹھالیا مگر بس ادھر ادھر ہلاتا رہا۔

"عباس! کھانا ٹھیک سے کیوں نہیں کھا رہے؟" ثریا بانو نے اس کی پلیٹ پر نظر ڈالی تھی۔

"ہفتے دو ہفتے میں سکندر آکر لڑکی کو دیکھ لے گا پھر۔" اس کی سوئی بی بی جان کے الفاظ پر اٹکی تھی اور اس نے ماں کی بات پر توجہ دیے بغیر فوری فیصلہ کیا تھا۔

"آج ہو یا کل۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سچویشن میں مجھے بتانا تو پڑے گا تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔"

"بی بی جان۔۔۔ آپ اس سلسلے کو رہنے دیں۔ میں اس لڑکی سے نکاح کر کے اسے یہاں لایا ہوں۔" اس نے گویا وہاں موجود افراد کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو عباس!" ثریا بانو کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"پہلے اس بے آسرا لڑکی کو ہمارے سر پر بٹھا دیا اور اب بیوی کی حیثیت سے متعارف کرا رہے ہو۔" ثریا بانو کی چیخ تو زکچن میں کام کرتی ملازماؤں کے ساتھ فروا تک بھی پہنچی تھی۔

"بیوی کی حیثیت سے نہیں۔۔۔" عباس نے گڑبڑا کر وضاحت کرنا چاہی۔

"تو نکاح کے بعد تمہارا اور کون سا رشتہ بنتا ہے اس لڑکی سے۔ میں تو پہلے دن ہی کھٹک گئی تھی۔ عباس! اب ہم حیات لالہ کو کیا جواب دیں گے؟" معوز چچا کچھ ناگواری اور بے چارگی کے احساس سے مغلوب ہو گئے تھے بی بی جان بے حد حیران اور بالکل خاموش تھیں۔

☆ ☆ ☆

تین دن سے نہ صرف بی بی جان نے چپ سادھ رکھی تھی بلکہ حویلی پر جیسے وہی سناٹا ساطاری تھا۔ اس روز اس معاملے کا فیصلہ کرنے کے لیے حویلی کے سب بڑے بی بی جان کے کمرے میں موجود تھے۔

"نہیں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہی ثریا! بھلے تمہاری اپنی بیٹیاں نہیں ہیں مگر تم خود تو کسی کی بیٹی ہو نا' تمہاری کوئی حق تلفی نہیں ہوئی تھی۔ ارباز نے تمہارے حقوق پورے کرتے ہوئے جب دوسری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا تو تمہارے والدین پر کیا گزری تھی۔ تم نے کتنا واویلا مچایا تھا۔ شوہر کے گزرنے کے پانچ سال بعد بھی تم کو اس کی بیوی اور اولاد کی شکل دیکھنا گوارا نہیں ہے۔ اور جب تمہارا بیٹا کسی کی حق تلفی کر رہا ہے۔ کسی یتیم' بے آسرا لڑکی کو شرعی بندھن میں باندھ کر اس سے غافل ہے تو بجائے اسے سمجھانے کے' اسے خوف خدا دلانے کے تمہیں اپنے بھائی کی فکر پڑی ہے نہ اس لڑکی میں ایسا کون سا نقص ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اور۔ سمجھانے کے لیے بھی اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے

اچھا ہی ہو گا۔" طویل بات کے اختتام پر انہوں نے کہا تھا۔

"اور عباس! تم کوئی فیصلہ کرو۔ یا تو فروا کو وہ حیثیت دو جس کی وہ حق دار ہے یا پھر اسے فارغ کر دو۔ کوئی برا بھلا طلاق کے بعد اسے مل ہی جائے گا جو اس کا ہاتھ تھام لے گا۔"

انہوں نے دوٹوک انداز میں عباس سے کہا تھا۔

"معوذ! تم ہی ان ماں بیٹے کو سمجھاؤ۔ تم کیوں خاموش بیٹھے ہو۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے اپنے بچوں کی تربیت میں ایسی کون سی کسر چھوڑ دی ہے جو یہ شتر بے مہار بنے پھرتے ہیں۔"

بی بی جان اکے اکھڑے انداز پر عباس خاموش ہو کر ان کے ناگوار تاثرات ملاحظہ کرتا رہ گیا تھا۔

"میرا بھائی مجھ سے قطع تعلق کر لے گا بی بی جان!"

ثریا بانو نے اپنا رونا رویا تھا۔

"سمجھ دار ہوا تو ایسا نہیں کرے گا۔ کیا اسے نہیں پتا کہ یہ فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں اور ان ساری باتوں سے کیا مطلب ہے۔ تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ اس لڑکی سے جان چھڑالی جائے کسی طرح؟"

بی بی جان کبھی اس انداز میں بات نہیں کرتی تھیں۔ اگر کرتی تھیں تو حویلی کے مکینوں کو خاموش ہونا ہی پڑتا تھا۔

☼ ☼ ☼

بی بی جان بصد اصرار اسے عباس کے کمرے میں چھوڑنے آئی تھیں۔

"آئیں بی بی جان۔۔۔ آپ مجھے بلوا لیتیں۔" وہ جو بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا انہیں آتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"مجھے تمہاری نالائقی نے یہ زحمت گوارا کرنے پر مجبور کیا ہے۔" بی بی جان جوابا" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"آؤ فروا بیٹھو۔۔۔ کھڑی کیوں ہو؟" وہ ان کی بات پر مسکراتے ہوئے پہلی بار اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

بی بی جان کے ساتھ وہ بھی بیڈ کے کونے پر ٹک گئی۔ عباس بی بی جان کے ساتھ خوشگوار موڈ میں گپ شپ کرتا رہا۔ اور جونہی وہ کمرے سے نکلیں۔ اس کا انداز سنجیدہ اور پرسوچ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک خشونت بھری نظر اس پر ڈالی اور ذرا سا رخ موڑ کر سائیڈ پر رکھی کتاب دوبارہ سے اٹھالی تھی۔ اور فروا کے لیے تو وہ ایک نگاہ ہی کافی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس کی زندگی میں اس کا موجودہ مقام کیا ہو گا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ جاتی اور اگر اٹھ جاتی تو جاتی کہاں؟

تقریباً" گھنٹہ ڈیڑھ مطالعے کے بعد اس نے کتاب بند کر کے لائٹ آف کی اور کمبل تان کر سو گیا۔ وہ سن ہوتے وجود کے ساتھ اندھیرے کو دیکھتی رہی۔ احساس اس قدر جامد تھے کہ اسے اپنے گالوں پر بے آواز لڑھکنے والے آنسوؤں کا بھی احساس نہ تھا مگر کب تک' بھوک اور نیند انسان کو عطا کی جانے والی وہ جبلتیں ہیں' جو احساس پر حاوی آجاتی ہیں۔ نہ جانے کتنی دیر گزرنے کے بعد وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ آہستہ سے اپنے اور سوہنی کے مشترکہ کمرے کا دروازہ دھکیلا تھا۔ اندر آکر اپنا کمبل اور تکیہ اٹھایا اور واپس عباس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

صوفے پر نڈھال اپنے ناپسندیدہ وجود کو کمبل میں چھپاتے ہوئے کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے کم از کم اس ذلت کے احساس کو ٹٹولنا چاہا جو آج کے دن اس کا مقدر ہوئی تھی' مگر وہ کچھ سوچنے میں ناکام رہی ۔۔۔ وہ ناکام ہی تھی۔ اس نے ہمیشہ ناکام ہی رہنا تھا۔ یہ اس کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ اس کے وجود سے لپٹی سانس لیتی پروان چڑھتی دن بدن بڑھتی نفرت کا فیصلہ تھا۔

بی بی جان نے سختی سے اس کے حویلی کا کوئی بھی کام کرنے پر پابندی لگادی تھی۔ ہاں اس نے عباس کے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ وہ اس کے لیے ناشتا بناتی' کھانا بناتی' اس کے کپڑے ملازمہ سے دھلواتی' خود استری کرتی اور عباس۔۔۔ وہ بے تکلفی سے اس

سے ناشتا کھاتا۔ لگتا اس سے اس قدر خوش اخلاقی سے پیش آتا کہ کئی بار وہ ہونق ہو کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی مگر یہ سب کچھ تو سب کے سامنے تھا اور جو کچھ وہ سب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ یہ تھا کہ اپنے کمرے میں وہ اس سے کلام کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتا۔ ان ہی دنوں بی بی جان نے ولیمہ کا شوشا چھوڑ دیا تھا جو ممتاز چچا کی بیٹی وردہ کی رخصتی کے ساتھ طے پایا تھا۔

بہار کے اولین دنوں میں جب کلیاں چٹکنے کو بے تاب تھیں۔ اسے حویلی کی باضابطہ بہو کا درجہ مل گیا تھا۔ اسے ہنسی آئی تھی۔

کئی بار بی بی جان اس سے پوچھتیں۔ عباس اس کے ساتھ ٹھیک سے پیش آتا ہے وہ خوش تو ہے نا؟ اور وہ انہیں مطمئن کر دیتی۔ البتہ ثریا بانو کی آنکھوں سے تمسخر چھلکنے لگتا' جب بھی وہ عباس کے آگے پیچھے پھرتی۔



اس پرشور اور پر رونق حویلی میں سناٹے بھری جامد زندگی گزارتے اسے چار سال بیت چلے تھے اور ان چار سالوں میں عباس نے اسے کیا دیا تھا۔ بہت کچھ۔ بے تحاشا نفرت اور حقارت سے نوازا تھا۔ لاتعلقی کی مار کے کوڑے اس کی تمنا روح پر برسائے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ فروا نے اس کی طرف کبھی پیش رفت نہیں کی تھی۔ کتنی دفعہ اس سے معافی مانگنے اور اسے حقیقت بتانے کی کوشش کی مگر عباس ملک کے دل پر نفرت کی جو گرد جمی تھی وہ اسے صاف کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ سے حویلی میں آئے ایک سال ہونے کو تھا یہ تب کی بات تھی کہ اسے شیفون کے کپڑوں میں ٹھٹھرتے دیکھ کر سائرہ چچی نے ٹوکا تھا۔

"فروا! عباس سے کہو' تمہیں شاپنگ کرا لائے' کچھ سویٹر اور شالیں دلا دے۔"

جو آپ کو ڈھیروں حقارت اور نفرت سے نواز رہا ہو۔ آپ اس سے کیا مانگیں' مگر یہاں اس کی مجبوری تھی۔ حویلی کی عورتوں کو نت نئی شاپنگ' بننے سنوارنے میچنگ اور مقابلے کا جنون تھا۔ ایسے میں وہ کسی کی تنقیدی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

دو تین دن سوچنے کے بعد اس نے عباس سے بات کرنے کی ٹھانی تھی۔

"میرے پاس سردیوں کے کپڑے نہیں ہیں۔ آپ آپ لا دیں گے؟" وہ خاموش رہا تھا۔ اگلے کئی دن گزر جانے کے بعد بھی جب اسے اپنی بات کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تھا۔

"میرے پاس ایک چین ہے۔ اگر میں سوہنی کو بھیج کر سنار کو بیچ دوں؟ میرے پاس سردیوں کے کپڑے نہیں ہیں۔"

"اب ایسی نیچ حرکتیں یہاں بھی کر کے مجھے بدنام کرو گی۔"

اس نے والٹ سے کافی سارے نوٹ نکالے مگر اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے کمبل پر پھینک دیے تھے۔ گویا وہ سے موسم کے سرد و گرم سے بچنے کے لیے چند جوڑے کپڑے کے بھی لانے کا روادار نہیں تھا مگر یہ بھیک۔ اس نے کمبل پر پھینکے جانے والے نوٹوں پر نظر ڈالی اور سمیٹ لیے اور پھر اسے عباس کی طرف سے جو بھی ملا وہ اس نے اسی طرح سمیٹنا تھا۔ چاہے نفرت اور دکھ ہی سہی۔

بی بی جان اس کی گود خالی ہونے پر تشویش کا اظہار کرتیں اور انہوں نے اسے عباس کے ساتھ شہر بھیج دیا تاکہ وہ ڈاکٹر سے چیک اپ کرائے۔ وہ دو دن اس کے شہر والے گھر میں رہ کر تیسرے دن لوٹ آئی تھی۔ اس نے پھر ہمت کی تھی۔ خود کو سنوارنے پر توجہ دی تھی۔ مگر اس کا نتیجہ بھی صفر نکلا تھا۔ سیاہ کڑھے ہوئے سوٹ میں عباس کو جوس دینے کمرے میں آئی تھی اور گلاس ٹیبل پر رکھنے کے بجائے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"رکھ دو یہاں۔" عباس نے ایک ناگوار نظر ڈالی اور پھر دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ گلاس اس کے پاس رکھ کر باہر

نہیں گئی یوں ہی کمرے میں چھوٹے موٹے کام نپٹانے لگی ادھر ادھر جاتی فروا کے ملبوس سے اٹھتی مسحور کن خوشبو اس کے حواسوں پر چھانے لگی تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آگیا اور ایک طنز بھری نظر اس پر ڈالی تھی۔

"تم کس خوشی میں اتنی تیار ہوئی ہو؟ میرا نفس اتنا بے لگام نہیں کہ یوں تمہارے بہکاوے میں آجائے۔" اس کی انگلیاں فروا کے بازوؤں میں گڑ گئیں۔

"کیا سمجھتی ہو ان بازاری حرکتوں سے تم مجھے اپنی طرف متوجہ کر لو گی؟" فروا کے دل میں جیسے اس نے کوئی نیزہ اتار دیا تھا۔

"مجھے یوں مت کہیں عباس!" اس نے جیسے التجا کی تھی آنسو بے ساختہ بہہ نکلے۔ اس کی سفید رنگت میں جذبات کی شدت سے گلابیاں گھل گئی تھیں اور ہلکی دوپٹا سر سے اتر کر کاندھے پر ڈھلکا تو اس کے ریشمی چمکدار بالوں نے گویا اس کے حسن کو دو آتشہ کر ڈالا تھا۔ مگر وہ عباس ملک تھا جس نے فروا کی قسمت میں اپنے ہاتھوں سے نارسائی لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس عورت کی قسمت میں جس کے ماضی پر کسی اور مرد کا سایہ تھا یوں فروا کے دل کی سرزمین سے امید اور گمان کے سارے پنچھی ایک ایک کر کے اڑتے چلے گئے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے صبر آگیا ہو۔ اس نے کئی راتیں روتے ہوئے گزاری تھیں۔ اور دنوں بے کل پھری تھی۔ مگر کوئی اس کا اپنا نہ تھا جس سے وہ اپنا دکھ اپنی پریشانیاں شیئر کرتی۔

کبھی اسے اپنا آپ یوں لگتا جسے قسمت نے سب کچھ عطا کر کے بھی محروم رکھا۔ یہ کیا کم تھا کہ اس کی عزت محفوظ رہی۔ وہ عباس ملک کی قسمت میں لکھ دی گئی۔ مگر یہ احساس کہ وہ عباس ملک پر مسلط کر دی گئی کسی ناگوار بوجھ کی طرح۔ یہ اذیت یوں اس کے دل کو اس طرح جلاتی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ گھٹن کا دروازہ بند ہوتا یا مرنے کا وہ زور زور سے سانس لینے لگتی کبھی کبھی سخت سردی میں چونک کر کمبل منہ سے اتارتی اور گھٹن کے احساس سے نکلنے کو باہر آ کر کھلے آسمان تلے اندھیری رات میں آن کھڑی ہوتی۔ مگر کون تھا جو اس سے پوچھتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ وہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان تنہا تھی اور تنہا ہی زندگی جیسے جا رہی تھی۔

ان ہی دنوں سبحانہ حیات اپنی فیملی کے ساتھ دبئی سے واپس آگئی اور حویلی میں نئی بحث چھڑ گئی۔ ثریا بانو کی یہی دلیل بہت کارگر تھی کہ چار سال کم عرصہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے اولاد کی اولاد کی خوشی دیکھنے کے لیے اتنا عرصہ انتظار کیا تھا اور پھر یہ کیا کم تھا کہ سبحانہ فروا کے ہوتے ہوئے بھی عباس کی زندگی میں شامل ہونے کو تیار تھی۔ وہ اسے ایک دوسری لڑکی کے ساتھ شیئر کرنے کو تیار تھی تو انہیں بھی اپنے وارث کی خوشی دیکھنے کا پورا حق تھا۔ اس حق سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

طلائی زیورات کے ڈبے کھلنے لگے۔ چمکتے دمکتے ملبوسات سرسرانے لگے اور قہقہے گونجنے لگے۔ سبحانہ اور ان کی فیملی چند دن رہنے کے بعد حیات ولا جا چکی تھی۔ بس کبھی کبھار ان کا چکر لگتا۔

بی بی جان نے اعتراض کیا تھا کہ سب کچھ سادگی سے ہو جائے تو اچھا ہے۔

"کیوں بی بی جان! پہلے تو عباس چپ چپاتے دلہن گھر لے آیا اور مجھے کچھ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مجھے بھی تو اپنے دل کے ارمان پورے کرنے دیں۔"

"عباد ہے نا۔ اس کی باری پر سارے ارمان پورے کر لینا کم از کم اس لڑکی کا تو احساس کر لو جس پر ہم یہ ستم ڈھانے جا رہے ہیں۔"

"زندگی کا کیا بھروسا بی بی جان! اور یوں بھی میں حیات ملک کی بیٹی دیوں ہی انگلی پکڑ کر لانے سے تو رہی۔ یہ بھی میرے بھائی کا احسان ہے کہ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد انہوں نے میری بات کا مان رکھا۔" وہ یہ نہ بتا سکیں کہ سبحانہ ہی عباس کے بعد کسی کا نام سننے کو تیار نہ تھی۔

اور یہ تمام گفتگو سننے کے بعد عباس ملک نے کمرے میں آ کر ان چار سالوں میں پہلی بار فروا کا چہرہ

دیکھنے کی خواہش کی تھی اور پہلی بار اس کے لیے سوچا تھا جو ایک کاغذی رشتے میں بندھی اتنے برسوں سے اس حویلی میں مقیم تھی۔ سونے سے قبل چھوٹے موٹے کام نبٹاتی' پانی کا جگ ٹیبل پر رکھتی فروا کا چہرہ دیکھ کر اس کے اندر کوئی احساس نہ جاگا تھا۔ وہ کام ختم کروا کے سونے کے لیے لیٹ گئی اور منہ پر کمبل تان کر سو گئی۔

وہ سو گئی تھی مگر عباس بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اور وہ سو سکتی تھی؟ اسے نیند کہاں آتی ہے۔ جس کا سب کچھ لٹنے والا ہو۔ اس کے پاس پہلے بھی کیا تھا مگر اسے لگتا تھا اس سے پہلے ہی وہ مالا مال تھی۔ اسے عباس کے رویے اذیت دیتے تھے۔ اتنی اذیت کہ درد برداشت کی حدوں کو چھونے لگتا تھا۔ مگر ایک آسرا تو تھا۔ وہ اس پر کوئی حق رکھتی تھی تب ہی اس کمرے میں رہتی تھی۔ اس حویلی میں کوئی اچھا یا برا مقام تھا تو عباس کی وجہ سے تھا۔ دن اور رات کی جن گھڑیوں میں چاہے اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس کے پاس رہ سکتی تھی۔ وہ اس کے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی' بھلے وہ اس کی بات کا جواب دے یا نہ دے وہ اور جب سبحانہ آجائے گی۔ تو یہ بے نام سا تعلق بھی نہیں رہے گا۔ یہ مقام بھی اس سے چھن جائے گا وہ۔۔۔ اس کا وجود عباس کے آس پاس بھلا کیوں گوارا کرے گی۔

اور عباس۔۔۔ وہ اتنی نفرت کرتا ہے مجھ سے۔۔۔ شاید بھول ہی جائے کہ میں بھی یہاں ہوں۔۔۔

گھپ اندھیرے میں کمبل کے اندر سوچتے ہوئے آنکھوں سے نکلتے آنسو اس کے بالوں میں جذب ہوتے رہے۔

میں کہاں سویا کروں گی؟ اب تو سوہنی بھی نہیں ہے کہ اس کے پاس سو جاتی' وہ شادی ہو کر دوسرے گاؤں چلی گئی تھی اور اگر کبھی مجھے عباس سے کوئی بات کرنی پڑ گئی تو میں کس طرح کروں گی۔ وہ میری بات کا جواب ہی نہیں دیتا۔۔۔ اس کمرے میں سبحانہ کے سامنے آکر میں کس طرح بات کر سکوں گی۔۔۔ نہیں میں انتظار کیا کروں گی کہ کب وہ مجھے اکیلے نظر آئے اور میں اس سے بات کروں۔ کاش باقی زندگی بھی اس طرح گزر جاتی' جس طرح پچھلے چار سال۔۔۔

وہ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

سبحانہ نے اسی کمرے کو اپنے لیے پسند کیا تھا اور ثریا بانو نے اس کے جہیز کا سامان زیادہ ہونے کا عذر پیش کر کے اس کی بات کو ترجیح دی تھی۔ کل شام تک اس کا سامان پہنچ جانا تھا۔ لہٰذا کل کے کاموں میں اولین فہرست اس کمرے کو خالی کرنے اور اچھی طرح صفائی کرنے کے بعد یہاں سبحانہ کا سامان سیٹ کروانے کی تھی۔ یہ بات ثریا بانو ملازماؤں سے بات کرنے کے دوران کئی بار جتا چکی تھیں۔

اسی شام انہوں نے ڈھولک رکھوا دی تھی۔ دوسری حویلی سے لڑکیاں آگئیں تو خوب رونق لگ گئی تھی اور وہ بہت بڑے مردانے حصے سے اٹھ کر آیا تھا۔ جب وہ سو چکی تھی۔ گیتوں کے بول اور ڈھولک کی تھاپ یہاں تک سنائی دے رہی تھی اور وہ جو کبھی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کا دل چاہا اس وقت وہ فروا کا چہرہ دیکھے اس کے تاثرات دیکھے مگر وہ کمبل میں منہ چھپائے لیٹی تھی۔ پتا نہیں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ شاید رات کا آخری پہر تھا کیونکہ سر شام بجنے والی محفل اور خوشیوں کی جھنکار اس وقت سناٹے میں بدل چکی تھی۔

اسے ویسا ہی گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ جیسے پچھلے کئی مہینوں سے' وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ اور صرف کمرے سے ہی نہیں بلکہ لاؤنج سے گزرتی ہوئی کھلے آسمان تلے آن بیٹھی اور زور زور سے سانس لینے لگی۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آہٹ پر عباس کی آنکھ کھلی اور وہ اسے کمرے سے غائب پا کر باہر آگیا' وہ سیڑھیوں کے نیچے بلب کی ملگجی روشنی میں گھٹنوں پر سر گرائے بیٹھی تھی۔

کچھ دیر لاؤنج کے دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا

پھر پلٹ گیا' عباس کی نیند بھی روٹھی ہی رہی۔ تھی' حیرت انگیز طور پر وہ بھی وہی سوچ رہا تھا جو پچھلے کئی مہینوں سے فروا سوچ رہی تھی اگر سجانہ اس کی شریک سفر ہو گئی تو اس کاغذی رشتے میں بندھی وہ اس حویلی میں ساری عمر گزار دے گی؟۔۔۔ اور یہ زندگی اس کے لیے کیسی ہو گی؟

اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس کے رت جگے میں عباس بھی شریک تھا مگر وہ بے خبر تھی۔ اس سے اگلے روز عباس کے کمرے کا سارا سامان نسبتاً" ایک چھوٹے کمرے میں منتقل کر دیا گیا جس میں ایک زندہ نفوس بھی شامل تھا۔

وہ کانٹوں کے بستر پر گزرنے والی پہلی رات نہیں تھی مگر فروا کو یوں لگتا تھا' اتنی اذیت بھری لمبی رات اس کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ عباس کے کمرے کو سجا کر بند کر دیا گیا تھا۔ سجانہ کو رخصت ہو کر حویلی آجانا تھا۔ حسب معمول ہال کمرے میں حویلی کی لڑکیوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ یہ کمرہ نسبتاً" ہال کے زیادہ نزدیک تھا۔ پہلے وہ عباس کے کمرے میں رہتی تھی مگر اب یہ کمرہ بی بی جان نے اس کے لیے خالی کروایا تھا' کیا آج عباس سونے کے لیے اس کمرے میں آئے گا جتنے ماہ و سال وہ اس حویلی میں گزار چکی تھی۔ یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر اس کے اعصاب پر بری طرح سوار تھی۔ پہلے کی طرح کارپٹ پر اپنا بستر لگائے وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتی رہی' اوپر سے ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کی جھنکار اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

وہ بہت انتظار کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئی۔ مگر نیند اتنی مہربان کب تھی کہ بلانے سے آجاتی' قسمت کسی کے حصے کی خوشیاں اٹھا کر دوسرے کی جھولی میں ڈال دے تو اسے یہ سب سمیٹتے دیکھنا اپنے دامن بھرتے دیکھنا کیسا لگتا ہے۔ یہ اس وقت کوئی اس سے پوچھتا؟ کیا ضروری ہے کہ میں یہ سب دیکھوں میں یہاں سے جا نہیں سکتی کیا؟"

سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کوئی وحشت سی دل پر طاری ہوئی تھی جس نے اسے نیند سے پریشان کر ڈالا تھا۔ دماغ میں کوئی سوچ تھی نہ دل میں کوئی خیال۔۔۔ یہ اذیت' یہ وحشت جسم سے روح کا ناتا چھین لینے والی تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے ہی بے حال پڑی رہی تھی اور پھر کچھ سوچے بغیر اس نے اٹھ کر واش روم میں جا کر وضو کیا اور باہر چلی آئی تھی۔

دو رکعت نفل اس نے بغیر جائے نماز کے کھلے آسمان تلے گھاس پر پڑھے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر ذہن بالکل خالی تھا' یا رب۔ میں کیا مانگوں؟ میں بھلا اب کیا مانگ سکتی ہوں؟ بس آنسو تھے جو رخساروں پر گرتے چلے گئے اور بھلا اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔۔۔ اس حویلی کے بے رحم مکین میری قسمت کا فیصلہ بہت دن پہلے کر چکے تھے اور ان کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ان کے دلوں میں' ان کی زندگیوں میں میری کیا وقعت؟ اب تو بس کل آخری دن ہے۔ شاید اس سے زیادہ سخت مقام ابھی اور باقی ہوں۔" وہ بے ربط سا سوچ کر کچھ بھی مانگے بغیر منہ پر ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ واپس آکر سونے کے لیے لیٹی تو رات کے اس آخری پہر میں دل پر چھایا بوجھ کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اور حویلی کی رونقیں بھی سناٹے کی گود میں جا چھپی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر فجر کی اذان کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے تو آنکھ کھلتے ہی یاد آیا صبح ہونے والی ہے' وہ دن طلوع ہونے والا ہے جس کا تصور ہی اسے وحشت زدہ کر دیتا ہے۔ وہ دن پورے کروفر کے ساتھ کس کی زندگی میں طلوع ہونے والا ہے شاید کبھی غروب نہ ہونے کے لیے۔۔۔ رگ جان کو کاٹتی اذیت اس کا احاطہ کرتی رہی۔۔۔

☆ ☆ ☆

ابھی تھوڑی دیر میں بارات روانہ ہونے والی تھی' جب وہ ملازمہ کے بلاوے پر بی بی جان کے کمرے میں

آئی تھی اور ان کے کمرے میں داخل ہوتے ذرا سی رکی۔ ان کے پاس عباس بیٹھا تھا۔ بی بی جان نے بطور خاص اس کے لیے سوٹ سلوایا تھا وہی دے کر کپڑے تبدیل کرنے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے عباس کو بیویوں کے درمیان مساوات برتنے کے حکم سے متعلق اسلامی احکامات بتائے اور فروا کو یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کے حقوق سے متعلق کوئی کوتاہی نہیں کرے گا۔ بی بی جان کے اصرار پر وہ انہی کے کمرے کے

واش روم میں تیزی سے گھس گئی اور نہ صرف کپڑے تبدیل کیے بلکہ منہ بھی دھو کر لوٹی تھی۔

"ادھر میرے پاس آکر بیٹھو۔" عباس تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تو بی بی جان نے اسے پاس بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں میری بچی! تم اس وقت کس تکلیف سے گزر رہی ہو تمہارے لیے یہ بہت بڑا امتحان ہے۔ یقین کرو میں ایسا کبھی نہ ہونے دیتی اگر تمہاری گود ہری ہو جاتی مگر یہ تمہاری قسمت۔" وہ اسے پاس بٹھا کر سمجھانے لگیں اور پھر پر سوچ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تم روئی ہو؟" وہ بغور اسے دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا تھا۔

"ہمت سے کام لو۔ اگر اللہ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو عورت کے اندر برداشت بھی پیدا کی ہے، وہی صبر پر اجر بھی دیتا ہے۔" انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

"جاؤ، عباس کی تیار ہونے میں مدد کرو، پھر میرے پاس آجانا، پھر یہاں سب مل کر بیٹھیں گے۔"

فروا نے عباس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔ بی بی جان سے بات کرنا چاہیے میرا اس حویلی میں رہنا کون سا ضروری ہے۔ میں کہیں اور چلی جاؤں۔

یا پھر ابھی عباس سے بات کروں۔ پھر پتا نہیں کب موقع ملے گا۔

"کیا بات ہے؟" عباس نہا کر واش روم سے نکلا تو اسے کمرے کے بیچوں بیچ مضطرب سا کھڑے دیکھا۔ ہلکے زرد رنگ کا شیفون کا امبرائیڈڈ سوٹ جہاں اس کے متناسب سراپے پر بہت جچ رہا تھا وہیں اس کی رنگت میں گھلی زردیاں بھی نمایاں کر رہا تھا۔

"مجھے بی بی جان نے بھیجا ہے۔ تیار ہونے میں آپ کی مدد کروں؟"

"جوتے نکال دو۔" مختصراً کہہ کر وہ بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔ فروا جوتے اس کے پاس رکھ کر پیچھے مڑی اور پھر صوفے پر ٹک گئی۔ پھر خود ہی تھوڑی دیر بعد کھڑی ہو گئی۔

وہ پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔

"عباس۔۔۔" اس کے ہونٹ ذرا سا پھڑپھڑائے تھے۔ عباس نے رک کر اس کی طرف دیکھا تب ہی سبحانہ کی خالہ نزاکت اور ثریا بانو اندر داخل ہوئی تھیں۔

"عباس بیٹا! سب انتظار کر رہے ہیں۔ کتنی تیاری رہتی ہے تمہاری؟" نزاکت نے عباس سے کہا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اے ہے۔ تم ادھر کدھر۔ بھئی یہ تو بدشگونی ہو گئی۔ تمہیں الگ کمرا دیا تو ہے پھر یہاں کیوں آئی ہو؟" اس نے فروا کو باقاعدہ لتاڑا تھا۔

"بیٹا! تم نے تو تیاری میں عورتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ ابھی تو رسمیں کرنے میں بھی وقت لگ جائے گا۔" ثریا گویا اسے نظر انداز کر کے عباس سے کہہ رہی تھیں۔ ان تینوں نے کمرے سے باہر کا رخ کیا اور فروا کو یوں لگا اب تک وہ اس کا تھا۔ اب اسے چھوڑ کر جا رہا تھا اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اب وہ بھی اپنی بات اس سے نہیں کہہ سکے گی۔

یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ کھڑے قد سے نیچے گری اور اس کا سر کارنر سے ٹکرایا تھا جس پر رکھا گلدان ٹوٹ کر نیچے گرا تینوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

کانچ ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ انسان خاموشی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

یہ اس روز ایڈووکیٹ عباس ملک کو پتا چلا تھا' نروس بریک ڈاؤن کے شدید حملہ سے ہوش میں آنے میں اسے تین دن لگے تھے۔ اور ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹرز نے چیک کرنے کے بعد اس سے ملنے کی اجازت دی۔

وہ آہستگی سے' اس کے بیڈ کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے یہاں کون چھوڑ کر گیا ہے' مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے مجھے باہر جانا ہے۔" اس کے الفاظ سے جھلکتا شدید عدم تحفظ عباس کو بے چین کر گیا تھا۔

"اچھا پہلے آپ یہ میڈیسن لے لیں' اس کے بعد دیکھتے ہیں۔" نرس نے ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ خاموشی سے ٹیبلٹ لے کر پانی پینے لگی تھی۔ عباس کی طرف پشت تھی ابھی تک وہ اس کی یہاں موجودگی سے بے خبر تھی۔

"آپ ان کا خیال رکھیے فی الحال ان سے زیادہ بات نہ کریں؟" نرس نے عباس کو مخاطب کیا تو فروا نے پلٹ کر اسے دیکھا اور دیکھتی چلی گئی۔

اس کی آنکھوں میں اتنا خالی پن تھا کہ عباس کو اپنی سفاکی پر شدید غصہ آیا تھا۔ اس کا سر کارنر سے ٹکرانے سے زخمی بھی ہوا تھا اس کے ماتھے اور سر کے گرد سفید پٹی تھی۔ کتنی کسمپرسی کی حالت میں پہنچ گئی تھی وہ اس کی وجہ سے۔۔۔

تمہاری ماں نے فیصلہ کر لیا اور اس سے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ تم ان سے اجازت لیتے اسے قائل کرتے اور یوں بھی اتنا وقت نہیں گزرا تھا۔"

"ابھی بھی کوئی وقت نہیں گزرا' ابھی بھی ہم اس غلطی کی تلافی کر سکتے ہیں۔" اس کے پشیمان انداز پر وہ الجھ گئیں۔

"کیسی غلطی عباس۔۔؟ پہلے تم نے اتنے آرام سے ثریا کے فیصلے کی تائید کر دی اور اب تم اس فیصلے کو غلطی قرار دے رہے ہو۔۔۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی بی بی جان!۔۔۔ میں نے آپ سے غلط بیانی کی تھی۔۔۔ میں فروا کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہی نہیں۔ میں نے اسے بیوی کی حیثیت سے قبول ہی نہیں کیا۔۔۔"

"عباس!" بی بی جان نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ "ڈرائیور کو بلاؤ اور اس سے کہو' مجھے گاؤں چھوڑ آئے۔۔۔"

"ایسا مت کہیں بی بی جان۔۔۔ آپ فروا کے پاس رکیں۔ فروا کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی' بس مجھے گاؤں جانا ہے۔ تم جانو اور تمہارے مسئلے۔۔۔"

وہ اس کے روکنے کے باوجود شدید دل برداشتہ ہو کر روانہ ہو گئیں تو مجبوراً" اسے فیروز چچا کو فون کرنا پڑا تھا' جو اس کے فیصلے کو سن کر حیران پریشان ہو گئے مگر اس نے ایک متبادل حل بھی تو پیش کر دیا تھا۔





"کیا کہہ رہے ہو عباس یہ کوئی وقت ہے اس فیصلے کا' یہ تو سیدھا اس کی زندگی کو داغ دار کرنے والی بات ہے اور دو خاندانوں کی عزت کا سوال بھی۔" بی بی جان اس کا فیصلہ سن کر حیران رہ گئی تھیں۔

"بی بی جان! آپ دیکھیں تو۔ فروا موت کے منہ میں پہنچ گئی اور ڈاکٹر کا کہنا ہے اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

"تو اس کا خیال تمہیں پہلے کرنا چاہیے تھا۔ تم اور

"میں بہت شرمندہ ہوں' تمہارے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔" عباس نے اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کچھ بے ربط سے الفاظ کہے تھے۔ نہ جانے کیوں اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ جو الفاظ اسے فروا کے سامنے ادا کرنے ہیں' انہیں چننا اور ادا کرنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

"جو دکھ' جو اذیت تمہیں میری طرف سے ملی' اس کی تلافی الفاظ سے۔ ممکن تو نہیں مگر اتنا یقین دلاتا ہوں

کہ آئندہ کبھی بھی تمہیں میری طرف سے کوئی دکھ' کوئی پریشانی نہیں ہوگی' یہ میرا وعدہ ہے تم سے اور جو وقت گزر گیا۔ اسے میں واپس تو نہیں لا سکتا مگر اس کی تلافی کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

عباس نے اس کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"میری بات سمجھ میں آرہی ہے؟" اپنی بات کے اختتام پر اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا نہ جانے وقت وہ کس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ جواباً" اسے کچھ نہ کہہ سکی۔

"بسم اللہ' بسم اللہ۔" چھ روز بعد جب وہ عباس کے ہمراہ حویلی کی روش پر اتری تو بی بی جان۔ سائرہ چچی اور دو ملازماؤں کے ساتھ فوراً" باہر آگئیں اور بے حد محبت سے اسے تھام کر اندر لے آئیں البتہ عباس کی طرف انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور عباس جو گاڑی سے سامان نکال کر ملازمہ کے حوالے کر رہا تھا۔ بے اختیار دل مسوس کر کے رہ گیا' بی بی جان اسے کمرے میں لے آئی تھیں مسجانہ کو شمریز کے سنگ ایک لمبی بحث و تمحیص کے بعد خاندان کے بزرگوں کے فیصلے کے تحت وداع کر دیا گیا تھا۔ اور اس کا سارا جہیز بھی دوسری حویلی میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ عباس کا کمرہ ویسے ہی سیٹ کر دیا گیا تھا۔ ثریا بانو اور سائرہ چچی اس کی عیادت کر کے چلی گئیں تو بی بی جان بھی اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے اٹھ گئیں۔

"بی بی جان پلیز۔ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں میں خود بہت ٹینشن سے گزر رہا ہوں۔" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر کہہ رہا تھا۔

"میرا خود پر بھی اعتبار نہیں رہا عباس! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کسی بھی جیتے جاگتے انسان کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہو۔"

"پتا نہیں بی بی جان! مجھے کیا ہو گیا ورنہ جتنی اچھی وہ آپ کو لگتی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ عزیز بھی مگر پتا نہیں کیوں میں اتنا بے رحم ہو گیا تھا۔"

"اب میرے ساتھ ڈراما کر رہے ہو یا۔۔۔؟" وہ مشکوک ہوئیں۔

"نہیں بی بی جان! میں اس کا بہت خیال رکھوں گا' اماں مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟" انہیں یقین دہانی کرا کر وہ پوچھنے لگا تھا۔

"اسے تو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری حویلی میں کوئی خوشی غمی میں شریک ہو' اس کی بھتیجی ہمیشہ کے لیے وہاں چلی گئی۔۔۔"

☆ ☆ ☆

ذہن ہر سوچ سے خالی اور دل ہر جذبے سے عاری ہو گیا تھا مگر بی بی جان کے ڈپٹنے پر تین دن بعد اس نے نہا کر کپڑے بدلے تھے۔ عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی' جب عباس کمرے میں آیا تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز اسے محویت سے دیکھتا چلا گیا۔ نماز ختم کر کے بھی وہ سر گھٹنوں پر ٹکا کر جائے نماز پہ بیٹھی رہی تو عباس نے اسے آواز دی۔

"جی۔۔۔!" وہ بیڈ کے پاس آکر رکی۔

"بیٹھو ادھر۔" اس نے سائیڈ پر اشارہ کیا تو وہ ٹک گئی اس کے تابعدار انداز کو عباس نے بہت غور سے دیکھا تھا۔

"کب تک فرش نشین رہنے کا ارادہ ہے؟" ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے وہ پوچھ رہا تھا۔

"میں کیا اور میرے ارادے کیا؟" اس کا انداز بے حد سادگی لیے ہوئے تھا۔ "ارادے تو اختیار والے لوگ کرتے ہیں۔ اور ان پر عمل کرتے ہیں۔"

"تو کیا اس بستر کو اٹھا کر شیں کسی ملازمہ کو دے دوں؟" اس کا ہاتھ پکڑ کر زورا سا خود سے قریب کرتے اس کا انداز شرارت بھرا تھا۔

"نہیں پلیز۔۔۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیوں؟" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اس گھر میں یہی بستر تو ہے جس سے مجھے اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی اور نہ ہی کہیں بیٹھنے کو دل کرتا ہے۔"

"میرے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا کیا؟"
"پتا نہیں۔" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
اگلے کئی مہینوں میں عباس نے محسوس کیا تھا وہ بہت بدل چکی تھی۔ عباس اسے بلاتا' وہ پاس آ بیٹھتی۔ پھر اجازت لے کر اٹھ جاتی۔ کبھی خود سے پاس نہ بیٹھتی' یہ بات عباس بہت اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے بھی اسے نہ ٹوکتا۔ اسے یقین تھا اس کی محبت اسے زندگی کی رعنائیوں میں سے اپنا حصہ وصول کرنے پر مجبور کردے گی۔
بی بی جان عمرہ کرنے گئی تھیں۔ جب لوٹیں تو سب انہیں لینے ایئرپورٹ گئے تھے۔
"فروا نہیں آئی۔" ایئرپورٹ سے گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے پوچھا۔
"بی بی جان! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" سائرہ چچی نے مداخلت کی۔
"تو تم لوگ ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔" بی بی جان خفا ہوئی تھیں۔



دو دن سے وہ شہر میں عباس کے ساتھ تھی اور دو دن کے بعد جب ڈاکٹر نے پازیٹو رپورٹ ' مبارک باد دیتے ہوئے ان کے حوالے کی تو عباس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ حویلی میں فون کرکے گاڑی ریورس کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا جو بالکل ہی سپاٹ انداز میں اس کے برابر بیٹھی تھی۔
"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا تھا۔ حویلی کی طرف جاتے ہوئے سڑک خاصی سنسان ہوچکی تھی۔ وہ اردگرد درختوں' کھیتوں اور میدانوں پر نظریں جمائے بے حد مضمحل اور بے رونق چہرہ لیے بیٹھی تھی۔
"اس میں خوشی کی کون سی بات ہے؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوکر الٹا پوچھنے لگی تو وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔
"عباس! جب بھی کوئی انسان دنیا میں آتا ہے تو اسے کتنی مصیبتیں' کتنے عذاب اپنی جان پر جھیلنے ہوتے ہیں بہت کم ہی ہوتے ہیں وہ خوش قسمت جن کو زندگی سب کچھ دے دیتی ہے۔ پتا نہیں اس بچے کو زندگی میں کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ہمیں کیا پتا۔"
آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے تو عباس نے حیران ہوکر گاڑی سڑک کنارے روک دی تھی۔
"دیکھو لو ثریا! تمہاری بہو اس حالت میں اس لڑکی سے لے کر نہ جانے کون کون سی دوائیاں کھاتی رہی اور تمہیں کوئی خبر ہی نہیں۔ وہ لڑکی کون سا ڈاکٹر ہے۔ یوں ہی تھوڑی بہت نرسنگ کے بعد بیگ اٹھا لیتی ہیں۔" بی بی جان نے ثریا کو جھاڑا تھا۔
"بی بی جان وہ کون سا بچی ہے جو اسے کچھ پتا نہیں ہوگا اب اپنا خیال خود بھی نہیں رکھ سکتی ویسے بھی فروا نے آپ کو نہیں بتایا تو مجھ سے وہ کب اتنی باتیں کرتی ہے۔"
"میں کون سا وہاں تھی جو وہ مجھے بتاتی اور پھر اسے پتا ہوگا تو بتائے گی نا۔"
"بی بی جان! آپ کے جانے سے پہلے اسے پتا تھا' وہی لڑکی اسے بتا کر گئی تھی۔ اس نے کسی کو بتایا نہیں تو میں خود سے اس کی چاکری کرنے لگ جاتی۔"
اور ان کی بات سن کر نہ صرف بی بی جان بلکہ عباس بھی چونک گیا تھا۔
"آپ اپنی تیاریوں میں مصروف تھیں بی بی جان! ویسے بھی میری طبیعت ان دنوں اتنی خراب نہیں تھی۔" ان کے شکوہ کرنے پہ فروا نے جواب دیا تھا۔
عباس اس کے رویے پر خاصا الجھ گیا تھا۔
"جب تمہیں پتا تھا تو ڈاکٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"میرے سر میں بہت شدید درد ہوتا ہے۔ میں تو اس لیے ڈاکٹر کے پاس گئی تھی کہ سر درد کی میڈیسن نوں کی کبھی کبھی میرے سر میں درد کی لہریں اٹھتی ہیں

بلاوجہ ہی۔"

"تو پھر تم نے ڈاکٹر سے سر درد کا ذکر کیا تھا؟" وہ اپنا سوال بھول کر متفکر انداز میں پوچھ رہا تھا۔

مہوز تجارت گئے ہوئے تھے۔ مردانے حصے سے نکل کر رہائشی حصے کی طرف آتے ہوئے ٹھٹکے اور پھر حیران ہو کر چند لمحے کھڑے رہے اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"سائرہ سو گئی ہو کیا؟" سائرہ کی بند ہوتی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

"نہیں۔ آپ کا انتظار کر رہی تھی بہت دیر کر دی آپ نے۔" وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔

"ذرا باہر جا کر دیکھو' یہ فروا کو کیا ہوا ہے۔ باہر کیوں ہے اس وقت' عباس نے کچھ کہہ دیا ہے؟"

"کون؟ کدھر۔؟" پہلے تو ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر مہوز ملک کے بتانے پر وہ باہر آ گئیں جہاں فروا کے بالکل قریب جا کر انہیں پتا چلا' وہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے' فروا؟" انہوں نے پریشان ہو کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"میرے سر میں بہت درد ہے آنٹی؟"

"تو رونا سر درد کا علاج کہاں سے ہو گیا کوئی دوا لو نا۔" وہ فطرتاً" ہمدرد طبیعت کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اسے کمرے کے دروازے پر چھوڑ گئیں مگر صبح ہوتے ہی انہوں نے بی بی جان اور ثریا بانو سے بات کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سائیکاٹرسٹ ہیں ڈاکٹر آرزو' آپ ان کو دکھا لیں۔" گائناکالوجسٹ ڈاکٹر طیبہ زبیری نے ایک کارڈ عباس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ڈاکٹر صاحبہ؟"

"ویسے تو اتنی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کنڈیشن میں ان کا اتنا ڈپریسڈ رہنا تشویش کا باعث بن رہا ہے۔ بے بی کی مینٹلی اور فزیکل کنڈیشن کو افیکٹ کر سکتا ہے۔"

"عباس صاحب' شاک لگنے سے یا پھر مسلسل ٹینشن میں رہنے سے اس قسم کے پیشنٹ ہمارے پاس آتے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کی مسز بہت عرصے سے مسلسل ٹینشن کا شکار رہی ہیں۔ اس ایکسٹریم اسٹیج تک جو وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اور ان کا ذہن اسی اسٹیج پر رک گیا ہے۔ یا یوں بھی کہہ لیں کہ وہ ڈپریشن یا ٹینشن ان کے ذہن میں جم گئی ہے' اس کو آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ٹائم بھی چاہیے ہوگا اور آپ کا تعاون بھی۔"

"جی!" ٹیبل کی سطح پر نظریں جمائے عباس نے سر اٹھا کر ڈاکٹر آرزو کو دیکھا تھا۔

"پہلے تو آپ انہیں نارمل مت لیں۔ جو بات آپ کے لیے بہت چھوٹی ہے' وہ ان کے لیے بہت بڑی ہے۔ جس بات پر آپ بالکل توجہ دینا ہی پسند نہ کریں' ہو سکتا ہے کہ آپ کی مسز اس کو لے کر گھنٹوں سوچتی رہیں۔ آپ ایسا رویہ رکھیں جس سے یہ مطمئن ہو جائیں اور پھر مطمئن رہنا سیکھ جائیں۔"

☼ ☼ ☼

اللہ رکھا مرڈر کیس کا ٹرائل آخری مراحل میں تھا۔ وکلا کمیونٹی کا اشتیاق اور دونوں پارٹیوں کا اضطراب بھی شدید ہو چکا تھا۔ جہاں پولیس کی رپورٹ قاتل کو انجام تک پہنچانے کی فیور کرتی نظر آتی تھی۔ وہیں رات کے وقت جنگل میں ہونے والا قتل ملک عباس کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا۔ اس نے رات کو فائل میں کچھ پوائنٹس نوٹ کیے' مگر صبح آفس جاتے ہوئے لے جانا ہی بھول گیا تھا یوں جلدی واپس آنا پڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے صوفے پر ٹیک لگائے گھٹنوں تک کمبل ڈالے فروا نے یکایک اپنا رخ تبدیل کیا ہے۔ وہ وارڈروب سے سوٹ نکال کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے پلٹ کر اس کی طرف آیا تھا۔

"کیوں رو رہی ہو؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"بتاؤ نا؟" اس کی خاموشی پر وہ اس کے پاس کارپٹ

پر بیٹھ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے بے حد پریشان تھا۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

"تو کیوں سوچتی ہو فضول باتیں جن سے سر میں درد ہوتا ہے۔"

"میں خود نہیں سوچتی' خود ہی ذہن میں آجاتی ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ خود ہی ذہن میں کون سی باتیں آتی ہیں۔ اس وقت تم نے کیا سوچا کہ تمہیں رونا آگیا ہے۔"

"مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی ہے۔" عباس اس کی بات سن کر خاموش رہ گیا تھا۔ چند ماہ پہلے جب عباس نے اس سے کہا تھا "تم اپنی ماں سے ملنے جاسکتی ہو۔ تو تب اس نے جواب دیا تھا میں کیسے ملنے جاؤں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میری ماں کی قبر کہاں ہے۔"

"فٹافٹ تیار ہو کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"سوال جواب نہیں۔ فوراً تیار ہو جاؤ بس۔" فروا نے بعجلت کپڑے نکالے اور واش روم میں گھس گئی' چینج کر کے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو عباس اس کا منتظر تھا۔

ہلکا سا لوشن ہاتھوں اور منہ پر لگا کر سوٹ کی میچنگ شال اوڑھنے لگی۔

"سویٹر بھی پہنو۔"

نیوی بلو کلر کے سوٹ کے ساتھ میچنگ جرسی پہن کر اس نے جلدی سے بالوں میں برش مار کر اس کی طرف دیکھا تو عباس اٹھ کر اس کے پاس آگیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑا پرفیوم اٹھا کر ذرا سا اسپرے کیا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

"یہ نہیں بتایا' صبح ہی صبح جانا کہاں ہے؟"

"بی بی جان!" وہ اسے لے کر بی بی جان کے کمرے میں آیا ہے۔"

"میں اپنی بیوی آپ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ اسے میرے آنے تک واپس کمرے میں مت جانے دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ اس کے انداز پر مسکرائیں۔

"اور اس کا خیال رکھیے گا۔" اس کے لیے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں۔"

فروا حیران سی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"آؤ بیٹھو میرے پاس' دیکھو' عباس کو میری بیٹی کا کتنا خیال ہے۔"

عباس انہیں خدا حافظ کہہ کر جاچکا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بیڈ پر جگہ بنانے لگیں۔ وہ وہیں کمبل میں گھس کر ان سے باتیں کرتی رہی۔ ٹی وی دیکھتی رہی' تھوڑی دیر ثریا بانو آبیٹھیں تو بی بی جان کے ساتھ ان کی باتیں سنتی رہی۔ شمیرہ ہاسٹل جارہی تھی۔ بی بی جان کو خدا حافظ کہنے آئی۔ اور ملازمہ کمرے کی صفائی کرنے چلی آئی۔

"بھئی تھوڑی بہت ڈسٹنگ کرلو ہم ماں بیٹی کو بالکل ڈسٹرب نہ کرنا۔" گرم گرم مونگ پھلیوں کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے ملازمہ کو ہدایت کی تھی۔

اور نہ جانے اس بات کا کیسا اثر ہوا تھا اس پر۔ جیسے کوئی بے چینی سی لاحق ہونے لگی۔

ماں بیٹی کا لفظ جیسے اس کے ارد گرد چکرانے لگا تھا' وہ مونگ پھلیاں کھاتے کھاتے ٹوکنے لگی اور بی بی جان اس کا پرسوچ متفکر انداز دیکھ رہی تھیں۔

"بی بی جان! میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں' مجھے نیند آرہی ہے؟"

"تو یہیں سوجاؤ۔" انہوں نے جواب دیا تو لاجواب سی ہو کر وہیں لیٹ گئی۔ ملازمہ باقاعدگی سے بارہ بجے اسے جوس دیا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گلاس لیے بی بی جان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"فروا بیٹی! سونے سے پہلے جوس تو پی لو پھر اٹھو گی تو کھانے کا ٹائم ہو جائے گا۔" اور فروا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ ان کی بات کا جواب کیسے دے۔ بی بی جان نے آہستہ سے کمبل ہٹایا

اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"کیوں رو رہی ہو؟" وہ پریشان پوچھ رہی تھیں۔

"بولو نا۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بی بی جان! آپ نے ایسا کیوں ہونے دیا تھا۔ مجھے بہت یقین تھا آپ کچھ نہیں ہونے دیں گی۔"

"بی بی جان۔ مجھے آپ پر بہت اعتبار تھا مجھے یقین تھا۔ آپ سب کو منع کر دیں گی۔ آپ عباس کی شادی سبحانہ سے نہیں ہونے دیں گی۔"

"میری بچی! جب میں نے بار بار تم سے پوچھا تھا کہ عباس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے تو تم نے مجھے سچ کیوں نہیں بتایا؟ اگر بتا دیتیں تو میں یہ زیادتی کبھی نہ ہونے دیتی چاہے مجھے تمہارے ساتھ حویلی ہی چھوڑنا پڑتی۔"

"میں آپ کے ساتھ حویلی چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔ عباس مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے تو مجھے لگا میں مر گئی ہوں۔"

"اچھا اب چھوڑو نا اس ساری بات کو' عباس کی شادی سبحانہ سے ہو تو نہیں گئی۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

"مگر مجھے وہ ہر وقت اپنے ارد گرد نظر آتی ہے' کمرے میں چلتی پھرتی' کبھی ایک جگہ' کبھی دوسری جگہ' وہ عباس سے باتیں کرتی ہے۔"

اور شدید ٹینشن بھرے ماحول میں بے اختیار بی بی جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کبھی کبھی مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔" انہیں اس لمحے وہ حقیقتاً" بہت خوف زدہ لگی۔

"میری ڈول' میری بچی ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ عباس تمہارا ہے' اس کی زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"انہوں نے ترس کھا کر مجھے اپنی زندگی میں قبول کر لیا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو' کتنا خیال رکھتا ہے وہ تمہارا' اور یہ تم نے کیا کہا کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔" انہوں نے گلے لگا کر اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"بی بی جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ جیسے لوگ انسانوں کے لیے اللہ کی طرف سے تحفہ ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے آپ میری ماں نہیں ہیں۔ میری ماں کو اللہ نے اتنی تھوڑی سی زندگی کیوں دی' سوچنے پر بھی مجھے ماں یاد نہیں آتی۔" وہ اور تڑپ کر رو دی تھی۔

اگلے ہفتے اس کے ساتھ بی بی جان خود ڈاکٹر سے ملنے چل دیں۔

"دیکھیں اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے سر میں درد کی لہریں نہ اٹھیں' تو آپ کو میری ایک بات ضرور ماننی ہوگی۔

یہ ڈائری اور پین میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ جو باتیں آپ کے ذہن میں آئیں ان کو لے کر آپ نے روز ایک صفحہ لکھنا ہے۔ یہ سوچ کر کہ یہ ساری باتیں آپ کسی دوست سے کر رہی ہیں۔ آپ نے دس دن کے بعد دس صفحات مجھے لکھ کر دکھانے ہیں۔" ڈاکٹر نے فرد سے کہا تھا۔ بعد میں انہوں نے عباس کو بتایا تھا۔

"میں نے ان کو ایک ہوم اسائنمنٹ دی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اچھے برے حالات ڈائری میں لکھیں۔ اب یہ کیجیے گا کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی ڈائری پڑھ لیں۔ کیونکہ میرے ساتھ بھی یہ کھل کر کوئی بات نہیں کرتیں' شاید اس صورت میں ان کی کتھارسس ہو۔ اور ہم بھی ان کی ذہنی کیفیت سے واقف ہو سکیں۔ ویسے میں جو اب تک سمجھ سکی ہوں' آئی تھنک آپ کی مسز ماں نہیں بننا چاہتیں۔"

☆ ☆ ☆

وہ باتھ روم میں نہانے کے لیے گھسی تو عباس نے اس کے تکیے کے نیچے رکھی ڈائری اٹھالی تھی۔

"میرے دل سے زندگی کی خواہش نکل گئی جب میں نے عباس کو جاتے دیکھا۔ وہ میرے پاس لوٹ آیا مگر زندگی کی وہ چاہ لوٹ کر نہیں آئی۔"

"میرا دل چاہتا ہے۔ میری ماں میرے پاس ہو' بہت زیادہ روؤں' اتنی زیادہ روؤں کہ میرے دل کا بوجھ ختم ہو جائے مگر۔ تم کہاں چلی گئی ہو ماں؟"

"تم مجھے اتنی چھوٹی سی عمر میں چھوڑ کر چلی گئیں اگر اللہ کے پاس جانے کی اتنی ہی جلدی تھی تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔"

"ماں! تمہاری زندگی اتنی کم کیوں تھی اور میری زندگی اتنی زیادہ کیوں جو کاٹے نہیں کٹتی۔ یہ تو سوچا ہوتا میں تمہارے بغیر اتنی لمبی زندگی کیسے گزاروں گی۔ میں اس بچے کو کیا دوں گی' میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں میں تو خود ایک بوجھ ہوں۔"

"ماں! کیا بیٹیاں اس طرح بھی رخصت ہوتی ہیں۔ جیسے تمہاری بیٹی ہوئی' نہ گھر سے رخصت ہوئی نہ گھر ملا' نہ کبھی پلٹ کر بابل کی دہلیز پر قدم رکھ سکی' اس کا کوئی میکہ ہی نہیں۔ ماں تم مجھے ملو تو ایک بات تمہیں بتاؤں' جب وہ رخصتی کے بعد حویلی واپس آئی تھی' اور جب وہ اپنے ماں باپ سے مل رہی تھی اس لمحے تم مجھے بہت یاد آئی تھیں۔ مجھے بابا بھی بہت یاد آئے تھے۔ میں باتھ روم میں جا کر بہت زور زور سے روئی تھی مگر پھر بھی میرے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔"

"ماں تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا بہت عرصہ ہوا بابا بھی میرے ساتھ نہیں رہے۔ میرا دل چاہتا ہے کوئی مجھے روتا ہوا نہ دیکھے۔ بس میں تمہارے سامنے روؤں' اتنا روؤں کہ تم میرے دکھ کو دل سے محسوس کرو۔"

پانی گرنے کی آواز بند ہوئی تو اس نے جلدی سے ڈائری تکیے کے نیچے رکھ دی اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس لمحے عباس کو لگ رہا تھا اسے خود حرف تسلی کی ضرورت تھی۔ اس کے دل پر ایک نادیدہ بوجھ آن گرا تھا۔

"میں نے عباس کی زندگی میں شامل ہونے کے بہت خواب دیکھے تھے' وہ سارے خواب ٹوٹ گئے ماں۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ میں اس کی زندگی میں ہوں' پھر بھی میرے سر میں بہت درد ہوتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

پھر وہ قدرے' مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کرتے ہوئے اسے بیٹی کی خوش خبری سنائی تو یک دم وہ سنبھل گئی تھی اور عباس نے اس حوالے سے اسے چھیڑا تھا۔

"پتا نہیں کیوں عباس! میں ہر وقت یہی سوچتی رہتی تھی اس بچے کی زندگی کیسی ہوگی اور جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا تو مجھے یوں لگا میں غلط سوچتی تھی۔ وہ آپ کی بیٹی ہوگی۔ آپ اسے' محبت دیں گے' تحفظ دیں گے۔ وہ میری طرح کمزور اور بزدل نہیں ہوگی۔ آپ اس کا بہت خیال رکھیں گے نا عباس؟" آخر میں وہ ذرا مشکوک ہوئی تو عباس کو ہنسی آگئی تھی۔

"وہ میری جان ہوگی۔ میں اس کا خیال کیوں نہیں رکھوں گا۔ مجھے بیٹی کی ہی خواہش تھی اور صرف میں ہی نہیں حویلی کے باقی لوگ بھی اسے بہت پیار دیں گے۔ ہماری حویلی میں ابھی کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے۔"

عباس اور بی بی جان اس کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ عباس کے جانے کے بعد بی بی جان اسے اپنے پاس بلا کر مصروف رکھتیں۔ اس روز دوسری حویلی سے سبحانہ آئی تھی۔ وہ بی بی جان کے کمرے میں ان سے ملنے آئی تو فروا بھی ان کے پاس بیٹھی تھی۔

"فروا! میں کتنے دنوں سے تم سے ایک بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔ میں شمریز کے ساتھ بہت خوش ہوں مگر تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ ہم انسان اتنے بے ضمیر کیوں ہوتے ہیں کہ دوسروں کی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں۔ میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں' تمہیں میری وجہ سے بہت تکلیف برداشت کرنا پڑی' مجھے خود پر افسوس ہوتا ہے۔ جب ثریا آنٹی نے مجھے بتایا تھا کہ عباس کی زندگی میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے تو مجھے تمہاری حق تلفی پر افسردہ ہو کر انہیں سمجھانا چاہیے تھا نا کہ تمہاری جگہ لینے کی کوشش کرتی۔ مجھ سے غلطی ہوئی' اس سب کے لیے مجھے معاف کر دینا۔"

اور جہاں بی بی جان یہ ساری بات جان کر حیران سی رہ گئیں کہ ثریا بھی سارے حالات سے واقف

تھیں۔ وہیں فروا کے چہرے کا رنگ یک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ اور بی بی جان ازحد بے چین ہو گئیں۔ وہ سبحانہ کو ہوں ہاں کرتی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تو بی بی جان کی عدم توجہی کو محسوس کرکے سبحانہ بھی چلی گئی۔ اور بی بی جان عباس کے کمرے میں چلی آئیں۔ جہاں وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو گئیں۔"

"کچھ نہیں بی بی جان! میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا اس لیے۔"

"یہ کوئی بات ہے پریشان ہونے والی۔ عزت والی ہوتی ہیں ایسی بیٹیاں۔ جس کھونٹے سے بندھ جائیں، ساری عمر اسی کے ساتھ گزار دیتی ہیں۔ چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔" یقیناً" اسے اپنا بھرم ٹوٹنے پر شاک لگا تھا۔ اور یہ شاک اس کی ذہنی حالت کو کس طرف لے جاتا؟

"بی بی جان جب آپ واپس آئی تھیں۔ آپ کی ماں تھیں نا۔ وہ آپ کے لیے پریشان ہوتی تھیں؟"

"میری بچی! مائیں بیٹیوں کے لیے پریشان ہی ہوتی ہیں نا!"

"میں اپنی ماں کو سوچنے کی کوشش کرتی ہوں مگر مجھے ماں یاد ہی نہیں آتی۔ میرے بابا نے غلط عورت کا انتخاب کیا اور اس نے میرے بابا کو مار دیا۔" اس کی گفتگو اتنی بے ربط ہو رہی تھی کہ بی بی جان ازحد پریشان ہو گئیں۔

"میری بچی! کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ وہی ہوتا ہے، جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر سمجھایا اور پھر کھانے کے لیے اپنے کمرے میں لے آئی تھیں۔ اس روز عباس اتفاقاً" لیٹ حویلی پہنچا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی وہ تکیے پر اپنے سامنے کوئی چھوٹی سی کتاب الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

"کیا پڑھا جا رہا ہے؟" اس نے بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے پرسکون انداز میں پوچھا تھا۔

وہ سائرہ چچی نے ناموں کی کتاب دی تھی۔

عباس! آپ نے کوئی نام سوچا ہے؟" وہ کتاب ایک طرف رکھ کر پوچھنے لگی تھی۔

"نہیں۔ تم ہی ڈیسائیڈ کرنا۔" اور عباس کو لگا اس کا چہرہ تاریک ہو گیا ہو۔

"آپ نے سبحانہ سے، شادی کیوں نہیں کر لی عباس؟" عباس نے اس کی بات پر اچنبھے سے دیکھا تھا۔

"میں اسپتال میں تھی۔ مجھے کون سا پتا چلتا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ آپ کو بہت اچھی لگتی تھی نا۔ آپ نے میرے لیے قربانی دی؟" عباس بے حد پریشان ہو کر اس کے پاس آن بیٹھا تھا۔

"کیا بے وقوفی ہے فروا! میں نے اس وقت تمہارا انتخاب کیا جب سبحانہ میری منگیتر تھی۔ اور اگر مجھے تمہارے بارے میں وہ ساری غلط فہمیاں نہ ہوتیں تو میں کبھی تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچتا بھی نہ۔" اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے عباس نے تسلی دی تھی۔

"پھر وہی فضول باتیں سوچنا شروع کر دی ہیں تم نے؟"

اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ بس دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ اور بے بسی تھی۔ وحشت تھی۔

"میں ابھی چینج کر کے آتا ہوں۔ تم نے کھانا کھایا ہے۔"

"نہیں۔!" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"چلو" میں فریش ہو لوں، پھر کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اور باتیں بھی کریں گے۔ اور کوئی پیارا سا نام بھی ڈیسائیڈ کریں گے۔"

وہ باتھ لے کر واپس آیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے برش اٹھاتے ہوئے اس کا ہاتھ ٹھٹکا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے فروا کا سر عجیب سے انداز میں تکیے پر تھا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اس کا سر اٹھایا تھا وہ آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

"فروا۔ فروا!" اس نے آوازدے کر اس کا گال تھپکا مگر اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ تیزی سے

باہر نکلا۔ "نصو! چچا! بی بی جان" شبنم جلدی سے ڈرائیور کو "نصو! فورا" گاڑی نکالے۔" اس نے سامنے سے آتی ملازمہ سے کہا اور واپس پلٹا تھا۔ شمریز جو دوسری حویلی سے کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا اور گاڑی روش پر روک کر اندر آرہا تھا' تیزی سے اس کے پیچھے آیا تھا۔

"اسے اٹھا کر باہر لاؤ' میں گاڑی آگے لاتا ہوں۔"

وہ تیزی سے واپس مڑ گیا تھا اور اس کی پکار پر گویا حویلی میں ہلچل سی مچ گئی۔ بی بی جان گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھیں اور فروا کا سر گود میں رکھ لیا تھا۔ شمریز کی جیپ حویلی سے سرعت سے نکلتی چلی گئی۔

عباس نے راستے میں ڈاکٹر طیبہ کو فون کر دیا تھا۔

"انہیں آپریشن تھیٹر میں لے چلیں۔" ڈاکٹر نے ایک نظر فروا پر ڈال کر اسٹریچر پر ڈالتے نرسنگ اسٹاف سے کہا تو انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ پانچ گھنٹے بعد دونوں ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر سے باہر کاریڈور میں کھڑے ان تینوں ڈاکٹرز کے پاس آن ٹھہرے۔ ڈاکٹر نے نرمی سے کہہ کر ان کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔

"ہم نے فوری آپریشن کر کے آپ کی بے بی کو بچا لیا ہے لیکن آئی ایم سوری۔ آپ کی مسز کوما میں جاچکی ہیں۔"

"بی پی شوٹ کر جانے کی وجہ سے ان کے دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی۔" ڈاکٹر طیبہ مزید بتایا تھا۔

"ان کے ہوش میں آنے کا امکان تو ہے لیکن صرف دس فیصد' ویسے معجزے بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر نے تسلی دی تھی اور آگے بڑھ گئی تھیں۔ وہ خاموش کھڑا رہ گیا تھا۔ اس نے چار سال اسے نفرت کا احساس دلانے میں گزارے تھے وہ اسے دس ماہ میں محبت کا احساس دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

بی بی جان' عباس کے کمرے کی صفائی کروانے آئی تھیں۔ انہوں نے مردانے سے عباس کو بھی بلالیا تھا۔

"بی بی جان! اس بستر کو ادھر ہی رہنے دیں۔ اس کے کپڑے مت اٹھائیں۔ اور یہ چیزیں بھی۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "وہ جلد ٹھیک ہو کر آئے گی' مجھے یقین ہے۔"

بی بی جان نے اس کے بستر کی چادر بدلی تو تکیے کے نیچے سے اس کا چھوٹا سا پرس اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

یہ وہ پرس تھا جو فروا گھر سے لے کر نکلی اور پھر واپس نہ جاسکی' یہ بابل کے گھر سے آنے والا اس کا واحد اثاثہ تھا' وہ اسے بہت سنبھال کر رکھتی تھی حالانکہ اس میں تھا ہی کیا؟ ایک موبائل۔ چند کرنسی نوٹ۔ آئی ڈی کارڈ اور ایک تصویر۔ وہ نوٹ جو فروا نے کبھی خرچ نہیں کیے تھے۔

پرس میں سے تصویر نکل کر نیچے جاگری تھی۔ بی بی جان نے سرسری نظر تصویر پر ڈالی۔ اور۔ ان کی آنکھیں جیسے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ عباس سر جھکائے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"عباس۔ عباس یہ تصویر۔"

"بی بی جان! یہ فروا کی تصویر ہے۔ اس کے والد کے ساتھ کھینچی ہوئی۔" وہ نارمل انداز میں بتانے لگا تھا۔

"نہیں عباس۔ یہ تو میری۔ میری زرنین ہے۔" اور کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے فیروز ملک ان کی آواز سن کر اندر آکر تصویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا۔

"ہاں یہ تو ہماری زرنین کی تصویر ہے۔" یہ گڑیا انہیں ابھی تک یاد تھی۔ وہ سمجھ نہ پائے تھے کہ اس تصویر کا فروا سے کیا تعلق ہے لہٰذا انہوں نے نارمل انداز میں تصدیق کی تھی۔

"چچا جان! یہ فروا کی تصویر ہے۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا اور یہ ساتھ اس کے والد۔" فیروز حیران ہو کر دیکھنے لگے اور پھر تصویر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔

زرنین ابدال ساتھ مقام اور وقت بھی درج تھا اور بی بی جان جانتی تھیں یہ ابدال کی عادت تھی۔ تصویر کے پیچھے جگہ اور مقام لکھ دیتا تھا۔

"میری زرنین زندہ ہے۔" وہ جیسے اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔ ان کی آواز حویلی کے در و دیوار کا سینہ

چیخ گئی۔

"اگر پچیس سال پہلے ہونے والے حادثے میں وہ بچ گئی تھی تو اب تک کس کے پاس تھی؟" سب کمرے میں جمع تھے جب افراسیاب ملک نے سوال اٹھایا تھا۔ اور عباس کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔

"فارینہ بیگم نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔"

"اس کی ماں کا نام فارینہ تھا۔" وہ یک دم بول اٹھا تھا اور نڈھال سی بی بی جان نے سسکی لی۔

"ابدال نے جس عورت سے شادی کی تھی اس کا نام۔ فارینہ۔ ہی تھا۔"

☼ ☼ ☼

افروز ملک کے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے ارباز پھر فیروز کے بعد اکلوتی بیٹی زریں اور پھر تین بیٹے تھے۔

بڑے ارباز کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے۔ ثریا بانو کی گود میں عباس تھا جب وہ اپنے کسی دوست کی بہن سے شادی کر کے اسے حویلی لے آئے تھے۔ ثریا بانو بگڑ کر میکے جا بیٹھیں مگر ارباز ملک نے عباس کو نہ جانے دیا۔ زریں نے عباس کو سنبھال لیا اور انہوں نے ثریا بانو سے بھی تعلق نہ توڑا جو تھیں تو بڑی بھابھی مگر عمر میں ان کے برابر تھیں اور دوستی بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ کئی بار صرف ماں جی کو بتا کر عباس کو ماں سے ملوانے لے جاتیں اور ثریا جو بیٹے کی جدائی میں تڑپ رہی ہوتیں' ان کی پیاسی ممتا پر پھوار پڑ جاتی۔

ثریا بانو اپنی ضد کے ہاتھوں مجبور تھیں' واپس آنے کی شرط انہوں نے یہ رکھی تھی کہ ارباز اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے دیں' ارباز کی ہر طرح کی یقین دہانیوں کے باوجود کہ ان کی کوئی حق تلفی نہیں ہوگی ثریا بانو اپنی ضد پر اڑی ہیں تو ارباز نے زچ ہو کر ثریا کو طلاق بھجوانے کا فیصلہ کر لیا' یہ وہ وقت تھا جب حویلی کی اکلوتی بیٹی زریں کی شادی کے جوڑے تلے جا رہے تھے اور زریں نے یہ ضد پکڑ لی تھی کہ جب تک بڑی بھابھی شادی میں شریک نہیں ہوں گی تب تک وہ رخصت ہو کر نہیں جائے گی۔

پھر اس نے ماں جی اور بابا جان سے کہہ کر ارباز ملک کو راضی کیا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر دوسری حویلی میں رہائش پذیر ہو جائیں۔ یوں دوسری حویلی کی تزئین و آرائش کے بعد اسے رہائش کے قابل بنایا گیا اور بعد ازاں سارا خاندان خود بخود دو حصوں میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ تین خاندان یہاں مقیم تھے تو تین دوسری حویلی میں۔ ممتاز ملک کے دو بیٹی شفٹ ہونے کے بعد یہاں صرف دو خاندان رہ گئے تھے یوں ثریا کسی حد تک اپنی ضد پوری کروا کر حویلی واپس آئیں تو زریں کی زیر بار تھیں۔ زریں نے یہ سب کچھ ان سے مشورہ کے بعد ہی کیا تھا۔ ورنہ کوئی بعید نہیں تھا کہ اب ارباز ملک انہیں طلاق بھجوا دیتے۔

اور عباس۔ اس عرصے میں زریں سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ ثریا بانو کو کم ہی لفٹ کرواتا۔ حتیٰ کہ زریں کے رخصت ہو کر جانے کے بعد بھی کئی کئی دن ان کے پاس رک جاتا۔ اور وہ بھی حویلی آتیں تو رو رو کر انہیں روک لیتا۔ زریں کی ازدواجی زندگی بہت مختصر رہی۔ ان کے شوہر ابدال ملک شادی سے پہلے ہی فارینہ کے اسیر تھے۔ وہ ایک ماڈل تھی جس کا تعلق کسی بدنام زمانہ خاندان سے تھا۔ اور ابدال کے والد نے اپنے دوست کی بیٹی سے شادی کر کے بند باندھنے کی کوشش کی تھی مگر ایک روز چار ماہ کی زرمین کو ڈائریا ہونے پر ایمرجنسی میں شہر لے کر گئے تو پتا چلا کہ فارینہ اس کی زندگی میں نو سال پہلے ہی آ چکی تھی۔ ابدال کے والد انتہائی سخت گیر طبیعت کے تھے۔ انہوں نے فارینہ کو بازو سے پکڑ کر باہر کیا اور ابدال پر گاؤں میں رہنے کی پابندی لگا دی۔ مگر ڈیڑھ سال بعد جب وہ ہارٹ اٹیک میں سفر عدم پر روانہ ہوئے تو فارینہ ان کی زندگی میں لوٹ آئی۔ ابدال نے زرمین کو بی بی جان سے چھین کر فارینہ کی گود میں ڈال دیا۔ زریں کے والد اور بھائیوں نے بچی کے حصول کا کیس کرنا چاہا تو ابدال نے پیغام بھجوایا۔ وہ بچی کے ساتھ طلاق نامہ بھی بھجوا رہے تھے یوں انہیں خاموش ہونا پڑا۔ زریں راتوں کو اٹھ کر

خالی پہلو ٹٹولتیں تو عباس کو بھینچ کر سینے سے لگا دیتیں۔

فارینہ کی فرمائش پر ابدال زمینیں اور اثاثہ جات بیچ کر آسٹریلیا شفٹ ہو گئے اور پھر وہیں سے وہ اطلاع آئی جس کو سن کر زریں کی آنکھوں کے سوتے کبھی خشک نہ ہوئے۔ فارینہ اور ابدال کے ساتھ ان کی زرنین بھی زندگی کی بازی ہار گئی تھی اور انہیں اجنبی زمین میں سپرد خاک کر دیا تھا۔

اس وقت ذرائع ابلاغ اتنے تیز رفتار نہیں تھے اور پھر یہ اطلاع ابدال کے قریبی دوست نے دی تھی۔ لہٰذا یقین نہ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ فارینہ کو ڈاکٹروں نے اولاد کی طرف سے ہری جھنڈی دکھا دی تھی لہٰذا اس کے کہنے پر ابدال نے یہ ڈراما کیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ زریں کا اثر و رسوخ والا خاندان کبھی زرنین کو ان سے چھین نہ لے۔ دوسری طرف زرنین کو ہوش سنبھالنے پر یہی بتایا گیا تھا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ فارینہ اسے باور کراتی کہ اس نے اپنی زندگی زرنین کے لیے وقف کر کے مزید بچوں کی چاہ ہی نہ کی۔

بزنس میں شدید خسارے کے بعد ابدال چھ سال بعد پاکستان لوٹ آئے اور مختلف شہروں میں آباد رہے۔ تب ابدال کو احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی لاڈلی کو تنہا کر دیا ہے۔ وہ رشتوں سے متعلق سوال کرتی تھی اور ان سوالوں کا جواب ابدال کے پاس یہ تھا کہ اسے بتا دیا جائے۔ اس کے ددھیال اور ننھیال کے متعلق اور تب ابدال کا فارینہ سے شدید جھگڑا ہوا تھا۔ فارینہ نے بالآخر سوچنے کی مہلت مانگی اور اسی مہلت میں ابدال کا کام "سنکھیا" کی بدولت تمام کر دیا تھا۔ اسے زرنین سے اپنا بڑھاپا سنوارنا تھا۔ کیونکہ ابدال کے وہ حالات نہ رہے تھے جن کا خواب لے کر اس نے اسے اپنی زلفوں کا اسیر بنایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ذلیل کم ذات کہاں دفع ہو گئی ہو؟" دروازہ ایک ملازمہ ٹائپ لڑکی نے کھولا تھا۔ پیچھے سے ایک عورت کی کرخت آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی تھی۔

"فارینہ بیگم سے ملنا ہے۔" پراپرٹی ایجنٹ کے بتائے گئے ایڈریس پر آکر اس نے بتایا تھا۔

"اندر آکر بیٹھیں۔ میں بلاتی ہوں۔ پتا نہیں مکار بڑھیا آپ سے ملنے پر تیار ہو گی یا نہیں۔" ملازمہ نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر اسے آگاہ کیا اور پھر اندر کمرے میں چلی گئی۔

"کون ہے؟" کس کو اندر بلا لیا یوں جانے پوچھے بغیر۔"

عباس کی سماعتوں نے اس عورت کی آواز ایک بار پھر سنی' اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ بدحال نفسیاتی مریضہ اس کے سامنے اسے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کس سلسلے میں آنا ہوا؟"

"آپ بیٹھیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

"اچھا بھئی' بیٹھ جاتی ہوں۔" اس نے عباس پر جیسے کوئی احسان کیا تھا۔

"میں فروا کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔"

"وہ تو کئی سال پہلے بھاگ گئی تھی میں اس کے بارے میں کیا جانوں؟" اس نے تمسخر سے جواب دیا تھا۔

"میں زرنین کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے اپنا سوال دہرایا تھا۔ اس عورت کو جیسے کرنٹ لگا اور وہ خوف زدہ نظروں سے عباس کو دیکھنے لگی۔

"جاؤ بھئی۔ مجھے کچھ نہیں پتا' میرا وقت ضائع نہ کرو۔" وہ اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ۔!" اس نے چند نوٹ نکال کر لہرائے "یہ کوئی پولیس کیس نہیں ہے مجھے صرف تجسس ہے۔" اس عورت کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

"میرے پاس ایک چیز ہے تمہارے لیے۔ اگر تم اس کی قیمت ادا کر سکو۔"

وہ رک گیا تو وہ عورت اندر سے ایک البم اٹھا لائی تھی۔ اور وہ البم عباس نے لا کر بی بی جان کے حوالے

کر دیا تھا۔ یہ فروا کی تصویریں تھیں۔ دو سال کی۔ تین سال کی۔ اسکول کی۔ کالج کی۔ باپ کے ساتھ شرارتیں، خرگوش کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔
اور بی بی جان اس طرح تڑپ تڑپ کر روئی تھیں کہ سب ہی رو پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

اور پھر سب کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ بی بی جان کا صبر رنگ لایا تھا۔ فروا لوٹ آئی تھی ڈاکٹر نے فروا کی ذہنی ابتری کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے اچانک کوئی بھی شاکنگ بات بتانے سے منع کیا تھا۔
اور ماں کے وجود کی ٹھنڈک نے اس کو سیراب کر دیا تھا۔
ننھے منے وجود کو اس نے بی بی جان کی گود میں ڈالا تو اس کی پیشانی چومتے ہوئے بے اختیار ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل آئے۔
"عباس! اس کا نام میں رکھوں گی۔" انہوں نے جھلملاتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔
"میں اس کا نام زرنین رکھوں گی۔" بی بی جان کی بات پر وہ مسکرا دیا تھا۔
"زرنین۔" ثریا بانو نے دہرایا تھا اور فروا کی طرف دیکھا تھا جو کمبل میں دبکی عجیب سوئے جاگے دماغ کے ساتھ اپنے دھیان میں تھی۔
فروا نے عجیب مانوس نامانوس سا نام سنا اور پھر اچنبھے سے نظریں اٹھا کر بی بی جان کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔
"آپ کو پتا ہے پہلے میرا نام زرنین تھا؟"
"پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟" انہوں نے جواب دینے کے بجائے مسکرا کر پوچھا تھا۔
"زریں!"
سائرہ نے اٹھ کر ایک الماری کی دراز کھینچ کر باہر نکالی اور بند بر رکھتے ہوئے ایک فراک اس کے سامنے کی اور پھر ایک گڑیا اسے دکھائی تھی۔

"فوراً یہ چیزیں۔۔۔ یہ گڑیا یہ فراک کس کی ہے؟"
"کسی بچی کی ہیں۔"
یہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا کہ بی بی جان کے شوہر نے دوسری شادی کر کے بچی کو ان سے چھین لیا تھا۔" سائرہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"یہ چیزیں بی بی جان کی بیٹی کی ہیں۔ جو انہوں نے آج تک سنبھال کر رکھی ہیں۔ ہمیں ابھی ہفتے پتا چلا ہے۔ کہ بی بی جان کی بیٹی زندہ ہے۔"
"واقعی! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔
"بی بی جان کا اصل نام زریں ہے۔ بی بی جان تو ہم ان کو لاڈ پیار اور احترام سے کہتے ہیں۔ ان کے شوہر کا

نام ابدال احمد ملک اور بیٹی کا نام زرنین تھا اور جس عورت سے اس نے شادی کی اس کا نام فارینہ تھا۔"

سائرہ نے مزید انکشاف کیا تھا اور فروا کو کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی دھواں سا بھر رہا تھا۔

"اور جو تصویر تمہارے پاس ہے نا زرنین۔ ایسی کئی تصویریں تو تمہاری بی بی جان کے پاس بھی ہیں۔" دراز میں سے نکال کر سائرہ نے تصویریں اس کے سامنے کیں۔

بی بی جان اٹھ کر اس کے پاس آگئیں۔ "اللہ جانے میرے رب کو میرا کون سا عمل اتنا پسند آگیا کہ اتنے عرصے بعد میری گڑیا مجھے مل گئی۔" انہوں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے خود سے بھینچ لیا تو بے یقینی سے یقین کی کیفیت میں کرتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"مجھے اللہ نے وہ عطا کر دیا جو میں خواب میں بھی اس سے مانگنے کا نہیں سوچ سکتی تھی۔" فروا کے ذہن کا دھواں پانی بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔

" زرنین! اس عورت نے تمہارا نام نہ بدلا ہوتا۔ تو میری بیٹی مجھے پانچ سال پہلے مل گئی ہوتی میرے سامنے تو کاتھ کا کھو! ابھی زرنین کہلائے تو میں چونک اٹھوں، سوتے میں کوئی نام لے تو میں جاگ اٹھوں۔ میں پہلے دن ہی اپنی گڑیا کو پہچان لیتی۔" بی بی جان کئی بار اس سے بات کرتیں۔ "جب تم مجھ سے بچھڑی تھیں نا تو بہت کم دوسری چیزیں کھاتی تھیں، زیادہ تر میں ہی تمہیں فیڈ کراتی۔ اور میں سالوں پریشان رہی یہ سوچ کر کہ پتا نہیں تم نے کچھ کھایا ہو گا یا نہیں۔

میں تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی رہی۔ مجھے اپنی بیٹی بہت یاد آتی۔ کبھی کبھی کھلکھلاتی ہوئی، کبھی روتی ہوئی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میری طرف لپکتی ہوئی۔

"تم حویلی کے لان میں کھیلتے ہوئے جب جہاز کی آواز سنتی تھیں نا تو دوڑ کر میری طرف بھاگتیں چاہے میں کتنی ہی دور کھڑی ہوتی اور سب ہنستے تھے کہ اسے ماں کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں ہے۔"

"تم مجھے یاد کرتی تھیں زرنین؟" کبھی وہ اس سے پوچھتیں۔

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، مگر مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی، تب ہی تو بابا اور اس عورت نے مجھے یہ بات رٹوا دی تھی کہ میری اماں اللہ کے پاس چلی گئی ہیں۔"

کبھی وہ بیٹھی ہوتی تو بی بی جان اس کے پاؤں سہلانے لگتیں۔

"کیا ہے اماں؟" وہ پاؤں کھینچ لیتی۔ "ایسے کیوں کرتی ہیں؟"

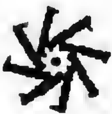
"میں دیکھتی ہوں میری گڑیا کے ہاتھ اور پاؤں کتنے چھوٹے چھوٹے تھے اور اب۔" وہ اس کے ہاتھ چوم لیتیں اور فروا کو لگتا اس نے ساری زندگی میں ماں کو اتنا یاد نہیں کیا جتنا اس کی ماں نے ایک دن میں کیا ہو گا۔

"میں نے کبھی اپنے دل میں اس بات کا دکھ نہیں پالا کہ ابدال نے فارینہ سے شادی کیوں کی، میرے دل سے ہمیشہ ہوک اٹھتی ایسی کہ وہ میری بیٹی کو کیوں لے گیا۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ میرے جگر کے ٹکڑے کو مجھ سے جدا کرے۔ میں تمہارے بغیر بہت تنہا رہی زرنین۔"

"تمہارے بابا تمہارا خیال رکھتے تھے؟"

فروا کو لگتا وہ جو جاننا چاہتی ہیں اسے زندگی میں کوئی دکھ ملا کتنی چوٹیں لگیں۔ کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور یہ سچ تھا کہ باپ کی زندگی میں وہ بہت مطمئن رہی تھی۔ ابدال نے اس کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ تب وہ باپ کے ساتھ گزرے نازنخروں کی شرارتوں کی باتیں سناتی تو ان کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگتا۔

عباس نے فروا کو رفاقتوں کا بھرپور اعتماد دیا تھا۔ محبت دی تھی لیکن اسے زندگی کی طرف لانے والی بی بی جان کی محبت تھی۔



بہنوں کا
شعاع
اپنا ماہنامہ

فروری 2015
کے شمارے کی ایک جھلک



فروری 2015
شمارہ شائع
ہو گیا ہے

- نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول "رقصِ بسمل"،
- فرح بخاری کا مکمل ناول "شامِ خزاں طویل سہی"،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول "یارم" تکمیل کے آخری مراحل میں،
- مصباح نوشین کا مکمل ناول "میرے بے خبر، میرے بے نشاں"،
- سحر ساجد کا ناولٹ "غربتِ رحمت"،
- راشدہ رفعت کا ناولٹ "محبت زندگی ہے"،
- نظیر فاطمہ، فریدہ فرید، سیما بنت عاصم اور کنیز نور علی کے افسانے،
- ٹی، وی کی معروف فنکارہ "یمنیٰ زیدی" سے ملاقات،
- "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" آمنہ زریں کا تبصرہ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جھروکوں سے، موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع کا فروری 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

تنزیلہ ریاض



نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے، جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔

عمر شہوز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہوز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہوز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہوز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہوز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول





اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈپا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ جیتاڑ اؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ اس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہوسکتے۔ گرینڈپا کو بتایا۔ وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہوز کو بتاتی ہے۔ شہوز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر اپنی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کردیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کردیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کرکے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہوز کو فون کرتی ہیں۔ شہوز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کرکے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کردیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے' جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے' جسے عمر یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کردیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتادیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگاکر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری' گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگادیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرمین حسن حمید کا روائی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد 'احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے' لیکن وہ انتہائی خود غرض' مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹوگرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا 'عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی 'ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی' خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں' زارا کے والدین زارا اور شہوز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں' جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے' کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز 'زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امائمہ 'نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جا کر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے' مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر 'نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثیا رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں پڑ جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے' مگر ثیا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ثیا خودکشی کر لیتی ہے۔

بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے مؤذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے' اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بس گرانٹ ہی ہے' مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا' پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی ثریا سے شادی کر دی' جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب ثریا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے نیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

۱۲
بارہویں قسط

"یہ کلر کیسا ہے؟" اس نے شرٹ اپنے ساتھ لگا کر امائمہ سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں سیلفریجز (سپر مارکیٹ) کے گارمنٹس سیکشن میں کھڑے تھے۔

عمر امائمہ کو بڑا کسی غرض کے یہاں لایا تھا۔ وہ آج کل گھر سے باہر کم ہی جاتی تھی۔ عمر کو اپنے بھائی کے متعلق بتا کر وہ بہت سکون محسوس کرتی تھی۔ اسے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا اور عمر اس کے بھائی کی کوئی نہ کوئی خیر خبر ضرور لے آئے گا۔ عمر اس کو تازہ ہوا کھلانے کے لیے لایا تھا۔ سیلفریجز ان کے گھر کے نزدیک تھی۔ ممی بھی ان کے ساتھ تھیں، لیکن وہ گروسری کے سیکشن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ان کا ارادہ باقاعدہ شاپنگ کا نہیں تھا۔ وہ بلا ضرورت اور حاجت، مختلف سیکشنز میں پھر رہے تھے۔

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ آلو بینگن لگ رہا ہے بالکل۔" اس نے ناک چڑھا کر ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔ وہ شرٹ آف وائٹ اور پرپل رنگ کی تھی۔ عمر نے اس کو گھور کر دیکھا، پھر وہ شرٹ دوبارہ اس کی جگہ پر ہینگ کر دی۔

"اچھا یہ کیسی ہے؟" اس نے دوسری شرٹ اٹھا کر اپنے ساتھ لگائی جو آف وائٹ اور پنک رنگ کی تھی۔

"اونہہ۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری چوائس کو۔ بہت بری ہے۔" وہ پھر ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"اتنی بری بھی نہیں ہے ویسے۔ جتنی بری شکل تم نے بنائی ہے۔" عمر نے اس کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"یا اللہ اب یہی سننا باقی تھا۔ یعنی لوگ اب ہمیں شکل کا طعنہ بھی دیا کریں گے۔" وہ ٹہلتے ہوئی شرٹس کو آگے پیچھے کرتے ہوئے سرسری انداز بولی تھی۔

"لوگ کچھ دے رہے ہوں تو شکریہ ادا کر کے لے لینا چاہیے۔ آج کل کے زمانے میں دیتا کون ہے بھئی۔"

وہ اب لیڈیز شرٹس والے سیکشن کی جانب بڑھ گیا تھا۔ امائمہ مسکراتے ہوئے وہیں کھڑی شرٹس کو الٹ پلٹ کرتی رہی تھی۔ اس دوران ایک لڑکا سامنے سے آکر اسٹینڈ کو ہلانے لگا تھا، جہاں امائمہ کھڑی تھی۔ امائمہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اس نے لمبے لمبے بال بڑھا رکھے تھے۔ نیلی آنکھیں سفاک سی تھیں۔ عام طور سے ایسا ہوتا نہیں تھا۔ امائمہ کو اس سے پہلے کبھی کسی جگہ پر ایسا برا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر پیچھے ہٹ گئی تھی کہ شاید اس لڑکے نے ڈرگز وغیرہ لی ہوئی ہیں، کیونکہ وہ آپے میں نہیں لگ رہا تھا۔ امائمہ اس کے قریب سے نکل کر آگے ہونے لگی تھی۔ کیونکہ وہ شرٹس دیکھنے کے بہانے اسٹینڈ کو بار بار ہلاتا جا رہا تھا۔ امائمہ نکلنے لگی تو اسٹینڈ اس کے اوپر گرتے گرتے بچا تھا۔

"واٹ نان سینس۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ لڑکا اس کے منہ کے قریب آکر زور سے چیخا تھا اور پھر مسلسل چلانے لگا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں رہا تھا یا شاید امائمہ اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن وہ بے تحاشا ڈر گئی تھی۔ اس لڑکے کا شور سن کر عمر اور کچھ مزید لوگ بھی متوجہ ہوئے تھے۔ عمر فوراً اس کے قریب آیا اور قریب آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے امائمہ سے پوچھا تھا لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔

وہ لڑکا اب کچھ بولنے لگا تھا، لیکن چونکہ وہ بہت تیزی سے بات کر رہا تھا۔ اس لیے امائمہ قطعاً سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس کے اشارے دیکھ رہی تھی جو اس کے سر کی جانب تھا۔ وہ خوف زدہ کھڑی تھی۔

"تم کو کیا اعتراض ہے۔ یہ اس کا حق ہے وہ جو چاہے جیسے چاہے پہنے۔" عمر اس لڑکے کے انداز پر انتہائی برا مان کر بولا تھا۔

اس لڑکے نے بات سمجھنے کے بجائے مزید گالیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ اس کے اور عمر کے درمیان بحث شروع ہو گئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف مسلسل ہذیان بک رہا تھا۔ امائمہ کو خدشہ ہونے لگا تھا

کہ ان کے درمیان کہیں ہاتھاپائی نہ شروع ہو جائے۔ اسی دوران دو سیکیورٹی والے بھی آگئے تھے۔ عمر نے امائمہ کو گاڑی کی چابی تھما کر اسے وہاں سے جانے اور گاڑی میں اس کا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا کا پس نے اسے وہیں کھڑے رہنے کے لیے کہا۔ انہوں نے ان دونوں کی گفتگو کو سنا تھا پھر عمر کو تحمل کا مشورہ دے کر اس لڑکے کو پکڑا تھا اور باہر کی جانب لے گئے تھے۔

امائمہ کو سیکیورٹی والوں کی بات سے سمجھ میں آیا تھا کہ وہ لڑکا اس کے اسکارف کی بنا پر اسے "ریڈیکل مسلم" کہہ کر گالی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مطالبہ کر رہا تھا کہ یا تو اسے مارکیٹ سے باہر نکالا جائے یا پھر اس کا اسکارف اتروایا جائے۔ امائمہ تو ڈر گئی تھی لیکن عمر کا موڈ بہت آف ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کچھ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات امائمہ کو سمجھا رہے تھے کہ وہ بہت غصے میں ہے۔ وہ ایلی ویٹر سے نیچے اتر آئے تھے۔ امائمہ نے پہلے کچھ چاکلیٹس خریدی تھیں۔ لیکن عمر کا رویہ دیکھ کر اس نے انہیں بھی ایک سائیڈ پر رکھ دیا تھا اور ممی کو لے کر کیش کاؤنٹر پر رکے بغیر باہر کی سمت آگئے تھے۔ اس نے کبھی عمر کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں لاتعداد سوچیں تھیں۔ پھر جیسے وہ ایک نتیجے پر پہنچی تھی' جبکہ ممی اشاروں میں امائمہ سے پوچھ رہی تھیں کہ اچانک کیا ہو گیا۔

"میں آئندہ پبلک پلیس پر اسکارف نہیں پہنوں گی" اس نے انہیں ساری بات بتا کر عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ ایک بہتر فیصلہ ہے امائمہ۔ برا مت ماننا بیٹا! لیکن جس ملک میں رہو' وہاں کے طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔" ممی نے اس کا ساتھ دیا۔

"اوہو ممی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی کو اس ملک میں کپڑے اتارنے کی آزادی ہے تو پہننے کی بھی ہے۔ ایک شخص کی بدتمیزی سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ کوئی آپ کی شخصی آزادی میں جس طرح چاہے مداخلت کر سکتا ہے۔ یہ امائمہ کا حق ہے وہ اگر اسے پہننا چاہتی ہے تو کوئی اسے نہ پہننے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔"

وہ سپاٹ انداز میں بولا تھا۔ اس سے پہلے کہ امائمہ کچھ بولتی آنٹی نے عمر کو ٹوک دیا تھا۔

"عمر تم اس معاملے میں مت بولو۔ تم عقل سے زیادہ جذبات کے سہارے چلتے ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاملے میں ایموشنل ہو کر سوچا جائے ایسے کام سنورتے نہیں، بگڑتے ہی ہیں۔ یہ برمنگھم یا مانچسٹر نہیں ہے۔ یہ لندن ہے۔ یہاں آج کل ہیڈ اسکارف پہننے والوں کو ریڈیکل کہہ کر ہر روز تذلیل کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت حال میں یہی بہتر ہے کہ احتیاط برتی جائے" امائمہ نے ساس کی بات سنتے ہوئے عمر کے چہرے کو بھی نوٹس کیا تھا' جہاں تاثرات ہر جملے کے ساتھ مزید بگڑ رہے تھے۔ آنٹی پرس میں پانی کی بوتل تلاش کرنے لگی تھیں۔

"آنٹی میں آئندہ پبلک پلیس پر ہیڈ اسکارف نہیں پہنوں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" امائمہ نے انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔ اس وقت اس کے حواس بالکل کام نہیں کر رہے تھے۔

"میں تمہیں اس قدر بزدل نہیں سمجھتا تھا امائمہ۔" عمر نے اس کی جانب دیکھا تھا پھر وہ بے انتہا چڑ کر بولا تھا۔

امائمہ نے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔ اس کا دل چاہا وہ اس سے کہے کہ ابھی خاموش رہو' ہم یہ بات اپنے گھر جا کر زیر بحث لا سکتے ہیں۔ اپنی ممی کے سامنے چپ رہو' لیکن وہ یہ بات بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ وہ عمر کو خفگی بھرے انداز میں پارکنگ سے گاڑی باہر نکالتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ دل ہی دل میں کافی گھبرائی تھی اور ممی بھی کافی الجھے ہوئے انداز میں پسنجر سیٹ پر بیٹھی ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ وہ ساری خوشی زائل ہو گئی تھی' جس کے زیر اثر وہ گھر سے نکلے تھے۔

"تم مجھ سے حجاب کے معاملے میں بحث کر سکتی ہو'

جھگڑ سکتی ہو۔ دلیل دے کر میرا منہ بند کروا سکتی ہو لیکن ایک شخص تمہیں اتنا خوف زدہ کر دیتا ہے' اس کی فضول باتیں تمہیں اتنا مجبور کر دیتی ہیں کہ تم اپنی منشا و مرضی کے خلاف کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتی ہو یعنی تمہارے لیے اس نیم پاگل شخص کی باتیں اہم ہیں میری نہیں۔"

اس کی آنکھوں سے بھی غصہ جھلک رہا تھا۔ امائمہ نے اسے ایسے انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بولے تو کیا بولے۔

"عمر! تم خاموش نہیں رہ سکتے۔ مجھے امائمہ کا نہیں پتا' لیکن میں واقعی بہت خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ امائمہ کا فیصلہ ٹھیک ہے۔ اب مزید بحث مت کرو۔"

ممی نے اکتا کر ایک بار پھر مداخلت کی تھی۔

"بحث؟ ممی میں پولیس کمپلینٹ کرنے والا ہوں۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ہمیں ہراساں کیا گیا ہے۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا تھا' لیکن ممی نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔ "شٹ اپ مائی ڈیئر سن۔ میں تمہیں ایسی کسی حماقت کی اجازت نہیں دے سکتی۔ بھول جاؤ جو بھی ہوا اور براہ مہربانی اپنے ابو کے آنے پر ان کے سامنے یہ ذکر بھی مت کرنا۔ وہ خوامخواہ اپ سیٹ ہوں گے۔" وہ دو دن بعد واپس آرہے تھے۔

"ممی پلیز۔ آپ چپ رہیں۔ آپ دونوں چپ ہی رہیں تو اچھا ہے۔ جنگل کا قانون ہے کیا کہ چپ چاپ بیٹھا رہوں؟ میں آپ دونوں کو گھر ڈراپ کر کے اس معاملے کی رپورٹ کروں گا۔ چپ رہنے کا مطلب ہے ایسے لوگوں کو شہ دینا۔ میں ایسا کروں گا تو یہ حماقت ہوگی۔"

وہ اب کوئی لائحہ عمل طے کر چکا تھا' اس لیے کسی حد تک پرسکون لگ رہا تھا۔ امائمہ نے تھوک نگل کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنی ساس سے بھی بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سارے معاملے کی قصوروار وہ ہی تھی۔

"عمر! مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم سے سختی سے بات کروں۔ تم ہمیشہ چھوٹے بچے مت بنے رہا کرو۔ جذباتی اور ضدی۔" ممی نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"ممی۔ میں جب بھی سچ بولتا ہوں۔ میں جذباتی اور ضدی ہو جاتا ہوں۔ آپ لوگوں نے خود ہی فرض کیا ہوا ہے کہ میں جذباتی ہوں۔ تو ٹھیک ہے۔ میں جذباتی ہوں۔ اپنے حق پر ڈٹے رہنا اگر جذباتیت ہے تو ٹھیک ہے میں جذباتی ہوں۔" عمر نے سخت لہجہ نہیں اپنایا تھا' لیکن اس کے لہجے میں جو ہٹ دھرمی تھی وہ صاف نظر آرہی تھی۔

"عمر! یہ جذباتیت ہی انتہائی ہے تو ایک بات یاد رکھو۔ یہ 2012ء ہے۔ حالات ہم جیسوں کے لیے بہت برے ہو چکے ہیں۔ ایک ہم مسلمان دوسرا ہم پاکستانی آئی تھنک۔ ایک چھوٹی سی غلطی بھی بھاری پڑ سکتی ہے۔ ایک لمحہ لگے گا ان کو تمہیں اپنے ملک سے نکالنے میں۔"

ممی اب سفاکانہ انداز میں اس کو حقیقت سے روشناس کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ امائمہ کی نظریں عمر کے چہرے پر تھیں' جس کا رنگ خطرناک حد تک سرخ تھا۔ وہ بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"ان کا ملک۔ کن کا ملک ممی۔؟ یہ میرا بھی ملک ہے۔" وہ ۔۔۔۔ چیخ کر بولا تھا۔

"عمر! یہ تمہارا ملک نہیں ہے۔ تم اگر یہاں کے اصولوں سے بغاوت کر کے یہاں رہنا چاہتے ہو تو یہ واقعی تمہارا ملک نہیں ہے۔ یہ ہمارا ملک نہیں ہے اور یہ بات تم جتنی جلدی اپنے ذہن میں بٹھا لو اتنا ہی تمہارے اور ہم سب کے لیے اچھا ہوگا۔" ممی کا انداز اس سے زیادہ برا تھا۔

"ممی اگر زندگی کے تیس سال اس جگہ گزار کر بھی آپ نے یہی کہنا تھا تو پھر معاف کیجیے گا کہ آپ نے یہاں آکر سخت غلطی کی۔ آپ کو پاکستان سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ نے ہمیں اگر یہی سبق دینا تھا تو بہتر ہوتا آپ ہمیں یہیں پلنے بڑھنے دیتیں۔"

وہ چڑچڑ کر بول رہا تھا۔ امائمہ نے اسے ہمیشہ ہی اپنے

موقف کی حمایت میں ایسے ہی بحث کرتے دیکھا تھا' لیکن آج سے پہلے وہ بھی اتنی دل برداشتہ نہیں ہوئی تھی۔ اسے ماں بیٹے کے درمیان یہ بحث دکھ دے رہی تھی اور شرمندگی الگ ہو رہی تھی۔

"یہی سننے کے لیے تو پاکستان سے یہاں لائے تھے تمہیں۔ یہی سب پانے کے لیے تو قربانیاں دی تھیں کہ ایک دن اولاد بڑی ہو جائے اور طعنے دے سکے۔ ماں باپ کے فیصلوں کو غلط قرار دے سکے۔" ممی کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ امائمہ نے عمر کو اشارہ کیا تھا کہ وہ چپ رہے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ممی۔ آپ بات کو غلط سمت میں لے جا رہی ہیں۔" وہ بھی ماں کے تاثرات دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ وہ ہائپو ٹینسو تھیں اور ان کو گہری سانسیں بھرتے دیکھ کر امائمہ اور عمر دونوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔

"تم یہی تو جتا رہے تھے عمر۔ تم یہی جتانا چاہ رہے تھے کہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں پاکستان کے بجائے یہاں ایک اچھے ماحول میں پال پوس کر بڑا کر کے غلطی کی اور واقعی ہم نے غلطی کی جو ہم لوگوں کے اچھے مستقبل کی خاطر یہاں آ گئے۔ اچھا تھا ہم وہیں رہتے۔ تم وہاں کے ماحول میں پلتے بڑھتے' وہاں کے مسائل کو سہتے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے تو تمہیں احساس ہوتا کہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں لا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔"

وہ گہرے سانس بھرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ عمر کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ممی کی طبیعت بگڑنے کا خدشہ تھا سو بہتر تھا کہ اس بحث کو طول نہ دیا جاتا۔ وہ تینوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"وہ تمہیں ممی سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

امائمہ نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ممی کو ڈراپ کر کے فوراً" اپنے گھر آ گئے تھے۔ حالانکہ انہوں نے کہا بھی تھا کہ کھانا کھا کر جاؤ اور گھر سے نکلنے سے پہلے ان کا پلان بھی یہی تھا کہ کھانا ان کے ساتھ کھا کر آئیں گے' لیکن درمیان میں اس سنکی شخص والا مسئلہ ہو گیا۔ عمر آج کل اپنے ابو کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کی گاڑی استعمال کر رہا تھا' اس نے اپنے مزاج کی برہمی کو ظاہر کرنے کے لیے گاڑی بھی ان ہی کے گھر چھوڑ دی تھی اور امائمہ کے ساتھ اپنے گھر بیس منٹ کی واک کر کے واپس آ گیا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے اطمینان سے کھانا کھایا تھا اور امائمہ کو کافی بنانے کا کہہ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ امائمہ جانتی تھی وہ بات نہیں کرنا چاہتا' سو یہ ظاہر کرنے کو اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہے' وہ روٹین کی سرگرمیوں میں بلاوجہ کی دلچسپی لینے لگتا تھا۔ لیکن امائمہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات کرے اور یہ پولیس کمپلینٹ کا خیال دل سے نکال دے۔ اس کے ساتھ یہ واقعہ پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی ہوئی تھی۔ لیکن ممی کا موقف بھی غلط نہیں تھا۔ اخبارات میں کہیں نہ کہیں ایسے واقعات پڑھنے کو مل ہی رہے تھے۔ "بین دا برقع" نامی ایک کمپین بھی کسی تنظیم کی طرف سے چلائی جا رہی تھی۔ اخبارات اور ٹی وی پر بھی اس شکایت کو کوریج دی گئی تھی۔ ایسی صورت حال میں ایسی شکایت بے کار ثابت ہوتی۔

"کم آن امائمہ۔ اب ختم کرو اس بات کو۔ میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔" وہ ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر بولا تھا۔ امائمہ نے اپنا کپ ہاتھ میں پکڑ کر اس کے قریب ہی کاؤچ پر نشست سنبھال لی تھی۔

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔" وہ برا مانے بغیر بولی تھی۔

عمر نے ابھی بھی اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس سے خفا نہیں تھا۔ لیکن وہ بے چین تھا اور امائمہ جانتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں بہت الجھا ہوا ہے۔

"اس کا مطلب تم واقعی مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔" اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولی تھی۔

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ امائمہ دل برداشتہ ہو کر اٹھنے

لگی تھی۔ تب ہی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ سے بٹھا دیا۔

"بیٹھی رہو یار۔ دل بہت بوجھل ہے۔ تم اٹھ کر چل دیں تو مزید بے چین ہو جائے گا۔" اس نے منہ کا زاویہ تبدیل کیے بنا کہا تھا۔ امائمہ کو دل ہی دل میں بہت سکون ملا۔ وہ جتنا بھی الجھا ہوا تھا لیکن اس سے غافل نہیں تھا۔ یہ بات بہت حوصلہ افزا تھی۔

"دل کو بوجھل کر دینے والی باتیں دل میں جمع مت رکھو نا۔ کہہ ڈالو سب کچھ۔" وہ کاؤچ پر دونوں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ یہ اس کا ٹی وی دیکھنے اور عمر سے باتیں کرنے کا مخصوص انداز تھا۔

"دل میں کچھ جمع نہیں ہے یار۔ بس ایویں میں کبھی کبھی الجھ جاتا ہوں۔ زندگی کے تیس سال اس ملک میں گزارے ہیں۔ اس دوران کبھی ایک بھی مرتبہ کوئی بھی اِل لیگل کام نہیں کیا' کسی کو مارنا وارنا تو دور کی بات' کسی پر کبھی سخت نگاہ بھی نہیں ڈالی' کبھی کیو نہیں توڑی' کوئی سگنل نہیں توڑا' کبھی سڑک پر تھوک نہیں پھینکا' کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہمیشہ انرجی بلز وقت پر جمع کروائے' ٹیکس بھی ادا کیے۔ اسے زیادہ اور کیا کرے کوئی کسی خطے کے لیے۔ یہ سب کر کے بھی اگر یہ ملک میرا نہیں ہے' تو پھر میرا ملک کون سا ہے۔ کیا میرا حق نہیں ہے کہ مجھے شکایت ہے تو اسٹیٹ کا قانون مجھے میرا حق دلوائے۔"

وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ امائمہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ واقعی کافی دکھی لگ رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ممی کی اسی بات سے میں بہت ہرٹ ہوتا ہوں۔ انہوں نے اتنا وقت یہاں گزار کر بھی جب اپنی اولاد کو یہی سکھانا تھا تو کیا بہتر نہ ہوتا کہ ہمیں پاکستان میں ہی رکھتے۔ ہمیں یہ احساس نہ ہوتا کہ ہم آدھے تیتر آدھے بٹیر ہیں۔ یہ بڑی تکلیف دہ کیفیت ہے۔ بالخصوص لندن میں رہنا مشکل تھا امائمہ۔ ہم آنامیکلی بہت کمزور تھے۔ اور لندن کمزور لوگوں کا شہر نہیں ہے۔

ایک مہنگے ترین شہر میں سستا ترین لائف اسٹائل بھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ہم نے ایک کمرے کے گھر کا جتنا کرایہ بھرا ہے نا بائیس سال۔ اتنے میں پاکستان میں پانچ کمروں کے پانچ گھر بنا سکتے تھے ہم۔ لیکن ہم یہاں رہے۔ لندن میں۔ تمہیں بتاؤں ہم کیسے رہے۔" وہ مکمل اس کی جانب مڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہمارے آس پاس کے کمروں میں غیر مسلم رہتے تھے۔ سائپرس سے' آسٹریلیا سے' گریس سے۔ سری لنکا سے۔ انڈیا سے۔ وہ سب بھی اچھے ہی لوگ تھے' لیکن ان کی اپنی مخصوص ویلیوز تھیں جو مادر پدر آزاد تھیں اور ہماری مذہبی اقدار سے متصادم تھیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے رہنا پڑتا تھا۔ ہم نے بچپن قید میں گزارا ہے۔ ہمارے گھر سے' نکلنے پر پابندی ہوتی تھی' ہم ارد گرد والے بچوں کے ساتھ کھیل نہیں سکتے تھے۔ ممی کو ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ ہم کسی کے ساتھ کھیل' کھیل میں ان کے گھر کا کھانا نہ کھالیں جو حرام ہو' ہم بے دھیانی میں الکحل نہ پی لیں۔ ممی ہمیشہ ہر نئے دوست کے متعلق اتنی محتاط رہتی تھیں' اتنے سوالات کرتی تھیں کہ دوست بنانے سے دل ہی متنفر ہو جاتا تھا۔ بڑی گھٹن تھی امائمہ۔ تم نہیں سمجھ سکتیں وہ اذیت۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ امائمہ نے گردن ہلائی۔ اس کے پاس زیادہ لفظ نہیں تھے کہ وہ اس کی تشفی کر پاتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ عمر دل برداشتہ بیٹھا رہے اور کوئی ایسا جملہ بھی منہ سے نہیں نکالنا چاہتی تھی جو عمر کو اس کی ممی سے مزید متنفر کرے۔

"ان کی نیت پر تو شک مت کرو۔ والدین تو اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔ وہ تم لوگوں کے اچھے بچپن' اچھے مستقبل کے لیے ہی تمہیں یہاں لائے تھے۔" وہ یہی کہہ سکی۔

"نیت پر شک نہیں کر رہا۔ اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے مجھے۔ اور محبت سے زیادہ ان کا احترام کرتا ہوں۔ بہت جتنوں سے پالا ہے انہوں نے ہمیں۔ تمہیں بتاؤں میرے ابو نے پاکستان کیوں چھوڑا تھا۔؟"

وہ پہلی بار اپنے والدین کے متعلق ایسی باتیں کر رہا تھا۔ وہ امائمہ سے ان کے متعلق باتیں تو پہلے بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ شاید پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اپنی محرومیوں کا ذکر کر رہا تھا۔

"ابو نے جی سی سے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا ڈسٹنکشن کے ساتھ۔ وہ گولڈ میڈلسٹ تھے۔ ان کی فیملی میں سب گریجویٹ تھے اور ابو کے گولڈ میڈل اور ماسٹرز کی ڈگری نے ابو کو مغرور کر دیا تھا۔ انہیں اپنی پسند کی جاب ملتی نہیں تھی اور دادا کا بزنس وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ابو کو چڑ تھی سویٹر جرسیاں (ہوزری کا بزنس) بیچنے سے۔ دادا کا اچھا خاصا بزنس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تایا ابو (شہوز کے ڈیڈی) کی طرح میرے ابو بھی ان کا ہاتھ بٹائیں۔ لیکن وہ دادا سے لڑ کر ضد کر کے لندن آئے تھے کہ یہاں ان کے علم کی ان کی ڈگری کی خوب قدر ہوگی۔ ایسا کب ہوتا ہے یار۔ رزق تو اللہ نے دینا ہوتا ہے۔ اور اللہ شناختی کارڈ دیکھ کر رزق نہیں بانٹتا۔ ابو کو یہاں آکر بھی کوئی ہائی فائی جاب نہیں ملی تھی' لیکن واپس جاتے تو سبکی ہوتی۔ سولہ سال تک میرے ابو نے ایک اسٹور پر اسٹور کیپنگ کی اوور ٹائم کے پارٹ ٹائم جاب کی۔ بہت مشقت تھی جو ہم سب نے مل کر جھیلی۔ یہ جو اسٹیبلٹی تم اب دیکھ رہی ہونا۔ یہ پہلے دن سے نہیں تھی۔ میرے ماں باپ نے واقعی خون پسینہ ایک کیا تو ہم یہاں تک آئے ہیں۔ یہ سب کہنے سننے میں جتنا آسان لگ رہا ہے نا اتنا تھا نہیں۔ ممی کو کبھی چھٹی نہیں ملتی تھی وہ چھوٹے سے عمو اور صبا کو میرے حوالے کر کے دروازہ باہر سے لاک کر کے جاب پر جاتی تھیں۔ عمو کو میں نے اپنی گودوں میں اٹھا اٹھا کر پالا ہے۔ ہمارے پاس کوئی نانی' دادی' خالہ یا پھپھو نہیں تھیں جو ہمیں امی کی غیر موجودگی میں سنبھال لیتیں۔ ہمیں کھانا پکا کر دیتیں۔ میں نے چھوٹی سی عمر میں کھانا پکانا سیکھ لیا تھا تاکہ ممی کو کوئی آسانی ہو سکے۔ میں لانڈری بھی کرتا تھا' بہن بھائیوں کو بھی سنبھالتا تھا۔"

وہ بوجھل سے لہجے میں سب بتا رہا تھا۔ امائمہ نے اسے ٹوکا تھا نہ تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتی تھی وہ اپنے دل کی بھڑاس پوری طرح نکال لے۔

"میں کیسے کہہ دوں کہ میرا بچپن اچھا گزرا امائمہ۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا بچپن شہوز اور اس کے بھائیوں کا تھا۔ زارا کا تھا۔ میرے دوسرے کزنز کا تھا۔ ہم جب پاکستان جاتے تھے تو لگتا تھا جیسے جنت میں آگئے ہوں۔ ہم پانچ افراد نے زندگی کے بائیس سال ایک کمرے کے گھر میں گزارے۔ جو کہ پاکستان میں ہمارے گھر کے پورشن کے کچن جتنا تھا۔ پاکستان ہمارے لیے جنت تھی امائمہ۔ سارا دن کھیلنا کودنا۔ کھانا پینا۔ کسی پابندی کے بغیر۔ پیرنٹس مکمل طور پر ہمیں ملتے تھے۔ ہمارا خیال رکھ سکتے تھے۔ وہ وہاں ہمیں نہ تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے نہ اکتائے ہوئے۔ وہ ہمیں تفریح کروانے باہر لے جا سکتے تھے' کھانا کھلا سکتے تھے۔ وہاں کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تھا کہ جو ہمیں کھانے کے لیے دیا جا رہا ہے۔ وہ حلال تو ہے نا؟ ہمارے لیے پاکستان میں گزارے گئے دو مہینے دو تین سال بعد ہمیں ملتے تھے' باقی چھتیس مہینوں سے کہیں زیادہ قیمتی خوب صورت اور یادگار ہوتے تھے۔

میں کیسے کہہ دوں کہ ہمارا بچپن اچھا تھا امائمہ۔ آج سے بیس بائیس سال پہلے کا لندن ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے' یا شاید ہمارے حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ ہم لندن پر حق جتا سکتے۔ ہم نے اس ڈر سے کبھی کھانا باہر نہیں کھایا تھا' کہ کہیں ہم کوئی نان حلال فوڈ نا کھالیں۔ ہم نے یہاں کبھی کوئی عید ایسے نہیں منائی جیسی ہمارے کزنز پاکستان میں مناتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف وہی نماز عید اہتمام سے پڑھی جو پاکستان میں کبھی پڑھ لی۔ آسانی کہاں سے تھی امائمہ۔ بچپن تو بہت مشکل تھا۔ ہم انگلش بچوں کے ساتھ پبلک اسکولز میں پڑھتے تھے۔ ہم پر ریسسٹ کومنٹس ہوتے تھے۔ ہم برداشت کرتے تھے۔ ممی سختی سے سمجھا کر بھیجتی تھیں کہ لنچ اسکول کا نہیں کرنا۔ کیونکہ ہمارے اسکول میں حلال حرام کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ بچے بڑے ہو جانے پر میری ممی کو صرف ایک

خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں میں کسی گوری کے ساتھ ڈیٹ پر نہ چلا جاؤں۔ صبا پر سب سے زیادہ سختی ہوتی تھی۔ میری اتنی لائق فائق بہن ہائی اسکول کے بعد مزید پڑھ نہیں سکی، صرف اس لیے کہ میرے پیرنٹس کو خدشہ رہتا تھا کہ وہ لڑکی ذات کسی غیر مسلم کے ساتھ الفو نا چلا لے۔ اور نہ صرف میرے پیرنٹس کا خدشہ نہیں تھا۔ یہ یہاں رہنے والے سارے ماں باپ کا نائٹ میئر ہے۔"

وہ چپ ہو گیا تھا ایمہ نے دیکھا اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس زاویے سے تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"ہر جگہ کی کچھ کلچرل ویلیوز ہوتی ہیں عمر! ان کا دھیان تو رکھنا پڑتا ہے۔" ایمہ نے اپنی جانب سے تسلی دینا چاہی تھی۔ وہ لفظوں کی کمی کا شکار تھی۔

"میں نے کون سی ویلیوز کا خیال نہیں رکھا یار۔ ان ہی ویلیوز کی وجہ سے ہی تو پولیس کمپلینٹ کے لیے ضد کر رہا ہوں۔ میں نے گوروں سے یہی سیکھا ہے کہ اپنے حق کے لیے آواز ضرور بلند کرنی چاہیے۔ اور ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ گوروں کی کلچرل ویلیوز بہت اسٹرانگ ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کلچر صرف لباس تک محدود ہے، لیکن یہ تصور غلط ہے۔ کلچرل ویلیوز کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس معاملے میں گورے ہم سے آگے ہیں جو ہماری مذہبی ویلیوز ہیں وہ ان کی کلچرل ویلیوز ہیں۔ میں نے یہاں رہ کر سیکھا کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ کیونکہ گورا جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے یہ بھی سیکھا کہ انڈر دا ٹیبل منی یعنی رشوت کا مطلب میری یا کسی دوسرے کی حق تلفی ہے۔ سو میں نے یہ بھی کبھی نہیں کیا۔ میں عورت کے پیچھے آوازے نہیں کستا، کسی کے معاملات کی ٹوہ نہیں لیتا۔ میں سڑک پر گاڑی لے کر جاؤں تو کبھی ہارن نہیں بجاتا کہ کسی کو گراں گزرے گا۔ میں نے راشٹ کامنٹ سے ہیں، سو میں کبھی کسی کو رنگ نسل زبان کی بنیاد پر حقیر نہیں جانتا۔ میں برابری کے ہر قانون کو تسلیم کرتا ہوں سو میں سب انسانوں کو ایسے ہی ٹریٹ کرتا ہوں جیسے میں خود کو ٹریٹ کیا جانا پسند کرتا ہوں۔ یہ ہیں وہ ویلیوز جن کو میں فالو کرتا آیا ہوں اور اس کے باوجود مجھے بتایا جاتا ہے کہ میں یہاں کے رہنے والے لوگوں سے کمتر ہوں، ان کے برابر نہیں ہوں۔ تم خود بتاؤ کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ ہر اصول، ہر قانون پر عمل پیرا ہونے کے بدلے مجھے اس ملک کا آزاد خود مختار شہری سمجھا جائے۔ یا مجھے یہ خدشہ تا عمر رہے گا کہ مجھے یہاں سے نکال دیا جائے گا کیونکہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔ مجھے جب یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔ تو میں دکھی ہو جاتا ہوں۔ ڈپریسڈ ہو جاتا ہوں۔ اسے آسانی کہتی ہیں ممی؟ یہ ہے اچھا مستقبل؟ اتنا ہی اچھا مستقبل ہے تو خدشہ کاہے کا۔ اونہہ۔ آسانی۔"

اس نے لمبا گہرا ہنکارا بھرا تھا۔ ایمہ بوجھل دل کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ "نہیں ایمہ۔ یہ آسانی نہیں ہے۔ ایسی زندگی آسان نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ آسان زندگی ہے تو ہم اس سے کہیں زیادہ اچھی آسان اور خوب صورت زندگی پاکستان میں گزار سکتے تھے۔ ہم تو دوہری زندگیاں جیتے ہیں۔ پاکستان جاتے ہیں تو وہ ہمیں اپنا حصہ نہیں مانتے اور یہاں آتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں ڈس اون کر دیا جاتا ہے۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تم عجیب انسان ہو عمر۔ یہاں کا اور پاکستان کا کیا مقابلہ۔ لوگ یہاں رہنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اپنے باپ دادا کی جائیدادیں بیچ دیتے ہیں، اپنی زندگی کی جمع پونجیاں لٹا دیتے ہیں اس ملک کی امیگریشن حاصل کرنے کے لیے۔" وہ نجانے کیا کہنے والی تھی لیکن عمر نے اسے موقع نہیں دیا۔

"ہاں۔ لوگ ایسا کرتے ہیں اور میں شرطیہ کہتا ہوں کہ ایسے لوگوں میں سے نوے فیصد پچھتاتے ہیں اور پھر ساری زندگی یہ سوچتے ہوئے گزار دیتے ہیں کہ وہ بہتر ہیں یا یہ۔ انسان اپنی تقدیر اور اپنی اقدار سے پیچھا کبھی نہیں چھڑا سکتا ایمہ۔ وہ چاہے تب بھی نہیں۔"

"تم آج کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہو۔" وہ مسکرائی تھی۔ ایسی باتیں وہ روٹین میں نہیں کرتا تھا۔ امائمہ نے اسے، لندن کی تعریفوں میں قلابے ملاتے دیکھا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

"میں کچھ معاملات میں تو واقعی جذباتی ہوں۔ میں پاکستان جاؤں تو لندن کی باتیں کرتا رہتا ہوں اور یہاں آؤں تو مجھے وقفے وقفے سے پاکستان یاد آتا رہتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ اس کا مزاج اب کچھ بہتر ہو رہا تھا۔

"پاکستان کیوں یاد آتا ہے؟" وہ اٹھلا کر پوچھ رہی تھی۔ عمر نے اس کے انداز پر ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ کو گرم جوشی سے دبایا تھا۔

"آف کورس پاکستان میں شہروز ہے۔ زارا ہے۔ میری تائی امی ہیں جو ورلڈ بیسٹ بریانی بناتی ہیں۔ میرے تایا ابو جو شلوار قمیص پہن کر گولف کھیلنے جاتے ہیں۔ پاکستان میں انور رٹول ملتا ہے۔ سوہن حلوہ۔ چلغوزے۔ پھٹورے۔ نان چنے میرا فیورٹ ناشتا۔ اور پاکستان میں دھوپ سینکنے کے لیے بیچ پر نہیں جانا پڑتا۔ وہاں بڑے بڑے گھر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ٹیرس ہوتے ہیں۔ اور اور۔" اس نے سوچتے ہوئے امائمہ کی جانب دیکھا۔ اس نے مصنوعی ناراضی کا مظاہرہ کر کے ہاتھ چھڑانا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں بھئی۔ تم بھی تو پاکستان کی سوغات ہو۔ میری ونڈرفل لائف پارٹنر۔" امائمہ نے سکون کا سانس لیا تھا کہ صد شکر وہ ہنس رہا تھا۔

"میں تمہاری باتیں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ ذرا نرم لہجے میں بولی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔ اسی لیے میں الجھا ہوا ہوں۔" وہ دونوں بازو سر کے پیچھے رکھ کر ٹانگوں کو پھیلا کر بولا تھا جیسے تھکے ہوئے جسم کو آرام دے رہا ہو۔

اسی دوران فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے زارا کو فون اٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تھا تو عموماً کال نہیں لیتا تھا۔ تین رنگز کے بعد ریکارڈ مشین پر پیغام ریکارڈ کروایا جانے لگا تھا۔ "عمر! تم نے جس شخص کا کہا تھا۔ میں نے اس کا پتا کروالیا ہے۔ نور محمد نام کا کوئی شخص یہاں لوٹن میں نہیں ہے۔"

امائمہ کی جان نکل گئی تھی۔ ایک یہی تو آخری اطلاع تھی جو اس کے بھائی کے متعلق تھی اور اب کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے عمر کی جانب دیکھا وہ اس کو اپنے بازو کے حلقے میں لے کر بیلی کی بات سننے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نور محمد سے یہاں ہی ملے۔ لوٹن میں؟"

میرا سارا قصہ سن لینے کے بعد سلمان حیدر نے مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ نور محمد سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ قصوں کہانیوں سے، لفظوں آوازوں سے، دوست احباب سے متاثر ہو کر اپنا وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے وقت پر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ میرے فلیٹ میں ابھی ہم دونوں ہی رہائش پذیر تھے۔ مجھے سلمان حیدر سے بات کرنے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ وہاں بے یقینی کے گھنے بادل چھائے تھے۔ مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ ایک صحافی تھا اور میں ایک ناولسٹ۔ وہ سچ میں جھوٹ ملا کر زیبائش داستان کا عادی تھا جبکہ میں جھوٹ میں سچ ملا کر یہی کام ایک عرصے سے کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا اسے آسانی سے میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ مجھے اس کا انداز برا بھی نہیں لگا تھا جب تک کہ اس نے دوسرا سوال نہیں کیا تھا۔

"آپ اس شخص سے یہاں ہی پہلی بار ملے۔ آپ نے اسے پہلی بار یہیں، کہیں دیکھا۔ اور آپ اس سے بے تحاشا متاثر ہو گئے۔ اتنے کہ آپ نے کنورٹ ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آپ کو نہیں لگتا کہ آپ ایسی کہانیاں لکھ کر دولت تو کما سکتے ہیں لیکن نیکیاں نہیں۔ میں متاثر نہیں ہوا۔" اس نے

صاف گوئی سے کہا۔ مجھے وہ شخص زہر لگا۔ مجھے ہمیشہ وہ لوگ برے لگتے تھے جو میرے انداز میں بات کر کے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔

"میں آپ کی بے یقینی کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟" میں نے بے تاثر لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ ابھی تک نور محمد کا دوست ہونے کی وجہ سے میرے لیے اہم رہا تھا' لیکن اب یہ اہمیت ختم ہونے لگی تھی۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ "المہاجرون" کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے' اپنی شخصیت کو چھپا رہا ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"آپ نور محمد کو جھوٹا کیسے کہہ سکتے ہیں۔" میں نے تڑپ کر پوچھا تھا۔

"وہی' میں آپ بھی جھوٹے ہیں۔ آپ احمد معروف نہیں ہیں۔ آپ کنورٹ نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کا نام بل گرانٹ ہے۔ آپ اپنے ناول کے لیے مواد حاصل کرنے کے لیے اس شخص کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نور محمد کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ ایک شخص جس کی زبان سے آپ واقف نہیں ہیں' جو اپنی بات آپ کو سمجھانے کے لیے چار دفعہ جھٹکا کھاتا ہے اور بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی' جس کا نام نسب آپ جانتے نہیں' جس کا رنگ بھورا ہے اور شاید یہ وہ پہلا شخص ہو گا جس کے ساتھ بیٹھ کر آپ ایک ہی برتن میں کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ آپ کے لیے اتنا اہم کیسے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حقارت تھی۔ مجھے انتہائی برا لگا لیکن میں نے بہت تحمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجھے راسسٹ سمجھ رہا تھا۔ میں پھر بھی صبر کر رہا تھا۔ میں اگر یہ نہ کرتا تو مجھے حیرت ہوتی۔ میں نے اتنے مہینوں میں برداشت کرنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا تھا۔

"آپ کے اسی سوال کا جواب تو عہد الست ہے۔" میں نے کہا تھا اس کے چہرے پر تحقیر و تضحیک بڑھی تھی۔ اب کی بار میں نے پرواہ نہیں کی تھی۔ میں اگر ایک شخص کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا تو میں آئندہ دنیا کو کیسے مطمئن کرنے والا تھا۔

"میں احمد معروف نہیں ہوں۔ میں بل گرانٹ ہوں۔ یہ بات غلط نہیں ہے' لیکن یہ بات غلط ہے کہ میں نور محمد کا استعمال کر رہا ہوں۔ میں نے عہد الست میں اپنی ہی کہانی لکھی ہے۔ اور میرے دل میں دین اسلام کی بہت عزت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں جو پہلا اہم نکتہ سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو "بشر" بنایا ہے۔ وہ فطرتاً' نیکی سے تسکین اور بدی سے ترغیب لیتا ہے' یعنی وہ ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نیکی سے خوش ہوتا ہے' اور بدی اس کو اپنی جانب راغب کر لیتی ہے۔ یہی فطری کشمکش دنیا میں اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔ زندگی اسی کشمکش کے توازن کا نام ہے۔ یہ توازن آپ کو سکھاتا کون ہے۔ بے شک مذہب ہی آپ کو توازن سکھا سکتے ہیں۔ اس لیے ایک بات سمجھ لیجئے کہ مذہب دنیا کے لیے بے حد ضروری ہیں۔"

میں نے اپنا پہلا ترپ کا پتا پھینکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چبھتی ہوئی روشنی ناقابل برداشت ہوئی تھی۔

"آپ مسلمان ہیں یا نہیں؟" اس نے پوچھا تھا' مجھے اس کے لہجے کی تلخی پر غصہ آیا۔

"میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی پوری کوشش کر رہا ہوں' لیکن مجھے میرا موقف واضح کرنے دیں۔ میں مذہب کے متعلق وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مذہب یا مذاہب غلط ہوتے ہیں نہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی آسانی کے لیے ہی وجود میں آئے ہیں۔ یہ دنیا کے میکنزم کو سمجھانے اور چلانے کی مینوئل بک ہیں۔ یہ دنیا کا منشور ہیں اور یہ بات دنیا ہر سو سال بعد بھول جاتی ہے۔ اگلے سو سال بعد وہ اس بحث میں گزار دیتی ہے کہ مذاہب کو کس طرح دنیا کا سب سے بڑا ناسور قرار دیا جائے۔ سائنس کو' سوشل سائنسز کو' ٹیکنالوجی کو مذہب کے مقابلے میں دس میں سے دس

نمبر دے کر دنیا پر رائج کر دیا جائے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہتا ہے۔ اس لیے کہ آنے والے سو سال وہ ایک بار پھر مذاہب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ وہ ورغلایا جاسکتا ہے۔ وہ ورغلائے جانے کے بعد پچھتا بھی سکتا ہے۔ یہی انسانی چیلنج ہے۔ وہ جنت سے اپنی اسی فطرت کی وجہ سے بے دخل کیا گیا اور وہ جنت کے حصول کے لیے بھی اسی فطرت کی وجہ سے سرگرداں رہتا ہے' آپ اسے بدل نہیں سکتے۔ انسانوں کے درمیان سب سے مشترک چیز یہی فطرت ہے۔ اور دنیا لاتعداد انسانوں کی رہائش گاہ ہے کیونکہ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ یہ بات حتمی ہے۔

وہ دنیا میں اکیلا آتا ہے لیکن دنیا میں اکیلا نہیں رہتا ہے۔ ہر علم' ہر مذہب اور سائنس متفق ہے کہ انسان یا دوسرے جان دار بھی یکتائی نہیں جھیل سکتے۔ یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ انسانوں کو انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ملتے ہیں تو خاندان بنتے ہیں' خاندان مل کر معاشرہ بناتے ہیں اور معاشرے سے ریاست بنتی ہے اور ریاستیں مل کر دنیا بناتی ہیں۔ یعنی انسان اس پوری دنیا کی بنیادی اکائی ہے' لیکن اکائیاں مل کر ہی ایک پورا نظام بناتی ہیں۔ ان اکائیوں کو جوڑنے اور متحد رکھنے کے لیے انسانیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ بھانت بھانت کے انسان' کالے انسان بھورے انسان' سفید انسان' سمندر کے اس طرف کے انسان' سمندر کے اس طرف کے انسان' محبت کی میٹھی بولی بولنے والے انسان' کڑوے سچ کے تلخ لہجے والے انسان۔ اس دنیا میں اسی انسانیت کی وجہ سے متحد رہ سکتے ہیں۔ انسانیت کو اگر دنیا سے عنقا کر دیا جائے تو پھر یہ دنیا ہی جہنم ہے' جبکہ انسان اس دنیا میں جنت بنانے کے لیے آیا ہے اس دنیا کو جہنم بنانے کے لیے نہیں۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ انسان رنگ نسل زبان سے ماورا ہو کر اس دنیا میں رہے۔ وہ اگر اس امتیاز سے نکلیں گے' تو ہی چین و سکون سے رہ پائیں گے' یہی انسانیت کا پہلا درس ہے' پہلا اصول ہے' جبکہ دین اسلام اس درس پر مکمل ہوتا ہے۔ انسانیت جس مقام سے پہلا قدم اٹھاتی ہے' دین اسلام اس قدم پر اپنا سفر ختم کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حج الوداع میں واضح طور پر انہوں نے فرمایا کہ "اے ایمان والو! آج تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا گیا۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔" یعنی رنگ نسل اور زبان کی ہر برتری کو رد کر دیا گیا رنگ نسل اور زبان کی بنیاد پر کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں اور انسان کو جج کرنے کا صرف ایک معیار ہے اور وہ معیار "تقویٰ" ہے۔ آپ یا میں کون ہوتے ہیں نور محمد کو یا کسی بھی اور ایکس وائی زیڈ کو ایسی باتوں کی بنیاد پر جج کرنے والے۔ یہ کام تو اللہ بھی نہیں کرے گا۔ کیا ہم اللہ سے بڑے ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ اب چپ تھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔

"میں نے اس مذہب کو پڑھ کر اور پرکھ کر یہی سیکھا ہے کہ سب سب برابر ہیں اور انسانوں میں امتیاز کرنے والی واحد چیز "تقویٰ" ہے۔ تقویٰ وہ لٹمس پیپر ہے جس کی بنیاد پر انسان کو جانچا جاسکے گا کہ آیا وہ "مومن" ہے یا نہیں ہے۔ یہ اللہ سبحان تعالیٰ کے بنائے ہوئے معیار ہیں۔ وہ اسی لٹمس پیپر (تقویٰ) کے ذریعے جانچیں گے کہ ہم میں سے مومن کون ہے۔ ہمیں انسانوں کو جانچنے کا' جج کرنے کا اول تو اختیار ہی نہیں اور اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں انہیں جج کرنا ہی ہے تو کم از کم معیار تو کوئی ڈھنگ کا ہو۔ انسان اگر مومن ہے تو وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ وہ غدار نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ آپ میرے یا میرے مذہب کے متعلق سوال مت کیجئے۔ میں غدار نہیں ہو سکتا اور نور محمد جھوٹا نہیں ہے۔ میں نے اتنے عرصے اس شخص کے ساتھ رہ کر یہی دیکھا ہے کہ وہ ایک متقی انسان ہے۔ اب آپ کی باری ہے۔ آپ خود یہ لٹمس پیپر استعمال کر کے جانچ لیجئے کہ نور محمد کتنے جھوٹے اور کتنے سچے ہیں۔"

"اس لٹمس پیپر (تقویٰ) کو حاصل کیسے کرتا ہے۔ استعمال کیسے کرتا ہے' یہ بھی آپ ہی بتا دیجئے۔" سلمان

حیدر میری ساری بات سننے کے بعد بولا اور اب کی بار میں مسکرایا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔
"تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے جسے اکملیت حاصل ہوتی ہے۔" میں نے کہا تھا۔
"اکملیت ....؟" اس نے استفہامیہ انداز میں دوہرایا۔ اب کی بار میں مسکرایا تھا۔
"یہی تو وہ ترپ کا پتا ہے جو مجھے نور محمد کے ساتھ رہنے سے ملا۔ اور یہی تو وہ ترپ کا پتا ہے جو میں اپنے ناول میں استعمال کرنے والا ہوں۔"
میں نے طمانیت والی گہری سانس بھری تھی۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسا سرخرو ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے فلاپ اور کامیابی میں فرق سمجھ میں آیا۔
"میرے ساتھ آئیے۔" میں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔
مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے میری حسیات مجھے کچھ اشارہ کررہی ہوں۔ میں اپنی الماری کی طرف بڑھا تھا۔ الماری کا پٹ کھولتے ہی مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میرا چرمی بیگ جس میں "عہد الست" کا مکمل مسودہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ اسی دوران ایک زوردار آواز سنائی دی تھی جیسے کچھ گرا ہو۔ میں پیچھے مڑا تھا۔ سلمان حیدر عقب میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بوتا یا سمجھنے کی کوشش کرتا۔ میرے سر کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ میرے سر پر کسی چیز سے وار کیا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے تاریکی چھانے لگی تھی۔ میں نے بیڈ کے کراؤن کا سہارا لینا چاہا لیکن میں خود کو سنبھال نہیں پایا تھا اور فرش پر گر گیا تھا۔ ہوش حواس کے غائب ہونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ فرش پر کوئی اور بھی گرا ہوا تھا۔

❊ ❊ ❊

"یہ نور محمد کی کہانی ہے۔" مس صفیہ مشہود نے اپنے پین کو دونوں ہاتھوں میں گھماتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔
"نور محمد؟" شہروز نے سرہلاتے ہوئے دہرایا تھا۔ یہ مس مشہود کے ساتھ اس کی پہلی اور آخری میٹنگ بھی تھی۔ اس کے بعد اسے لندن فلائی کرجانا تھا۔ اسے تمام تر مواد ای میل کے ذریعے ڈیلیور کردیا گیا تھا۔ اس نے سرسری جائزہ لیا تھا۔
"یہ شخص ایک دہشت گروپ اور اسلامی جہادی تنظیم "المہاجرون" کے لیے کام کرتا ہے۔ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے' ایک برطانوی ناولسٹ بل گرانٹ جو اپنے کسی ناول کے لیے ریسرچ کرتے ہوئے اس تنظیم تک پہنچا تھا اور اس کا مقصد ان کے متعلق معلومات اکٹھی کرنا تھا اسی کو نور محمد نے اغوا کرلیا تھا۔ اس کے بعد سے بل گرانٹ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ایک مفروضہ ہے کہ وہ المہاجرون کے پاس زندہ موجود ہے اور اب انہیں کے لیے کام کرتا ہے۔ جب کہ اس بات کے بھی امکان ہیں کہ شاید اسے قتل کردیا گیا ہے۔ یہ ڈاکومینٹری اسی موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ یہ حقیقی کہانی ہے لیکن اسے علامتی کہانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں چند پاکستانی بھی ان لوگوں کے ساتھ ان کی معاونت کرتے ہیں۔ آپ اگر سب کچھ دیکھ لیتے تو شاید اندازہ ہوجاتا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایجنسیز بھی کوئی رول پلے کررہی ہیں۔ اس کا دورانیہ نوے منٹ ہے اور اس پر کافی کام پہلے ہی مکمل ہوچکا ہے۔"
مس صفیہ اسے اپنی طرف سے بہت اچھے طریقے سے بات سمجھا رہی تھیں لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔
"افغانی ہے یہ شخص؟" شہروز نے سرہلاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اسے چند دن پہلے تمام تر چیزیں ای میل کے ذریعے بھجوادی گئی تھیں۔ لیکن وہ اپنی دوسری مصروفیات میں بھول گیا تھا۔ اگلے ہفتے اس کی فلائٹ تھی اور وہ لندن جانے کے لیے کافی پرجوش تھا۔ اس مصروفیت میں باقی ہر کام اس نے پس پشت ڈالا ہوا تھا۔

"پاکستانی ہے۔ تیس پینتیس سال عمر ہے۔ کیا میں آپ کو اس کے بارے میں مزید تفصیل بتاؤں؟" وہ اس کے چہرے پر تجسس دیکھ کر سوال کرنے لگیں۔ شہروز نے سر ہلایا۔

"یہ شخص یہیں لاہور کا رہنے والا تھا۔ یہاں کے ہی اسکول کالج وغیرہ میں پڑھا تھا لیکن ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ ان کے والد یہاں کسی کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ بنیاد پرست مسلمان ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت بہت گھٹے ہوئے انداز میں کی تھی۔ وہ افغانستان میں طالبان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ ان کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان کا بیٹا بچپن سے ہی مار دھاڑ والے رجحانات رکھتا تھا۔ کالج میں کلاس فیلوز کے ساتھ اور گھر میں ماں باپ کے ساتھ بھی اس کے فسادات کا ذکر کیا گیا ہے اس میں..."

"یہ کس علاقے کا رہنے والا ہے... والد کے ویر اباؤٹس کا ذکر ہے اس میں... آپ مجھے ان کے والد کا یا کالج وغیرہ کا نام بتا سکتی ہیں؟" شہروز نے یہ ظاہر کرنے کو کہ وہ مس مشہود کی بات کو بہت انہماک سے سن رہا ہے ایک سوال برائے سوال کیا تھا۔

"ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اس فائل میں موجود ہے جو میں نے آپ کو ای میل کر دی ہے۔ ذیلی لنک بھی دیے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فوٹیجز بھی ہیں۔ سوال جواب کے سیشن بھی ہیں۔ المہاجرون کا کردار، ای ڈی ایل کا کردار... سب کچھ ڈسکس کیا گیا ہے۔ آپ ایک دفعہ کو تھرو ہو جائیں گے تو ہر سوال کا تسلی بخش جواب آپ کو مل جائے گا۔ اس کے علاوہ آپ جب وہاں پہنچیں گے تو باقی جو تفصیلات درکار ہوں گی، وہ بھی فراہم کی جائیں گی۔ ہمارا ایک نمائندہ وہاں آپ کو گائیڈ کرنے کے لیے موجود ہو گا... وہ آپ کی ہر معاملے میں معاونت کرے گا۔ آپ کو اس کے ساتھ مل کر المہاجرون کے چند لوگوں کے ساتھ ملاقات کر کے ان کی رائے لینی ہے اور پھر آپ کو فائنل رپورٹ سر عوف بن سلمان کو کرنی ہے۔ آپ کا کام زیادہ نہیں ہے... آپ کو نورا نجوائے کرنے کا بہت وقت ملے گا۔"

وہ اسے تسلی دیتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ شہروز نے عادتاً" سر ہلایا تھا۔ اس نے ابھی تک وہ کیس اسٹڈی ہی نہیں لیا تھا، جس کی بات مس مشہود کر رہی تھیں۔ اس لیے وہ زیادہ سوالات سے احتراز برت رہا تھا۔

وہ اسے تسلی دیتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ شہروز نے عادتاً" سر ہلایا تھا۔ اس نے ابھی تک وہ کیس اسٹڈی ہی نہیں لیا تھا جس کی بات مس مشہود کر رہی تھیں۔ اس لیے وہ زیادہ سوالات سے احتراز برت رہا تھا۔

"اس ڈاکیومنٹری کا نام نہیں پوچھا آپ نے؟" مس مشہود نے اس سے پوچھا تھا۔

"میں پوچھنے والا تھا۔" وہ یہی کہہ سکا۔

"عہد الست۔" شہروز نے یہ لفظ پہلے نہیں سنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے لیے کیا لے کر آؤں۔"

شہروز نے پاؤں کی مدد سے جھولے کی رفتار کو تیز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اور زارا آبنوسی جھولے پر بیٹھے تھے۔ اس کی صبح چار بجے کی لاہور سے فلائٹ تھی۔ پہلے احسان ماموں الگ فلائٹ سے واپس جانے والے تھے لیکن سب لوگوں کے اصرار پر وہ مزید کچھ دن کے لیے رک گئے تھے اس لیے اب شہروز اور احسان چاچو ایک ہی فلائٹ سے جا رہے تھے۔ اس لیے شہروز دو دن پہلے ہی کراچی سے آ گیا تھا تاکہ سب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل سکے۔ اس مقصد کے لیے رات کے کھانے پر زارا اور اس کے پاپا بھی مدعو تھے۔ اس قسم کی دعوتیں ان کے خاندان میں بہت پُر لطف ہوا کرتی تھیں۔ بہروز بھائی، مہوز بھائی، ڈیڈی اور احسان چاچو سب ہی چٹکلے سنانے اور گپ شپ لگانے میں ماہر تھے لیکن زارا کی ممی کے انتقال کے بعد چونکہ وہ سب ایک ساتھ پہلی بار اکٹھے ہوئے تھے، اس لیے ماحول ابتدا میں افسردہ رہا

تھا۔ ان کا ہی تذکرہ ہوتا رہا۔

زارا کا دل بھی بوجھل ہو گیا تھا' اسی لیے وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ یہ گھر شہوز لوگوں کا آبائی گھر تھا۔ وقت کے ساتھ اس کی جدید طرز پر تزئین و آرائش ہوتی رہی تھی۔ چیزیں آتی رہی تھیں' چیزیں جاتی رہی تھیں لیکن یہ آبنوسی جھولا وہیں کا وہیں تھا' جو شہوز کے دادا نے گھر کے عقبی برآمدے میں بہروز کی پیدائش پر نصب کروایا تھا۔ یہ گھر کے سب بچوں کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ اب بھی بہروز بھائی کی بیٹی عبیرہ اس پر بیٹھ کر گھر گھر کھیلتی رہتی تھی۔

"بونوتا۔۔۔" اس کو خاموش پا کر شہوز نے اس کے کندھے کو ٹہوکا دیا تھا۔

"سوچ رہی ہوں کہ کیا منگواؤں۔۔۔ اب تو سب کچھ یہاں بھی مل جاتا ہے۔۔۔ سوئس چاکلیٹس لے آنا۔" وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ شہوز نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بظاہر اداس تو نہیں لگ رہی تھی۔

"صرف چاکلیٹس۔۔۔ اتنی دور سے تمہارے لیے صرف چاکلیٹس لاؤں گا تو ناک نہیں کٹ جائے گی میری۔۔۔ بلا تکلف فرمائش کرو یار۔۔۔ اب تو میں کافی اچھی اماؤنٹ کما رہا ہوں" وہ اس کے مزاج کو شگفتہ کرنے کی خاطر بولا تھا۔

"اچھا تو پھر بریسلٹ لے آنا۔۔۔ پلاٹینم کی۔۔۔ جس میں تقریباً" سو دو سو ڈائمنڈز جڑے ہوں۔" وہ بھی شرارتی انداز میں بولی تھی۔

"اوہ تیری خیر۔۔۔ سو دو سو ڈائمنڈز۔۔۔ کچھ زیادہ نہیں ہو جائیں گے" وہ ہنسا تھا۔

"صحافی اور سیاست دان کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔۔۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔" وہ ابھی بھی اسے چڑا رہی تھی۔ شہوز نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جی نہیں۔۔۔ صحافی کو اس کی محنت کے پیسے ملتے ہیں جبکہ سیاستدان ڈاکٹرز کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔ دوسروں کی محنت کے پیسوں سے جیبیں اور گھر بھرتے ہیں۔۔۔ نہیں ایسے کہنا چاہیے تھا کہ ڈاکٹرز اور سیاستدان کا یہ حال ہے کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔" وہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔

"تم ڈاکٹرز سے جلتے ہو' اور کوئی بات نہیں' ورنہ تم بہتر جانتے ہو کہ مسیحائی کس قدر مقدس پیشہ ہے۔" وہ جھولے کو پاؤں پر زور دیتے ہوئے جھلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شہوز نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ جھولا ہلنے لگا تھا۔

"اسی لیے تم نے ایک عرصے سے ہاسپٹل کی شکل نہیں دیکھی نا۔۔۔" شہوز نے کہہ تو دیا لیکن پھر یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"میں نے ریزائن کر دیا ہے شہوز۔۔۔" وہ برا مانے بغیر سکون سے بولی تھی۔ شہوز نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے اس سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہ وہی زارا تھی' جو ایک بال کلپ بھی اس سے پوچھے بغیر نہیں خریدتی تھی۔

"زارا۔۔۔ تم نے مجھے بتایا بھی نہیں اور اتنا بڑا فیصلہ بھی کر لیا۔۔۔" وہ واقعی حیران تھا۔

"تم خود ہی تو کہتے رہتے ہو کہ اپنے فیصلے خود کرنا سیکھو۔۔۔ اپنی عقل استعمال کرو۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"اس فیصلے میں عقل استعمال کی ہے تم نے۔۔۔؟" وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ اس ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔ شہوز کو اس کا لاپروا انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ایک بار پوچھ لیتیں۔ مجھ سے مشورہ کر لیتیں۔" وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ زارا نے اس کی جانب دیکھا اور پھر چند لمحے دیکھتی رہی۔

"یہی بہتر ہے میرے لیے۔۔۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں' اب میں صرف وہی کروں گی' جو میں ٹھیک سے کر پاؤں گی" اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"اچھا تو پھر یہ بھی بتا دو کہ تم ٹھیک سے کیا کر سکتی ہو؟" وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ زارا کو اس کا طنز اچھا نہیں لگا۔

"میں وہ سب کچھ ٹھیک کر سکتی ہوں جو اب تک خراب کرتی آئی ہوں۔۔۔ میں بُری ڈاکٹر نہیں ہوں شہوز۔۔۔ بُرا وہ سیٹ اپ تھا جو مجھے کھل کر اپنی توانائی استعمال نہیں کرنے دے رہا تھا۔۔۔ میں ہاسپٹل کی ٹانگ کھینچنے والی سیاست کا شکار ہو کر بھول ہی گئی تھی کہ میں بھی ایک اچھی ڈاکٹر ہو سکتی ہوں۔ میں اپنے ذاتی مسائل میں گم ہو کر بھول گئی تھی کہ زندگی میں کچھ کار آمد بھی کر سکتی ہوں میں۔۔۔ میں نے مریضوں سے 'ضرورت مندوں سے زیادہ اپنے اردگرد رہنے والوں کی دل جوئی میں اپنی طاقت صرف کی۔ میں نے ہمیشہ زندگی میں خوش ہونے والی چیزوں پر شکر گزار ہونے بجائے ناخوش ہونے والی چیزوں کا ماتم کیا ہے۔ اب میں یہ سب مزید نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اسے اپنے منصوبے بتا رہی تھی۔

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کرنا کیا چاہ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنا ایک کلینک بنوا رہی ہوں۔۔۔ رائے ونڈ میں۔۔۔ میٹرنٹی ہاسپٹل کی طرز پر۔ ابھی چھوٹے پیمانے پر شروع کروں گی پھر دیکھوں گی آہستہ آہستہ دائرہ کار بڑھاتی جاؤں گی۔" اس نے مختصراً بتایا تھا۔

"لاہور والے ہاسپٹل کا کیا کرو گی۔" یہ بھی ایک اہم سوال تھا۔

"میں صرف فیصل ٹاؤن والا ہاسپٹل دیکھوں گی۔ وہاں آنٹی تحریم ہیں۔۔۔ بہت اچھی سرجن ہیں۔۔۔ دو ڈاکٹرز نئے ہائر کیے ہیں۔۔۔ میں بھی ہفتے میں تین دن فیصل ٹاؤن ہوا کروں گی اور تین دن رائے ونڈ۔۔۔ فیصل ٹاؤن کا اسٹاف اچھا ہے۔ پاپا بھی دھیان رکھیں گے۔ وہ سب مجھ سے کہیں زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال سکتے ہیں ہاسپٹل۔ اس کے علاوہ تو باقی سب میں پہلے ہی چھوڑ چکی ہوں۔" زارا نے پھر جھولا جھلایا تھا۔ اس بار شہوز نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

"سوچ لو زار۔۔۔ یہ ایک احمقانہ فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ جاب تو خیر تھی۔ لیکن لاہور میں تمہارے ہاسپٹل کا ایک نام ہے۔ اچھی ساکھ ہے' شہرت ہے۔۔۔ چلا چلایا سیٹ اپ ہے۔۔۔ آمدنی کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔۔۔ یہ سب کسی اور کے حوالے کر کے تم خود ایک دور دراز علاقے میں سروسز فراہم کرنے چلی جاؤ گی۔۔۔ تمہیں کیا ملے گا۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"سکون۔۔۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"سکون سے پیٹ نہیں بھرتا زارا۔۔۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ جذباتی ہو کر فیصلے کرنے والوں کی کامیابی کے چانسز صفر تو بھی ہوں تو صفر کے قریب ترین ضرور ہوتے ہیں۔۔۔ زندگی کوئی فلم نہیں ہوتی یہ حقیقت ہے اور اسے کھلی آنکھوں سے ہوش مندی سے جینا ہی کامیابی ہے۔"

"مجھے فلاح چاہیے شہو! اور فلاح کا مفہوم کچھ بھی ہو۔۔۔ اس کا مقصد کامیابی ہی ہے۔ سکون ہی ہے۔۔۔ انسان کو جس کام میں سکون ملے وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں اور میں بہت پُرجوش ہوں شہوز! پلیز تم میرا ساتھ دو۔ یہ میری زندگی کا وہ واحد فیصلہ ہے جو میں نے اپنی مرضی سے کسی کے دباؤ میں آئے بغیر کیا ہے۔" زارا اس کی بات کاٹ کر اسے اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "شہوز نے گہری سانس بھری۔ وہ بلاشبہ اس کے فیصلے سے ناخوش تھا۔

"اس مقصد کے لیے شہر سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یہیں اپنے ہسپتال میں یہ سب فلاحی کام کر سکتی تھیں" وہ کہہ رہا تھا۔ زارا نے جانچنے کی کوشش کی کہ آیا وہ ابھی طنز کر رہا ہے یا اس کا موقف جاننا چاہتا ہے۔

"ہسپتال میں آنٹی تحریم کے بھی شیئرز ہیں۔۔۔ باقی بہت لمبا چوڑا اسٹاف ہے۔۔۔ سب کی تنخواہیں دینی ہوتی ہیں۔۔۔ لیب بھی ہے۔۔۔ وہاں یہ فیزابیل نہ ہوگا۔ رائے ونڈ میں میرے کچھ اچھے دوست ہیں جو میری معاونت کریں گے اس لیے میں نے وہ علاقہ چنا ہے شہر سے دور ہے وہاں ایک اچھے میٹرنٹی اسپتال کی ضرورت بھی ہے۔ تم پریشان مت ہو۔۔۔ تم جب لندن سے واپس آؤ گے تو سب سیٹ کر چکی ہوں گی اور اتنے

اچھے طریقے سے اپنا پراجیکٹ چلا رہی ہوں گی کہ تم شاباش دیے بنا نہ رہ سکو گے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"رائے ونڈ میں تمہارے کون سے دوست ہیں۔ میں تو نہیں جانتا کسی کو۔" شہوز حیران ہوا۔

"تم نہیں جانتے، تم ابھی لندن جاؤ اپنا ٹرپ انجوائے کرو۔ جب واپس آؤ گے تو میں تمہیں ملواؤں گی۔" زارا نے گرم جوشی سے کہا تھا۔

"نہیں۔" وہ قطعیت بھرے لہجے میں بولا۔

"میں مزید حماقت افورڈ نہیں کر سکتا۔ تم ابھی مجھے بتاؤ کہ کن کے ساتھ کام کر رہی ہو تم تاکہ میں پتا کرواؤں کہ کیسے لوگ ہیں۔ ایک تو تم مجھے فلائٹ سے پہلے بتا رہی ہو اب میں کچھ کر بھی نہیں سکتا لیکن میں بہروز بھائی سے کہتا ہوں وہ اپنے آفس میں سے کسی کی ڈیوٹی لگائیں اور پتا کریں کہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر آنسہ زارا خدمت خلق کرنے جا رہی ہیں۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ دنیا کیسے کیسے گھاگ لوگوں سے بھری ہے۔ تم نے بہت غلط کیا۔ تمہیں یہ سب کرنے سے پہلے مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔" وہ واقعی کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ زارا کو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اس کی اتنی پروا کر رہا ہے۔

"تم پریشان مت ہو۔ اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔ اچھے برے کی تمیز آگئی ہے مجھے، مجھے چھوٹی بچی سمجھنا چھوڑ دو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرارت بکھری تھی۔

"اچھا تو کیا کروں۔ تمہاری پروا کرنا چھوڑ دوں۔ یہ میں نہیں کر سکتا اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ تنک کر بولا تھا۔ ایسی تنک مزاجی جس میں محبت کے سب رنگ تھے۔

زارا نے جھولے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم بس ناراض مت ہو۔ تم صرف مجھے گڈ لک وش کرو۔ میرا حوصلہ بڑھاؤ۔ ایسا تاثر مت دو کہ میں کچھ غلط کرنے جا رہی ہوں اور فرض کرو اگر خدا نخواستہ کچھ غلط ہو بھی گیا تو میری آخری غلطی سمجھ کر درگزر کر دینا۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھ کر بولی تھی، جہاں واضح طور پر ناپسندیدگی تھی۔ شہوز بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا پھر اس نے گہری سانس بھری۔ وہ اتنی مطمئن لگ رہی تھی۔ پھپھو انتقال کے بعد اب مصروف رہنے کے لیے زارا کچھ بھی کرتی اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ وہ کم از کم اس کیفیت سے باہر آ رہی تھی۔ یہ بات قابل اطمینان تھی۔

"گڈ لک۔ اللہ نہ کرے کہ تمہارے ساتھ کبھی کچھ بھی غلط ہو۔ ورنہ میرا کیا ہوگا۔ اتنی بے وقوف لڑکی دوبارہ ڈھونڈنا آسان نہیں ہوگا میرے لیے۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم اپنے فیصلے کرنے اور ان پر قائم رہنے جتنی خود مختار ہو گئی ہو۔ میں خوش ہوں تمہارے لیے۔" وہ چڑا بھی رہا تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔

"تو پھر اب تم میرے لیے، ڈائمنڈ بریسلٹ لے آؤ گے نا۔" وہ بھی مسکرائی تھی۔

"تم اگر تھوڑی سی بھی خوب صورت ہوتیں تو شاید لے ہی آتا۔ اب تو سوچنا پڑے گا۔" وہ پھر سابقہ پرانی ٹون اپنا کر بولا تھا۔

"مجھے خوب صورت ہونے کا ہنر بھی آگیا ہے۔ عاجزی شخصیت کا نکھار ہے۔ اور نکھار انسان کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ میں عاجزی اپنالوں تو بہت خوب صورت ہو جاؤں گی۔ تم بریسلیٹ لے آنا۔" اس کے لفظوں پر کسی اور کے لفظوں کا سایہ تھا۔ شہوز اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب تو خرچا کرنا ہی پڑے گا لیکن خدارا ضرورت سے زیادہ یہ والا نکھار نہ کر لینا۔ بات کہیں سو دو سو ڈائمنڈز کے بریسلٹ سے چار سو ڈائمنڈز والے نیکلس تک نہ پہنچ جائے۔" وہ ہنستے ہوئے اسے چڑا رہا تھا۔ زارا نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عہد الست ہر انسان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔"

نور محمد نے لکھا ہی نہیں تھا' یہ امر دل سے تسلیم بھی کر لیا تھا۔ یہ اس دن کی بات تھی 'جب نور محمد رات بھر سو نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود تمام تر مواد متعلقہ شخص کو بھیج دیا تھا۔ اصولاً" اس کے دل کا بوجھ ختم ہو جانا چاہیے تھا' اسے پرسکون ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں تھا۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہوا تھا۔

اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے اور اس کی ہمت بھی۔۔۔ جب سے زین العابدین نے اسے بتایا تھا کہ کچھ پاکستانی اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے لوٹن تک آپہنچے ہیں۔۔۔ اس کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ ہر چیز پہلے دن کی طرح یاد آنے لگی تھی۔ ہر وہ چیز جو اس نے بھولنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ سونے پر سہاگہ وہ خواب تھا جو اسے نہ صرف نیند سے جگا دیتا تھا بلکہ حد سے زیادہ مضطرب بھی کر دیتا تھا۔ اس کا دل بہت بے چین تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک آنسو اس کی پلکوں سے گال پر اتر آیا تھا۔ ایک اکیلا تنہا آنسو۔۔۔ جب انسان تنہائی نہیں سہہ سکتا تو آنسو کی کیا اوقات۔۔۔ تنہائی یہ جتا دیتی ہے کہ یکتائی سکھ نہیں ہے۔۔۔ یہ صرف رب سہہ سکتا تھا۔

سو ایک کے بعد ایک نم موتی گالوں کو تر کرنے لگا۔ یہ شاید اس کی زندگی میں بہت سالوں بعد ہوا تھا کہ وہ ایسے رویا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ میز پر پڑا تھا۔ اس کا کام باقی تھا' حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔

2006ء سے 2012ء۔۔۔ وقت اس کے لیے کچھوے کی رفتار سے چلتا رہا تھا۔ اس نے ایک نقاب پہن رکھا تھا اور وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو اسے جانتے تھے۔۔۔ جو یہاں اسے واقعی جانتے تھے وہ بھی یہ دعوا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اسے جانتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی غلطی نہیں تھی کہ وہ اسے پہچانتے نہیں تھے۔۔۔ یہ اس کی اپنی مہارت تھی کہ اس نے خود کو ان میں اتنا رچا بسا لیا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان میں سے ہے۔ وہ بہت بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا ضروری سامان رات ہی ایک بیگ میں منتقل کر لیا تھا۔ ضروری کاغذات بھی رکھ لیے تھے۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس کے روم میٹس چلے جائیں تو وہ بھی گھر سے نکلے۔ باتھ روم وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ اپنے لیے کافی بنا کر واپس کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ زین العابدین آ گیا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" زین العابدین نے نجانے کس چیز کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ کہیں جا رہا ہے۔ نور محمد چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سمجھ نہ سکا ہو۔

"آپ کا بیگ پڑا تھا نا۔۔۔ میں سمجھا شاید کہیں جا رہے ہیں۔" وہ اطمینان سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ نور محمد نے ناپسندیدگی سے اس کے انداز کو دیکھا۔ اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنی الماری میں منہ گھسا کر کچھ دوسری ضروری چیزیں ایک چھوٹے بیگ میں منتقل کرنے لگا تھا' اس نے زین العابدین کی جانب پشت کر لی تھی۔ اس کی الماری کا ایک پٹ پورا کھلا تھا۔ اس نے اسے بھی بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے اپنی چیزیں بھی سمیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ زین العابدین کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔ وہ اچھا انسان تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ نور محمد اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتا۔ وہ اپنے بارے میں کسی سے بہت شیئر نہیں کرتا تھا۔

"تم اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں کچھ مصروف ہوں۔"

اس نے رکھائی سے کہا تھا۔ زین العابدین کو اس کے انداز سے حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ سب اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ تھے اور اس کے عادی ہو چکے تھے۔

"مجھے دراصل کچھ رقم چاہیے تھی۔۔۔ آپ جانتے ہیں میری ایک شفٹ ختم ہو گئی ہے۔۔۔ مجھے کچھ پیسے بھجوانے ہیں۔۔۔ میں آپ کو اگلے مہینے لوٹا دوں گا۔"

وہ سادہ سے انداز میں مدعا بیان کر رہا تھا' وہ پہلے بھی نور محمد سے پیسے لیتا رہتا تھا۔

"وہ وہاں میز پر والٹ رکھا ہے۔۔۔ لے لو۔" نور محمد نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

وہ چاہتا تھا' وہ وہاں سے جلد از جلد چلا جائے۔ زین العابدین اس کی اسٹڈی ٹیبل کی جانب بڑھا تھا۔ وہ والٹ اٹھانا چاہتا تھا لیکن لیپ ٹاپ کھلا دیکھ کر اس نے اسے بلاوجہ بند کرنا چاہا۔ وہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن تھا لیکن اس کی لڈ بند نہیں تھی۔ زین العابدین اکثر اس کمرے کی صفائی ستھرائی کر دیا کرتا تھا۔ نور محمد اسے لیپ ٹاپ کے اوپر گرد پڑ جانے کے خدشے کی وجہ سے اکثر کہہ دیا کرتا تھا کہ اسے کھلا دیکھو تو بند کر دیا کرو۔ اسی لیے اس نے اسے بند کرنا چاہا تھا۔ تب ہی نور محمد پلٹا۔ اس نے زین العابدین کی جانب خفگی بھری نظر ڈالی۔ اس نے گڑبڑا کر فوراً" لیپ ٹاپ سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔

"آپ چلے کیوں نہیں جاتے یہاں سے" وہ غرایا تھا۔ زین العابدین حیران رہ گیا۔ اس نے پہلے کبھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے پیسے لیے بنا کمرے سے نکل گیا تھا۔ نور محمد مردم بے زار تھا لیکن بد تمیز نہیں تھا۔ نور محمد کو بھی کچھ دیر بعد اپنے رویے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے والٹ سے کچھ رقم نکالی تھی اور اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر ہال میں آگیا تھا۔ زین العابدین صوفے پر بیٹھ کر موزے پہن رہا تھا۔ نور محمد نے اس کے قریب بیٹھ کر پانچ سو پاؤنڈز اس کی گود میں رکھ دیے تھے۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سر میں درد ہو رہا ہے اس لیے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا۔ زین العابدین مافی الضمیر خود ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے رویے کی تلافی کر رہا ہے۔

"آپ کیوں پریشان ہیں۔" اس نے رقم اٹھائے بنا سوال کیا تھا۔ نور محمد نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا۔

"نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ میں پریشان نہیں ہوں۔"

"برادر۔۔۔ میں بہت عرصے سے آپ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔۔۔ میں نے جب سے آپ کو ان پاکستانیوں کے بارے میں بتایا ہے جو آپ کے متعلق پوچھتے ہوئے آئے تھے آپ تب سے پریشان ہیں۔"

وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نور محمد پہلے سے زیادہ حیران ہوا لیکن وہ اب پہلے کی طرح فوراً" تردید نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتے نا۔" وہ سوال کر رہا تھا۔ نور محمد منہ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ اب کچھ نہیں بول پا رہا تھا۔

"آپ نہیں ملنا چاہتے' ان سے تو مت ملیے۔۔۔ میں بھی پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اپنے انداز میں تسلی دے رہا تھا۔ نور محمد کو یکدم ایک خیال آیا۔

"آپ ایک کام کرو گے' میرا زین العابدین۔" اس نے زین العابدین کی جانب رخ موڑا۔

"مر کر بھی کروں گا برادر۔۔۔ آپ کی عزت ہی نہیں کرتا۔۔۔ آپ سے محبت بھی کرتا ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

"مجھے پتا ہے جو لوگ کل میرے بارے میں پوچھنے آئے تھے' وہ دوبارہ بھی آئیں گے۔ آپ ان سے مل کر انہیں اتنا بتا دیں کہ نور محمد مر چکا ہے۔"

وہ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ زین العابدین کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جھوٹ نور محمد بھی نہیں بولتا۔ پانچ سو پاؤنڈز اس کی گود میں پڑے تھے۔



"میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔" آنٹی رافعہ نے مسکراتے ہوئے اسے کہا تھا۔ اس نے نا سمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھا' جانے وہ کس معاملے کی بات کر رہی تھیں۔ ممی نے کلینک کے لیے جگہ دیکھ لی تھی اور اسے معاملات طے کرنے کے لیے بلایا تھا۔ وہ بھی

دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ یہ تین کمروں والا ایک گھر تھا۔ جس کی صفائی ستھرائی اور کچھ ضروری مرمتیں وغیرہ بھی شروع کروا دی گئی تھیں۔ زارا کو جگہ پسند آئی تھی۔ وہ کچھ فرنیچر جو اس کے لاہور والے اسپتال میں بیکار پڑا تھا' وہ بھی لے آئی تھی۔ اس کے علاوہ دوائیاں تھیں۔ پین کلرز تھے ملٹی وٹامنز' آئرن کی ٹیبلٹس اور سیرپ سرنجیں' دستانے وغیرہ تھے جو اس کے پاس اسٹاک میں موجود تھے۔ یہ سب چیزیں اس نے آنٹی رافعہ کے اسکول کے ایک کمرے میں ہی رکھوا دی تھیں۔ سب کام اس کے حساب سے اتنے اچھے طریقے سے ہونے لگے تھے کہ وہ ایک نیا جوش اور ولولہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت مطمئن انداز میں ان در و دیوار کو دیکھ کر سراہ رہی تھی۔ آنٹی رافعہ اس کے چہرے پر خوشی کی رمق دیکھ کر خود بھی مسکرا رہی تھیں۔

"میں بھی بہت خوش ہوں آنٹی ۔۔۔ خوش اور مطمئن۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"یا اللہ ۔۔۔ بے شک آپ بے حد کریم ہیں ۔۔۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں میرے کان یہ جملہ بھی سنیں گے۔"

یہ ٹیپو کی آواز تھی۔ زارا کو اب اس کی باتیں بالکل بری نہیں لگتی تھیں۔ وہ ہنسی تھی۔ وہ ایک سیڑھی اٹھا کر اندر لاتے ہوئے اسے چڑا رہا تھا جو اس نے دیوار کے سہارے کھڑی کردی تھی۔

"دھیے ۔۔۔ اگر خوش ہے تو اس سے بڑی بات کوئی نہیں ہو سکتی ۔۔۔ ہم سب خوش ہیں۔ تو نے جو کام شروع کیا ہے نا' یہ بڑا ہی چنگا ہے' بڑی نیکی کا کام ہے۔ انسانیت واسطے کی جانے والی ہر نیکی کا ثواب روز قیامت پوری عمر بھر کے سوہنے رب نے دینا ہے۔"

ٹیپو کے پیچھے ہی ایک ضعیف خاتون اندر داخل ہوئی تھیں اور آتے ہی اس کا ماتھا چوم کر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی تھیں۔ یہ ایسی گرم جوشی کا مظاہرہ تھا جو زارا نے اپنے ماحول میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اتنی محبت پا کر جھینپ سی گئی تھی۔ ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا اور چرچے پھیلنے لگے تھے۔

"یہ اماں اصغری ہیں ۔۔۔ یہ حقیقی معنوں میں وہ خاتون ہیں جو ذہانت و فطانت میں بالکل آپ کے جوڑ کی ہیں زارا بی بی!" ٹیپو پھر اندر آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیوب لائٹس اور دوسری متعلقہ چیزیں تھیں جو وہ شاید وہاں لگانے کی نیت سے لایا تھا۔ زارا نے ممنون نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں ماں بیٹا ہر کام میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ زارا دل ہی دل میں ان کی بے حد شکر گزار تھی۔

"ویکھ! اس منڈے دیاں گلاں میری سمجھو باہر نیں ۔۔۔ میں تے بس اتنا جانتی ہوں کہ انسانیت واسطے رب جس کے دل بیں چاہے محبت ڈال دے ۔۔۔ یہ اوپر والے کے کام ہیں۔ حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کھوہ (کنویں) میں ڈال دیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا ان کی آہ سننے والا تو رب نے ہدہد کے دل میں احساس جگایا ۔۔۔ وہ نمانا پرندہ سب دیکھ رہا تھا۔ کوئی مدد تو نہیں کر سکتا تھا' سو وہ دن گیا اور آج ایک دن یہ پرندہ "یوسف کھوہ۔ یوسف کھوہ" کی آوازیں نکالتا رہتا ہے۔"

وہ زارا کا ہاتھ تھامے اسے کچھ بتا رہی تھیں۔ زارا کو آدھی باتیں سمجھ میں آئیں اور آدھی کو سمجھنے کے لیے وہ آنٹی رافعہ کی شکل دیکھنے لگیں۔ انہوں نے اماں اصغری کے آگے ایک کرسی رکھی اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس کی جانب مڑ کر بولیں۔

"یہ تمہیں سراہ رہی ہیں۔ تم ایک اچھا کام کر رہی ہو اور اللہ نے تمہارے دل میں انسانیت کا درد جگایا ہے۔ وہ تمہیں سمجھا رہی ہیں کہ اللہ نے حضرت یوسف کی مدد کے لیے ہدہد جیسے پرندے کو چنا تھا۔ اس نے ان کے بھائیوں کو انہیں کنویں میں پھینکتے دیکھا تھا اور تب سے وہ "یوسف کھوہ۔ یوسف کھوہ" کی آوازیں نکالتا ہے۔ وہ تمہارا موازنہ کرنا چاہ رہی ہیں اس پرندے کے ساتھ۔" انہوں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"سبحان اللہ ۔۔۔ اس سارے واقعے سے زارا بی بی ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی اتنی پرانی

زبان ہے مصر کے وہ بازار جہاں صرف عبرانی بولی اور سمجھی جاتی تھی وہاں پر پرندوں کو پنجابی پر پورا عبور حاصل تھا۔ ماشاءاللہ ماشاءاللہ ٹیپو۔" ایک بار پھر کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پیچ کس اور پلاس وغیرہ پکڑے ہوئے تھے۔

"ٹیپو! کسی کو تو بخش دیا کرو۔" آنٹی رافعہ نے ہنستے ہوئے ٹوکا تھا۔

"توبہ توبہ امی۔۔۔ بخشش عطا کرنا صرف اللہ رب العزت کی صفت ہے۔ آپ ذرا ملاحظہ کیجیے کہ کیا میں نے غلط کہا تھا کہ اماں اصغری اور ڈاکٹر صاحب ذہانت میں ایک دوسرے کے جوڑ کی ہیں۔" وہ اوزار میز پر رکھ کر سیڑھی پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہے منڈا۔" اماں نے آنٹی رافعہ کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ انہیں ہنستے ہوئے وضاحت دینے لگیں۔

"ڈاکٹر صاحب آپ ذرا یہاں تشریف لائیں اور میری معاونت کریں۔۔۔"

وہ اپنی جیب سے موبائل اور والٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھا تھا۔ زارا سیڑھی کے قریب آگئی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی پٹی فٹنگ تبدیل کرنی تھی۔ اسے وقتاً" فوقتاً" اوزاروں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ زارا اسے مہارت سے کام کرتا دیکھنے لگی تھی۔ وہ پیچ کس سے پرانی والی پٹی کے پیچ کھول رہا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیپ بجی تھی جو وہ میز پر رکھا تھا۔ بیپ بجنے پر زارا نے غور کیا تھا۔ اس کے پاس جدید طرز کا اسمارٹ فون تھا۔

"اوہو۔۔۔ لوگ نیکی کا کام بھی اطمینان سے نہیں کرنے دیتے۔۔۔ ذرا دیکھیں تو کون ٹیپو صاحب کو فون کر رہا ہے۔" اس نے زارا سے فون اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ زارا نے جھجکتے۔۔۔ ہوئے فون اٹھا کر اسے تھمانا چاہا۔

"کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کر دو۔" اس نے وہیں اوپر سے حکم جاری کیا تھا۔ زارا نے ایسا ہی کیا تھا اور فون دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔

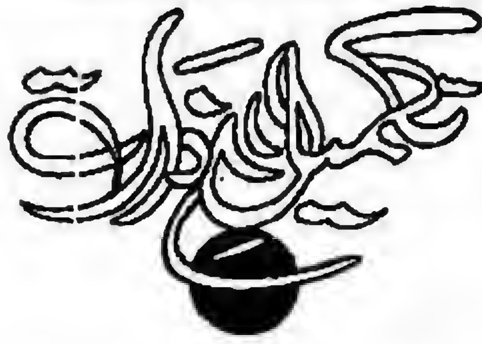
"ہیلو کیا میں سلمان حیدر سے بات کر سکتا ہوں۔" کسی نے انگلش سے، پوچھا تھا۔

"جی۔۔۔ کیا میں جان سکتا ہوں۔۔۔ آپ کون ہیں۔" ٹیپو نے کچھ حیرانی سے اپنا منہ نیچے کی جانب کر کے سوال کیا تھا۔ وہ بھی روانی سے پوچھ رہا تھا۔ زارا کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔ اس کی وجہ ٹیپو نہیں تھا بلکہ دوسری جانب سے آنے والی آواز تھی۔

"میں نور محمد ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راقمہ سمیرا ایاز



"کوئی کسی کا بھی ساری زندگی انتظار نہیں کر سکتا' ناممکنات میں سے ہے یہ بات۔" گرم گرم بھاپ اڑاتا کافی کا مگ لبوں سے لگائے وہ عام سا شخص ہمیشہ ہی شان دار قسم کی بات کرتا تھا' لیکن آج اس وقت کا کہا یہ جملہ قطعی رنگ دار نہ تھا۔ اسی کی طرح بے حد عام سا جملہ لگا تھا اسے۔

"کیوں تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو' ہونے کو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ پھر۔ کوئی کسی کا انتظار اپنی تمام عمر کیوں نہیں کر سکتا؟"

کافی کیفے کے بے حد خوب صورت ماحول میں وہ سادہ سی لڑکی بہت متاثر کن لگ رہی تھی۔ جس کی بے حد کالی سیاہ گھور آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ جن آنکھوں کے سحر نے اس کے دل سے روح تک کا سفر کر کے اسے اپنی وجود میں محصور کر لیا تھا۔

ناولٹ

گہری سی اک سانس لیتے اس نے جیسے اس کی سحر انگیز آنکھوں سے خود کو بچاتے مگ ٹیبل پر رکھا۔

"کیوں کہ زمانے کی رفتار بہت تیز ہے۔ آگے بڑھنے کی لگن کبھی بھی انسان کو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنے دیتی' کیونکہ اس کے لیے بھی اسے اک پل کو ہی سہی رکنا پڑے گا' پھر جیسا ماحول ہو تا ویسے ہی انسان اس سے ڈھلتا جاتا ہے۔ ایسے میں کسی کے لیے رک کر پل بھر کو ہی سہی انتظار کرنا کسی کے لیے بہت ہی ناممکن سی بات ہے۔ جس میں غلط تو کچھ بھی نہیں۔"

اس نے خاموشی سے نگاہیں جھکائے اسے بغور سنا تھا۔

لیکن وہ متفق نہیں ہوئی تھی ہاں مگر خاموش ضرور ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ سنجیدگی ہوا ہو گئی۔

"ہوتے ہیں نا کچھ لوگ' ایسے جو فقط مسکراتے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں۔ اور وہ جن کی آنکھیں بھی ساتھ ہی مسکرا اٹھتی ہوں وہ تو اور بھی زیادہ دل کے قریب ہوتے ہیں۔"

"تمہیں تو نہیں کہا' میں نے کچھ پھر یہ ناراضی کیوں۔"



"تم جانتے ہونا مجھے زمانے کی تیز رفتار بڑھتی ترقی یہ ماڈرن لکس' نت نئی فیس نیٹ کرتی سائنسی ایجادات موبائل فونز' آئی فونز یہ اینڈرائیڈ سیٹس وغیرہ کتنا پسند ہیں' جیتی ہوں میں ان کے ساتھ اور ان کے بغیر بالکل ادھورا سا محسوس کرتی ہوں خود کو اس لیے تم نے یہ بات کی ہے۔" وہ بے اختیار ہنسا۔

"کیا ہو گیا ہے یار! کہاں کی بات کو کہاں گھما گئی ہو۔ اس پریکٹیکل قسم کی گفتگو میں خود کو کہاں گھسیٹ لیا۔" یہ اچھا خاصا کھلونا ہو رہا تھا۔

ریلیکس ہو کر قدرے پیچھے ہو کر بیٹھتی وہ اپنے دائیں طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے ریسٹورنٹ کا مین گیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔

"اگر تمہاری اس پریکٹیکل گفتگو میں جاؤں تو کسی حد تک تم صحیح سمجھتے ہو کہ انتظار کرنا وہ بھی اس قدر لمبے عرصے تک شاید ہی کسی کے بس کی بات ہو۔" قدرے توقف سے اس نے کہنا شروع کیا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر ٹکاتے پوری توجہ سے اسے سننے لگا۔

"لیکن۔ کچھ باتیں' زمانے کی تیز رفتاری سے بھیڑ بھاڑ سے' آگے بڑھ جانے کی لگن سے' یا پیچھے رہ جانے کے خوف سے' کہیں ہٹ کر ہوتی ہیں اور ان باتوں کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے ہوتا ہے ناکہ مادی و جان دار چیزوں سے۔ وہ روح کے تعلق سے منسلک ہوتی ہیں۔ دل سے رابطہ رکھتی ہیں۔" دھیمے دھیمے بولتی وہ اسے سحر زدہ کر گئی۔

"اور دل و روح سے جڑا ہر احساس' ہر تعلق اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک دل دھڑکتا ہے اور روح جسم کا ساتھ دیتی ہے۔" اس نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا' وہ یوں ہی اپنی آنکھیں اس پر ٹکائے ہوئے تھا۔

اس کا اتنا انہماک اس کا دل دھڑکا گیا اور نظروں کو جھکا گیا۔

"پھر کسی کا منتظر ہونا چاہے' بے حد پر درد پر اذیت سہی' مگر وہ اس سولی پر بخوشی لٹکتا ہے۔ تب تک جب تک دل و روح کا ساتھ رہتا ہے۔"

وہ چپ ہوئی تو جیسے طلسم ٹوٹا۔

اور وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ اس کا لہجہ و انداز کچھ باور کراتے لگتے تھے اسے۔

بہت خاموش ہوتے اک سرسری سی نظر اس پر ڈالی جو ٹیبل پر رکھے اپنے پرس کو بار بار کھول اور بند کر رہی تھی۔ یہ اضطراب کا اظہار ان باتوں پر تھا جو وہ کہہ گئی تھی۔ دانستہ یا نادانستہ۔

وہ جان نہ پایا' بس لب بھینچتا واپس اس ماحول میں آیا تھا۔

"کافی ٹائم نہیں ہو گیا' کیا خیال ہے چلیں پھر۔"

اس نے بھی نگاہ نہ اٹھائی یوں ہی جھکے سر کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

والٹ سے پیسے نکال کر پے منٹ کرکے وہ بھی ساتھ ہی باہر آیا تھا۔ اس سے' جو بالکل خاموش و چپ چاپ سیدھی سامنے دیکھتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

پلیح و پرکشش سے چہرے پر نہ افسردگی تھی' نہ پژمردگی' مگر اک سکوت تھا ایسا جس میں کوئی تاروں سی چمک نہ تھی۔ یعنی مکمل گہرا سکوت۔

اور اپنے چہرے پر ان دو آنکھوں کی تپش محسوس کرتی وہ اندر ہی اندر کہیں راکھ ہونے لگی کہ یہ وہ شخص تھا جو مکمل طور پر اس کے دل و وجود پر تمام جذبات و احساسات پر قابض تھا' مگر پھر بھی انجان بنتا تھا۔ جان کر بھی۔

نہ جانے کیوں۔



اسے گھر چھوڑ کر وہ اپنے ہی راستوں پر تھا' اتنا ہی انجان جتنا وہ خود اس لڑکی کے لیے بنتا تھا۔

اتنا ہی اجنبی جتنا وہ خود کو اس لڑکی پر ظاہر کرتا تھا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا' لیکن وہ خود کے مقابل آ کر ٹھہر گیا تھا۔

خود کے مقابل یعنی اپنے دل کے مقابل۔

اک گہری سانس لیتے اس نے بے ساختہ ہی کا رخ

سڑک پر روک دی۔ صد شکر کہ ٹریفک اس راستے پر بہت ہی کم تھا' ورنہ کوئی آفت اس پر آپڑتی' لیکن وہ بھی کیا کرتا' یہ اس کی ذہنی نہیں دلی حالت تھی۔

کیونکہ جب انسان دل کے ساتھ ہینڈل کرنے لگ جاتا ہے تو پھر ذہنی حالت اور اس کا کام و عمل کہیں بہت ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔

بات بہت زیادہ گہری نہ تھی۔

وہ کل ہی اس لڑکی کو تب سے جانتا تھا' جب اس نے اسے ہادی اینڈ سنز کی شاندار عمارت کے پارکنگ لاٹ میں دیکھا تھا۔

اسے آج بھی یاد تھا۔

دھوپ بے حد تیز تھی اور اس کا رنگ اس قدر تپش میں پگھلا ہوا سونا لگ رہا تھا اور اسی دم اس کی گھور سیاہ آنکھیں اس کی طرف اٹھی تھیں اور بس۔

وہ نہ جانے کیوں بس پل بھر ٹھہرا۔

اور اس کا یہی ٹھہرنا اس کے دل کو ٹھہرانے کا سبب ہوا۔

ایک پل میں ہی کہاں سے کہاں تک اس کا دل چلا گیا۔

وہ تو ششدر سا رہ گیا۔

بائیک کے ہارن نے اسے ایک پل سے باہر نکالا۔

نیند سے جاگنے کے سے انداز میں اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ لیکن اس سے پہلے ہی بائیک والا سامنے آیا۔

"کیا یار۔ اس طرح بیچ سڑک پر گاڑی روک رکھی ہے۔ یہ تو میں تھا جو ہارن دے کر اپنی اور کسی قدر تمہاری بھی جان بچا گیا۔ ہوتا کوئی ٹرک والا تو جہاز بن کر خود سمیت تمہیں بھی اڑا دیتا۔ پیار کرو' لیکن محبت میں بھی آنکھیں کھلی رکھو۔ یوں کھو جانا ٹھیک نہیں میرے بھائی۔"

کیا بے تکلفانہ مشورہ تھا نصیحت تھی۔

مسکرا کر ہاتھ ہلاتے اسے بیچ راہ بڑھتا وہ شخص یہ جا وہ جا اور وہ حیرت سے مسکراتے خود بھی آگے بڑھ گیا۔

محبت کیا واقعی خوشبو ہے' جو سب پہچان جاتے ہیں'

انجان بھی۔

خوش دلی سے سوچتے اس کے لب بے ساختہ سکڑنے لگے۔ سیاہ گھور آنکھوں کی مانند پڑتی چمک یاد کر کے دل نے بے حد خفگی سے اپنا رخ اس سے پھیرا تھا۔

اور جب دل ہی انسان کا خفا ہو جائے تو ہنستا موسم بھی آگ برساتا لگتا ہے' اور اسے بھی چاروں طرف پھیلتی سیاہ ملبوس کی رات لگنے لگی۔

"کچھ باتیں چاہ کر بھی انسان خود سے چھپاتا ہے۔ جیسے میرے دل کا راز... میں خود پر بھی عیاں نہیں کرنا چاہتا تو تم سے کیسے کہوں۔"

بے بس سی اس سوچ نے اسے پھر انجان راستوں کا مسافر بنا دیا۔



کمرے کے وسط میں وہ یوں کھڑی تھی جیسے زندگی ہار آئی ہو اور ایسا وہ ہمیشہ تب ہی محسوس کرتی تھی جب جب اس شخص سے ملتی تھی۔

آج کی واپسی بھی خالی ہاتھ تھی۔

پرس بے جان انداز میں رکھتی وہ خود بھی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھولیں اور پھر دعا کے انداز میں جوڑ لیں۔

کوئی تارہ نہیں کوئی جگنو نہیں۔

آس و امید کا اک پل بھی نہیں۔

وہ شکستہ پا تھی۔ لیکن آبلہ پا نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اسے آج بھی وہ دن یاد تھا۔

ہادی اینڈ سنز کی شاندار عمارت کی سیڑھیوں پر وہ شخص اس کے ساتھ ساتھ تھا' لیکن وہ بالکل انجان بہت تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی اس شخص سے تین' چار سیڑھیاں اوپر چڑھ گئی تھی۔

اور یہ اس کی عجلت کا نتیجہ کہ سیڑھی پر غلط انداز سے رکھا پاؤں مڑا اور وہ پھسلتی نیچے کی طرف گرتی گئی' شکر کہ چوٹ زیادہ نہیں لگی' لیکن اٹھنے کی کوشش میں جسم ہل کر رہ گیا۔

اور تب ہی وہ شخص اس کے اس طرح گرنے پر گھبرا کر اس کی طرف بڑھا لیکن اس کے سہارے سے پہلے ہی وہ سنبھل کر سیڑھی پر ہی بیٹھ گئی لیکن اسے اٹھتے پھر دوبارہ بیٹھتے دیکھ کر اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھا لیا۔

اس نے اپنا سر اٹھا کر پہلی بار اس انجان شخص کو دیکھا۔

"اعتبار کریں میرا۔ اس بلڈنگ میں اک آفس ہے میرا اور میرا نام عمر ہادی ہے۔" اس تعارف پر اس کی آنکھیں بے تحاشا کھلیں۔

"نہیں سر! میں ٹھیک ہوں۔" وہ تھوڑا بوکھلائی تھی اور بے اختیار اٹھنا چاہا تھا کہ آفس میں پہلا دن اور ایسا امپریشن۔ وہ بھی گرا ہوا۔

"سر۔!" تعجب سے عمر ہادی نے اسے دیکھا۔

"میرے سر نیم نے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا مس۔ میں فقط عمر ہادی ہوں۔ یہاں کا اونر نہیں میرا شمار مینجمنٹ آفیسرز میں کیا جاتا ہے۔" ہلکے سے مسکراتے اس کی غلط فہمی کو دور کرتے اس کا گہرا سانولا چہرہ مسکرا اٹھا تھا۔

اور اسے ایک بار پھر خفت ہوئی۔

کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی وہ لیکن اس شخص کی سچائی نے اسے متاثر کیا۔

"سوری میرا پہلا دن ہے شاید۔ اسی وجہ سے۔ بلکہ یقیناً سب گڑبڑ ہو گیا۔" دھیمے لہجے میں بولتی وہ اٹھنے لگی تو ایک بار پھر مضبوط مردانہ ہتھیلی چہرے کے سامنے آئی۔

"پلیز اوکے۔" اور اس بار اس نے اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا اور اپنا گلابی ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا وجہ فقط اس کی سچائی۔

ورنہ وہ چاہتا تو اسے بے وقوف بھی بنا سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا کرنے سے گریز کیا اور سچائی کا یہ لمحہ بہت متاثر کن تھا کہ۔

اس نے کہا "اعتبار کریں" اور وہ اعتبار کر گئی۔ اور جب کسی نے آفس میں اس سے کہا۔

"عمر ہادی نے تمہاری مدد کی ہے تو تم اس قابل ہو ورنہ وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے اور دوست بناتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی کی مدد کرنے کے بعد اس کو اپنی لائف میں بلاک کر دیتا ہے۔ کل تم خوش نصیب ہو جو اس کی فرینڈز کیٹگری میں آئی ہو۔"

اس کی خوبیاں عمر ہادی کے تعارف کی محتاج نہیں تھیں وہ جانتی تھی لیکن بحوالہ عمر ہادی سننا بھی اسے خوشگوار ہی لگا تھا۔

وہ کوئی ہینڈسم چارمنگ پرسنالٹی والا شخص نہیں تھا اور اسے کوئی کریز بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ جس کے دل کی روشنی اس کے چہرے پر پھیلتی تھی۔

جب وہ بولتا تو حیران کرتا۔

مسحور کرتا۔ دلوں پر غالب آتا لہجہ تھا اس کا وہ بھی مغلوب ہونے لگی۔ تو کیا غلط تھا۔

لیکن لڑکی ہونے کا خیال اسے سات پردوں میں چھپا لیتا لیکن آنکھیں بیان کر جاتیں۔

اور وہ بندہ عجب۔ جس کی آنکھیں بھی شفاف لگتی ہر جذبے سے خالی۔ جو اسے ہمیشہ خالی ہاتھ ہی لوٹا دیتی تھیں۔

وہ ہتھیلیاں زمین پر ٹکاتی اٹھی تو آئینہ میں اسے خود کی شبیہہ نظر آئی۔ اور آئینہ بھی جیسے اس کی شبیہہ پا کر اتنا خوش و مسرور ہوا کہ چمکنے لگا۔

سفید لباس میں وہ سادہ لڑکی اپنے پورے حسن سمیت نمایاں تھی لیکن اس کی ذات پر کسی کی نظر اندازی کے دکھ نکھر صاف نظر آتی تھی۔

لیکن جگہ تو دلوں میں خود ہی بنتی ہے خبر دینے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور کسی کے دل پر قابض ہو جانے پر مکین بننے پر اطلاع دینا ضروری ہو جاتا ہے اس سے ہی وجود پر بکھری دھند صاف ہوتی اور اپنی ذات معتبر لگتی ہے۔

مگر عمر ہادی نے اسے اپنے ہی وجود سے مغروری کے احساس سے دور کر رکھا تھا۔ اور یہی اس کی شکست تھی۔ اور یہیں دل کو اپنی ذات کی ہار لگتی تھی۔ مگر

بندھے ہاتھ بے بس ہوتے ہیں اور وہ بھی بے بس تھی۔



"ہاں میں ٹھیک ہوں اور بس پہنچتا ہی ہوں۔ میٹنگ سے پہلے میں آفس میں ہوں گا اور وہ بھی ہنڈرڈ پرسینٹ اوکے پلائے۔"

کان سے لگائے سیل فون کو جلدی جلدی آف کرتے اس نے ٹیبلٹ کی اسکرین پر چند فولڈر کو کھولا اور اپنے پیپر ورک پر پورا اطمینان کرتا باہر کی طرف بڑھا۔

"ناشتا نہیں کرو گے۔" باہر نکلتے اسے روکا گیا۔

"نہیں 'آج دیر ہو گئی ہے۔" مختصر جواب سے بھابھی کو نوازتا وہ آگے بڑھا تو انہیں بے حد مغرور لگا۔

اور حسب عادت تپ چڑھی انہیں۔

"کوئی ایسا ہیرو بھی نہیں ہے تمہارا بھائی 'لیکن انداز خاصے ہیرو والے ہیں۔" صبا بھابھی نے اس کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا تھا جو لاؤنج میں بے حد سکون سے صوفے پر بیٹھے ٹی وی انجوائے کر رہے تھے۔

تھوڑے سے چونکے پھر واپس رخ پھیر لیا۔ انداز وہی تھا کیونکہ انداز گفتگو جو پرانا تھا۔

"ویسے آپ کا بھائی تو وہ لگتا ہی نہیں ہے 'کہاں آپ اتنے ہینڈسم 'اتنی صاف رنگت اور یہ عمر ہادی آپ کا بالکل ہی الٹ اتنا سانولا۔ اور عام سا۔" الٹے قدموں واپس آتے عمر ہادی نے بے حد خوب صورت اپنی صبا بھابھی کا لفظ لفظ سنا اور جواباً بھائی کی خاموشی پر انہی قدموں پلٹتے قدم من من بھر کے ہو گئے۔

وہی جملے۔ وہی انداز۔ جو اس کی شخصیت کو لے کر سب ہی جانے انجانے کہہ جاتے تھے۔

اپنی بے حد خوب صورت فیملی کا قبول صورت شخص 'اس کی ساری ذہانت اور قابل ذکر شخصیت کو اس کے رنگ سے ناپ کر زیرو کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل بنا ہوا تھا۔ اور اس کی ذات کی کمزوری۔ جسے وہ احساس کمتری بنانے سے ہمیشہ روکتا آیا تھا اور کامیاب بھی رہتا تھا۔ کیونکہ وہ مضبوط اعصاب کا شخص تھا لیکن اپنوں کے جملے 'نظراندازی کے مظاہرے خون جما دینے والے تھے۔

لیکن نیا تو کچھ نہیں تھا سب وہی پرانا۔

اور وہ وہی۔ عمر ہادی۔

جو گریز کی راہ اپناتا تھا۔

لیکن آج اس کے قدم برسوں کی سل ثابت ہونے لگے تھے 'جو گریز کی راہ کے مسافر بننے سے انکاری تھے وجہ وہ آخری جملہ جو صبا بھابھی کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں تو سوچتی ہوں ذاکر 'اگر اس کی بیوی حسین و جمیل نہ سہی کیا اس سے بڑھ کر آگئی تو یہ شخص تو خاک نظر آئے گا 'اس لڑکی کی زندگی طعنے سنتے گزرے گی عمر کی وجہ سے 'میں تو کہتی ہوں نارمل لک کی لڑکی ہی آئے تو بہتر ہے ویسے بھی کون سا آپ کی مما یا ڈیڈ زندہ ہیں۔

اور اب یہ کام بھی لگتا ہے 'بڑی بھابھی ہونے کے سبب میں نے ہی کرنا ہے ---- آپ کی مما ہوتیں تو انہیں بھی حور پری کی خواہش ہوتی لیکن پھر یہاں وہی محاورہ آجاتا کہ 'پہلوئے حور میں لنگور' اپنی بات کی خوشی بھی ہنس کر خود ہی منالی گئی۔

"لیکن میں کسی بھی خوب صورت لڑکی پر عمر ہادی کا عذاب نہیں ڈالوں گی۔ کیونکہ میرا دل خاصا نرم ہے۔" شوخی برقرار تھی لہجے میں اور ذاکر بس یہ کہہ کر بات ختم کر گئے۔

"بس کرو اور اب جا کر ناشتا لگواؤ بھوک لگی ہے اور میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" ذاکر ہادی بری الذمہ تھے جیسے ہر چیز سے 'ہر رشتے سے بھی۔

لیکن عمر ہادی ان ہی رشتوں کے باعث آزار میں تھا اور یہ آخری جملہ تو آگ تھا جیسے لپٹتا 'لپکتا۔ خاک و راکھ کرتا۔ سکون و راحت ملتی ہے ناں کچھ لوگوں کو' اپنی ذات کا وقار بلند کرنے میں 'چاہے اس کے لیے دوسروں کی ذات کو ان پستی میں گرا کر حقیر و کمتر کیوں نہ کر دیا جائے۔

اس نے ایک سلگتی نگاہ اس خوب صورت چہرے پر

ڈالی اور اپنی ذات وجود کو آگ بناتے اس جنگل سے نکلتا چلا گیا۔

آفس میں پہلا سامنا ہی تحمل وقار سے ہوا تھا۔ وہی صاف شفاف چہرہ۔ پر بنیادی لوازمات سے پاک آرائش و زیبائش سے مبرا وجود۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرائی۔

تو اسے بے ساختہ ہی صبا بھابھی کا استہزائیہ لہجہ یاد آیا۔ لب بھینچتا وہ نظر اندازی کا شاندار مظاہرہ کرتے اس کے پاس سے گزر گیا۔

وہ حیران سی وہیں جم کر رہ گئی۔

"ارے یہاں کیوں کھڑی ہو' چلو میٹنگ شروع ہو گئی ہوں۔" اس کی کولیگ نے اسے سر راہ کھڑے دیکھ کر ٹوکا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی بھی سا خالی انداز۔

"آر یو اوکے۔"

"یس فائن۔" مصنوعی مسکان سجاتے وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔ لیکن سوچ وہیں اک نظر پر ٹھہری تھی جو قطعی اجنبی سی تھی۔

میٹنگ میں وہ اسے پھر سے دکھائی دیا۔

فل فارم میں اپنی جگہ بنانے کی شاندار جدوجہد اس کی محنت دلکش نے پوری کی تھی۔ یوں تمام وقت و لمحے اس نے اپنے نام کر لیے تھے۔ اس کے برعکس مائنڈ کو سراہا گیا تھا۔

باس بہت خوش تھا۔ لیکن عمر ہادی کی مسکراہٹ بہت پھیکی و بے رونق تھی۔

سو تحمل رہ نہ سکی میٹنگ کے اختتام پر اس کے ہم قدم ہوئی۔

"کیا بات ہے اتنی زبردست تیاری۔ اپنی ہی تعریف کروانے میں لگے ہوتے ہو کسی اور کو بھی موقع دے دیا کرو۔" تحمل وقار کو اس کی اک نظر نے بے شک راکھ کر دیا تھا مگر محبت ہمیشہ خوش گمان ہوتی ہے۔

عمر ہادی نے بے ساختہ اسے دیکھا۔

کب تک نظر انداز کرتا اب تو وہ ساتھ ساتھ تھی۔ ویسی ہی۔ جیسی کل رات کافی کیفے میں تھی۔ بے تکلف دوست و ہمدم۔

"لیکن منہ پر بارہ کیوں بجے ہیں وجہ کیا ہے۔"

اپنے آفس میں داخل ہوتے عمر ہادی نے دروازہ تھامے رکھا اور تب چھوڑا جب وہ اندر آ گئی۔ سو تحمل نے پھر پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے تم نے یونہی محسوس کر لیا۔"

"اچھا۔" وہ چند لمحے اس کے سنجیدہ تاثرات دیکھتی رہی جن میں اسے آج عجب عجیب سی تختی سی لگی۔ وہ آگے بڑھ گیا اور وہ وہیں کھڑی رہی۔

عجیب بے تکلفی تھی ان میں' جس میں ذاتیات کے متعلق کوئی بات تقریباً ہی غیر ممنوع تھی۔

دنیا کے ہر موضوع پر بات ہوتی سوائے اپنی ذات کے۔ وہ کوئی بھی سرا نہ چھوڑتا تھا جسے تھام کر وہ اس گہرے سمندر سے تحمل کا کوئی شناسا' جان لینے والا موتی ہی پا جاتی' جس کے ذریعے وہ اندر تا باہر صاف و شفاف آئینے سا۔ جانے لگتا اک درد سا اٹھا تھا اس پل اس کے اندر۔ لب بھینچے وہ وہیں تھمی رہی۔

اور عمر ہادی اپنے ہی درد سے نڈھال بظاہر مضبوط اس تھمنے کو بتا ملنے بھی محسوس کر گیا۔

اور کرسی تھپتھپا کر ابھی بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے کے پھر سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر چونکا۔

پلٹا تو بس اس کے وجود کی خوشبو ہی وہاں ٹھہری تھی وہ کہیں نہ تھی۔ ایک سرد سی نظر نے تحمل وقار کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی تب ایک شدید رد عمل تھا' جو اب تک نہ ہوا تھا' وہ تھکا' بے جان سا کرسی پر گرا تھا اس نے تو عمر ہادی سے اپنی شناسائی یوں طے کر لی تھی جیسے نہ جانے کتنی ہی صدیوں سے اس کے انتظار میں تھی' مکمل طور پر اسے جانتی' پہچانتی اس کے مزاج کے ہر رنگ سے واقفیت رکھتی' اور ایک وہ تھے اس کے اپنے رشتے' جنہیں قدر نہ تھی رشتوں کی' احساس کے ہر رنگ سے ماورا۔ تھے وہ سگے' خون کے ایک ہی رنگ سے جڑے۔ بظاہر زنگ زدہ رشتے۔

جنہیں رکھ بتانا آتا تھا' عرش سے دھکا دیتے

فرش پر اور فرش سے گراتے دھول چٹانے کا نظارہ دکھانے کا فن بھی آتا تھا۔

وہ تکلیف میں تھا لیکن صبح کے ان لمحوں سے نہیں بلکہ نہ جانے کتنے ہی برسوں سے۔

لیکن تحمل وقار ان تکلیف زدہ لمحوں کی شراکت دارکا نہ تھی سو آج وہ اس معاملے کو بھی نمٹانے لگا تھا۔

غصہ، غم میں، پھر تکلیف سے ہوتے دکھ میں ڈھلنے لگا تو فیصلے کا عمل آسان و تیز رفتار ہو گیا۔

لیپ ٹاپ کی اسکرین سامنے تھی اور اب اسے دنیا کا ایک گوشہ منتخب کرنا تھا، جہاں وہ اپنے رشتوں کے مسخ زدہ چہروں سے اور محبت کے اس کھلے چہرے سے کشاں کرتا تھا۔ اور مشکل کام ہمیشہ ہی جلد بازی میں کیے جاتے ہیں اور جن کے پچاس فیصد مارکس مثبت ہی ہوتے ہیں۔

اسے پردہ ڈالنا تھا خود پر اور وہ پردہ ڈال گیا تھا۔

کیونکہ اپنے لیے تحمل وقار کو منتخب کرکے اسے تمسخرانہ نظروں سے ہی نہیں بچتا تھا بلکہ محبت کے چہرے کو بھی راکھ ہونے سے بچانا تھا۔ اگر وہ بھی کسی کمزور لمحے میں صبا بھابھی سی ہی کہی کوئی بات کہہ جاتی تو جینے کا اعتبار و اختیار تو کیا وہ موت کے لمحوں کی سفاکی کو بھی امرت سمجھتا پی جاتا۔

”ساری دنیا کی آنکھوں میں زہر ہے، تکلیف ہے تحمل، لیکن اپنے لیے تمہاری ان سحر زدہ آنکھوں میں نفرت تو کیا بےزاری کا اک لمحہ بھی میرے لیے موت جیسا ہے۔“

اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بہت کرب سے اس نے سوچا تھا۔ وہ انسان تھا کوئی بے جان بت نہیں۔

اپنی نمائش و تضحیک کسی صورت بھی قبول نہ تھی۔

اور ستائش کے لیے کسی ریڈ کارپٹ کا منتظر بھی نہیں تھا وہ۔ عام سا شخص تھا جسے محبت کے دلدل میں اتر کر اس کی گہرائی کا اندازہ نہ رہا تھا۔ اور اسی محبت کے لیے وہ اپنی ذات کی چاہت سے بھی دستبردار نہ ہونا چاہتا تھا۔

لیکن اسے ہر چیز ادھوری ہی ملی۔

اگر زندگی میں اب کچھ مکمل مل رہا تھا اور ملتے ہی رہنا تھا تو وہ تھا۔ محبت کا دکھ۔

نارسائی و کرب انگیزی سے بھرپور۔ تسلسل سے، مسلسل۔ لامتناہی سفر تھا۔ اور اس سفر پر چلتا وہ مڑ کر دیکھنے سے گریز ہی کرتا رہا۔ ان شبیہہ و سحرانگیز آنکھوں کی وجہ سے۔

صبا بھابھی کے اس ایک جملے نے اس دربدری کا عذاب جھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ کبھی عمر ہادی کا عذاب کسی پر بھی مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دل پر ضرب لگاتے اس ایک جملے نے گمشدگی کے لمحوں کے سپرد کر دیا تھا اسے۔

کسی کو بھی بتائے بغیر وہ ہر جگہ، تفریق کے پرے دنیا کی بھیڑ میں خود کو گم کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھلے، آکاش تلے
دل کی وادی میں
ایک دیا جھلملائے گا
میں تیرے پیار کی سچائی ہوں،
تو میرے من کا سوالی ہے
کیا کوئی چشمہ پانی کا
میری پیاس بجھائے گا!!!

وہ حد درجہ بےیقین تھی۔

اور ہوتی بھی کیوں ناں۔ کیونکہ اس نے چاہے جانے کا عذاب اپنے سر جو لے لیا تھا۔

اور اسی باعث اب وہ تشنہ تھی۔

سیراب ہونے کے احساس سے کوسوں دور۔ وہ صحرا بن کر کھڑی تھی اور کب تک؟۔ ان لمحوں کی مدت کا احساس تو کیا ان کی گنتی و شمار کے ساتھ ساتھ اس کے ختم ہونے کے سبب سے بھی بےخبر تھی۔

اتنی ہی بےخبر جتنی ان تین دنوں میں تھی۔ خود سے ہی ناراض، بلاوجہ، بلاسبب۔ اس نے عمر ہادی کو نظر

اندازکرنا شروع کردیا۔

وہ اس کے پل پل تولہ و ماشہ کے مزاج سے خائف بس اب دی اینڈ چاہتی تھی۔ کوئی خاص جذبے کے تحت نہ سہی، لیکن اک دوستی یا جان پہچان کے سبب ہی سہی تکلف کی دیوار گرجاتی یہ سوچ رہی کہ وہ ناراض و انجام ہونے لگی۔

لیکن اسے کیا معلوم تھا یہی گریز عمرہادی کا راستہ صاف کر گیا تھا۔ وہ یوں سامنے سے ہٹا کہ تحمل وقار ششدر و پشیمان ہو کر رہ گئی۔

تیسرے دن عمرہادی کی غیر حاضری نے فقط ایک گھنٹے میں ہی اسے بے چین کردیا۔ وجہ معلوم کرنی چاہی تو عمرہادی کا سیل ہی آف ملا۔

ناراضگی کی دیوار گری تو بے چینی کا پہاڑ بننے لگا۔

اور اس وقت تو انتہا ہو گئی جب تحمل وقار نے سنا۔

"عمرہادی نے ریزائن کردیا ہے یقیناً" کسی بہترین کمپنی سے شاندار پیکج پر آفر آئی ہوگی۔ باس تو اب ہاتھ ہی مل رہے ہیں عمرہادی سا ہیرا جو گنوا بیٹھے۔"

تصنع و بناوٹ سے عاری تھی عمر کی شخصیت۔ لیکن وہ ساتھ چھوڑنے کی اس طرح اس کی ذات و اہمیت سے منکری اختیار کرے گا یہ تو حد تھی اور حد بھی بزدلی کی۔

وہ پہلی مرتبہ عمرہادی کے گھر کے دروازے تک گئی لیکن یہ آخری دفعہ ہوگا۔ کسی کو کیا معلوم!

"ذاکر! حد ہے غیر ذمہ داری کی بھی کتنے دنوں سے گھر نہیں آیا عمر نہ جانے کہاں ہے گھر بھی چھوڑ دیا بغیر کچھ بتائے یا کہے لیکن اس طرح جانے کا سبب ہے کیا؟؟"

نازک سی اس آواز میں نہ فکر تھی نہ پریشانی بس تجسس سا تھا تحمل کو ہی لگا تھا شاید۔

داخلی دروازہ کھول کر وہ اندر آگئی تھی تب ہی یہ آواز اس تک آئی تھی۔

بنا چاپ دروازہ کھلا تھا۔

سو اس سٹنگ روم کے سائیڈ صوفے پر بیٹھے وہ دو نفوس جان ہی نہ پائے کہ تحمل اندر آچکی ہے۔

"ماں باپ تو ہیں نہیں اور بڑے بھائی کو وہ کچھ سمجھتا نہیں ہے، اسی لیے اس قدر خود مختار و آزاد ہے، چلو ویسے بھی ہمیں کیا کرنا تھا جو اس کے رہنے کا آنے جانے کا حساب رکھتے' سچ ہے ناں خود سے ہی فیصلہ کر گیا۔"

بے پروائی کا عنصر زیادہ گہرا تھا جو تحمل وقار کے دل تک سفر کر گیا اپنوں کی ایسی بے اعتنائی تحمل نے بے حد غور سے ان کے انداز دیکھے تھے۔

جو بات کرنے کے دوران کبھی کبھی اپنی پوری جھلک بھی دکھا رہے تھے۔

عمرہادی کی ذرا بھر بھی شباہت نہ تھی اس تودی میں ۔۔۔ کیونکہ وہ ظاہری اجلا نہ تھا بلکہ اندر سے بھی صاف تھا اتنا کہ اس کے احساسات پر سفید ڈھلکی برف کی تہہ بھی نظر آنے لگی تھی۔

کوئی مطلب نہیں تھا: نہیں کسی کے بھی غم سے ' درد تکلف سے۔ کیونکہ وہ مطلبی و خود غرض تھے۔

اتنا تو تحمل وقار نے بھی اندازہ لگالیا تھا۔

"عمر اپنی ظاہری شخصیت سے خوفزدہ ہو کر بھاگا ہے ذاکر۔"

"یہ تو یقینی ہے۔۔۔"

"ظاہری شخصیت۔۔۔" تحمل نے اک سرد سی حیرت اپنے اندر اترتی محسوس کی تھی۔

"کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس دن میری گفتگو سن چکا ہے، جو میں نے کہا تھا کہ کسی حسین لڑکی پر عمرہادی کا عذاب نہیں ڈالوں گی" صبا بھابھی کا سوچتا انداز اک نیا در وا کر گیا تحمل پہ۔۔۔

عمرہادی کی ذات کا مقفل در۔۔۔ یہ ماحول و رنگ ہر طرح سے سچا تھا اتنا کہ ہر اک شخصیت اندر تا باہر آئینے کی طرح صاف نظر آرہی تھی۔

اور آج وہ بھی اس آئینے میں عمرہادی کی ذات کے گنجلک سرے کو پانے لگی تھی۔

لیکن اس جاننے کے عمل کے دوران تحمل کو اک گہرا سناٹا سا اپنے اندر اترتا محسوس ہونے لگا۔

"تو تم نے کیا غلط کہا صبا۔۔۔"

ذاکرہادی کا جوابی عمل تیر بن کر لگا تحمل کو

"ذرا بھی نہیں وہ ہماری فیملی سے 'بابا صورت میں اپنی شال اکیلے سے اور ماما حد درجہ حسین تھیں پھر میرے اور اس کے بیچ کا ڈیفرنس۔۔۔ یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں 'وہ بچپن سے دیکھتا آرہا ہے یہ سب۔۔۔ اب اچھا و برا۔۔۔ الگ یہ اور ہی قصے تک جا پہنچا لگتا ہے۔۔۔ اور اصل بات تو یقیناً" اور ہے میری جان۔۔۔ اور یہ راز عمرہادی لگتا ہے ساتھ ہی لے گیا ورنہ کوئی نہ کوئی ہنٹ کا حصہ تمہیں یہاں وہاں ضرور دکھائی دیتا۔"

بے زار لہجہ۔۔۔ لاپروائی سے ہوتا سنگین مزے پر جا پہنچا' نہ جائیداد میں سے حصہ اور نہ ہی کچھ اور تقاضا' اتنی خوش دلی سے ہادی کا تذکرہ اور اس کی ذات کے بخیے تو بنتے ہی تھے۔

تحمل وقار کے سن ہوتے دل کو کچھ ہوا اور وہ اس ماحول سے باہر آگئی۔ سخت سردی تھی اطراف میں کہر سی' دھند سی اور وہ شکستہ دل 'اپنا سامنا قطعاً" بھی ان لوگوں سے نہیں کرنا چاہتی تھی جنہوں نے عمرہادی کی ذات کو سرد رویوں کے پتھر مار کر نکال دیا تھا۔

اس عمرہادی کو جسے تحمل وقار نے اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اس کے پاس کوئی سہارا و آسرا نہ تھا۔

بس وہ تھی اور اس کا اپنی ذات پر اعتماد۔

لیکن عمرہادی سے اس نے ہر رشتے کی توقع باندھ لی تھی۔ اور توقع باندھنے کے بعد اس کی طرف سے ہاتھ بڑھانے کی منتظر تھی۔ استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تو وہ وہیں سڑک کے اطراف بنے اس گھنیرے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گئی۔

"میں تو یہی سمجھی کہ تم زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے نکل پڑے ہو' کیونکہ تمہیں آگے بڑھ جانے کا جنون تھا۔ اور اس کے لیے مجھے اس بیچ منجدھار چھوڑ دیے۔۔۔"

یاسیت کی دھند شاید آسمان سے بہت قریب تھی تبھی ہلکا ہلکا اندھیرا چاروں طرف چھانے لگا۔

"میری سوچ غلط تھی۔۔۔ حیران کن طور پر 'تم تو اپنی ذات کا غرور یا اپنے کو نکل کھڑے ہوئے۔۔۔ لیکن عمر ہادی کی ذات کی تکمیل تو مجھ سے ہے' تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں بھی تمہیں اس صف میں لا کھڑا کروں گی ۔۔۔ جہاں تمہیں یہ لوگ کھڑا کرتے ہیں۔۔۔ اتنی ناانصافی۔۔۔" دونوں ہاتھوں میں اس نے چہرہ چھپایا تو دونوں ہتھیلیاں بھیگ گئیں' اور اس لوس بھری آنکھوں کو دیکھ کر آسمان بھی برسنے لگا۔

ٹھنڈ پھیلتی گئی۔۔۔ عمرہادی کی جانب سے اپنی ذات و محبت کی بے توقیری نے اسے دکھ سے نکال کر غم و غصے سے بھر دیا۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی عمر' ان خالی ہاتھوں کے لیے' جن میں محبت کی کوئی امید نہیں' کوئی دیا نہیں' احساس کا اک لمحہ بھی نہیں' میری اس شکست کے قصوروار بھی تم اور روح کو اس عذاب مسلسل میں مبتلا کردینے کے بھی ذمہ دار تم' جسے محبت کی نارسائی میں جلا کر تو دنہ جانے کہاں ہو۔۔۔ لیکن میں خود کو تمہاری طرح نہ تو دربدری کا دکھ دوں گی اور نہ ہی بدگمانی کا اشتہار بنوں گی' میں تحمل ہوں' تحمل وقار آج کے زمانے کی مضبوط لڑکی' کیا ہوا جو محبت کے اس سفر میں تم سے مات کھائی اور آبلہ پائی کی سزا کی مستحق ٹھہری' اس سزا کی جس سے میں سخت خوفزدہ رہی۔۔۔ چلو یہ حساب بھی تم تک رہا۔"

اب ٹھنڈے ٹھنڈے وہ قطرے درختوں سے چھنتے' جیسے صاف ہوتے اس کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔ لیکن محبت کی کسک میں جلتی اور آبلہ پائی کے زخموں کا حساب رکھتی وہ بے حس ہونے لگی تھی۔ مگر اک طاقت و عزم اب بھی اس میں تھا۔

"مگر میں ہرگز ہرگز بھی خود کو گھلنے نہیں دوں گی۔ میری زندگی' میری سوچ اور میری محبت پر میرا اختیار اب بھی ہے۔" اک سرد ہوا کی لہر نے اسے چھوا تو وہ چونکی' بے حسی ٹوٹنے لگی۔۔۔ اک انجانی سوچ پر غم کی برف پگھلنے لگی' اور تحمل وقار مضبوط سی ہونے لگی اپنی سوچ پر یہاں اس بات پر تم ہار گئے کہ اس طرح سب چھوڑ چھاڑ کر جانا تمہاری ہار ہی ہے' چاہے تم مانو یا نہ مانو' بے شک تسلیم بھی نہ کرو کہ تم ہار گئے مجھ سے عمر ہادی تم جو مجھے اپنی۔۔۔ بے پروا طبیعت سے نظر اندازی

کے مظاہرے سے کمزور کر دینا چاہتے تھے اور شاید اپنی موجودگی کے سبب کمزور کر بھی رہے تھے ' تم اگر جان جاؤ تو شرمندہ ہو جاؤ یہاں تم جیت نہ سکے۔ محل وقار سے ہار گئے۔ کیونکہ تم جاتے جاتے مجھے مضبوط کر گئے جانے انجانے میں۔

معنی خیزی سے سوچتے ان آخری لفظوں میں بعید تھا کچھ ان کہی سی بات تھی۔۔۔ یاسیت نے گھبرا کر پردہ چھوڑ دیا۔ ہوا کے ساتھ ساتھ برف سی بوندوں نے بھی حیرت سے اپنی پلکیں جھپکیں۔ اور کچھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن محل وقار نے اپنی سوچوں پر تالے ڈالے ' محبت کو کہیں قید کیا اور بہت مضبوط قدموں سے چلتی اک نئی راہ تلاش کر گئی۔

اب اس کے قدموں میں نہ لنگنی تھی ' نہ کرب تھا اور نہ ہی آبلہ پائی کا احساس۔ وہ جو چند لمحوں پہلے خوفزدہ تھی ' دکھی تھی اب نڈر بنی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل تیار تھی۔

اور صرف حالات کا ہی نہیں ' اپنے جذبات و احساسات کا اور ساتھ ساتھ اپنے دل اور دماغ کا بھی۔

☼ ☼ ☼

کہیں کہر تھی دھند تھی اور کہیں کوسوں میلوں دور بس احساس تنہائی احساس زیاں کی تکلیف تھی۔

جہاں کہر و دھند تھی اب وہاں مضبوط سی فصیل تھی کسی کی جنون محبت پر مگر یہاں اس پل اس لمحے کوئی خود سے نظریں چراتے وقت سے مقابلے کرتے خود آگے اور وقت کو پیچھے بہت پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں تھا۔

خاصی مضحکہ خیز تھی یہ کوشش ' یہ وقت کی مدبرانہ سوچ تھی اس شخص کے لیے کیونکہ وقت اگر پیچھے رہ جاتا ہے تو وقت تو آگے بھی رہتا ہے ہمیشہ انسان کے اٹھتے قدم سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی۔ یہ تو انسان ہے ' جو اس کے چھوڑے گئے نقش پر قدم رکھتا ہے۔

اپنی طرف سے بہت ہی مطمئن و خوش رہنے کی کوشش کرتا ' وہ ڈنمارک کی سرزمین پر اپنے لیے منتخب کیے گئے گوشے میں زندگی پر احسان جتا رہا تھا۔

پُر آسائش فلیٹ کے ' اٹالین طرز کے کچن میں اپنے لیے وہ کافی بنا رہا تھا۔

اس کا آج کا دن بھی خاصا مصروف گزرا۔

کچھ مصروفیت رہی اور کچھ اس نے اس کی سبیل بنالی۔

بہرحال وہ ہر طرح سے روپوش ہو ہی چکا تھا یہاں تک کہ اپنے آپ سے ' اور اس " آپ " میں سرفہرست تو اس کا دل تھا جو دونوں ہاتھ باندھے ' بے حد خفا اس سے رخ موڑے ہوئے تھا مگر وہ بھی عمر ہادی تھا انجان بنا اپنی تھکن کو پرسکون کرنے کے لیے اسٹرانگ کافی پر اپنی محنت صرف کر رہا تھا۔

کافی تیار کی اور لاؤنج میں داخل ہو کے کپ ٹیبل پر رکھا اور لیپ ٹاپ اٹھایا تو سیدھے ہوتے نگاہ بالکل سامنے کیلنڈر پر ٹک گئی۔

ہندسے بدل گئے۔۔۔ وقت پھر بہت پیچھے تک چلا گیا تھا وہ وقت جو دو سال پہلے وہ چھوڑ آیا تھا بہت کامیابی سے اپنے تئیں ' سب کچھ بہت عمدہ ہی سا تھا۔ اب تک اس کی روپوشی۔۔۔ تا حال قائم و دائم ہی جو تھی۔

نگاہ چرانی چاہی ' جب رخ موڑے دل نے بے ساختہ ہی اس کی طرف دیکھا جو کافی کی بھاپ پر نظر جما گیا تھا۔

اسے بے ساختہ ہی کسی کی طلسم طاری کرتی شخصیت یاد آئی۔

کافی کیفے کے ماحول میں وہ ملاقات یاد آئی۔ وہ ملاقات جو دل پر ضرب لگاتی رہی اور وہ آنکھیں یاد آئیں جو سوال کرتی تھیں اس سے ' وہ سوال جن کا جواب تو کیا ' کہنے کے موقع کو بھی رد کر آیا تھا۔ جسے خوش اور مسکراتے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ یقیناً " دوری کے احساس کے ساتھ زندہ ہوگی۔ مسکراتی آنکھیں بے نور ہوں گی۔

وہ جو اسے سنجیدہ کم ہی اچھی لگتی تھی اب مسکراتی بھی کم ہی ہوگی ' کیا سوچ گیا تھا وہ اک لمحے میں ' وہ بھی اس دل کے باعث ' جو جب بھی اسے طنزیہ و غمزدہ ہوتے

دکھتا تھا۔
تو اسے وہ سادہ سی پروقار حسین لڑکی بے تحاشا یاد آنے لگتی جس کی سحر انگیز آنکھوں کے طلسم سے نکلنا اس کی زندگی کی اولین و آخری خواہش بن گئی تھی۔
دل کرلایا تو رو اٹھا۔
اور تب عمر ہادی سب چھوڑ چھاڑ اس دکھ دیتی آزمائی چار دیواری سے نکل کر سنوپارک کی سڑک پر آ گیا۔
جہاں ٹھنڈ تھی، بے حسی تھی اور گہری و جامد خاموشی بالکل ایسی ہی جیسی اس وقت وہ خود اپنے جذبات و احساسات پر چاہتا تھا۔
وہ صاف شفاف سڑکوں پر اس طرح سے پھر رہا تھا جیسے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔
دسمبر کے اس یخ بستہ ماحول میں وہ ایک بار پھر آوارہ گرد بنا گھوم رہا تھا۔
کہ یہی تو وہ مہینہ تھا جب اس نے خود کو گم کر لیا تھا۔
مگر اس کی جیت بس اس کے وجود تک ہی تھی۔
وہ اپنی چاہت و محبت کے خیال میں ہر لمحہ، ہر وقت جکڑا ہی رہتا۔
اس محبت نے اسے آوارگی عطا کر دی تھی۔
جو خود بھی روتی تھی اور اسے بھی رلاتی ہی تھی، کسی بھی پل اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ کیونکہ اسے اپنی نامرادی کا دکھ تھا۔ دل اپنے کنارے پر اس کے آباد ہونے اور پھر بیاباں ہونے پر الگ ہی افسردہ غمگین اور ناراض تھا۔
اور وہ خود بھی اپنے دل سے پشیمان تھا کہ اس نے اسے درد کی دولت جو عطا کر دی تھی۔۔۔
اپنا آپ لٹا دیا تھا اس نے محبت کے نایاب موتی کی حفاظت کے لیے اور وہ نایاب موتی۔۔۔ نحل وقار کے نام سے جب جگمگاتا تو اسے کہیں چین نہ آتا۔
چلتے چلتے وہ پر ہجوم سڑک کی طرف آ گیا تھا۔
لوگ دسمبر کو انجوائے کر رہے تھے۔
ریسٹورنٹس کے سامنے اگرچہ بے کراں ہجوم تھا تو آئس کریم پارلرز پر بھی کافی تعداد تھی۔
ہنستے مسکراتے خوش باش لوگ۔۔۔
تب اتنی روشنیوں میں اسے ایک شناسا عکس دکھا۔ وہ تھوڑا سا چونکا اور غیر ارادی طور پر آگے آ گیا۔
اس کے قدم تھمے اور آنکھیں حد درجہ حیرت کا احساس لیے کھلی رہ گئیں اس سے دس بارہ قدم دور دنیا کا حسین ترین جوڑا اس کے سامنے تھا تو جو ہر لحاظ سے مکمل تھا۔
اگر لڑکی کا حسن بے اندازہ پرکشش تھا تو لڑکے کی پرسنالٹی رات کے اس اندھیرے میں جگمگا رہی تھی۔
لیکن اس کی حیرت اس حسین جوڑے کے ہونے پر نہیں۔ لڑکی کی بے تحاشا ہنسی پر تھی۔
وہ ہنس رہی تھی، دل کھول کر منہ پر ہاتھ رکھے بار بار اپنے سامنے کھڑے لڑکے کی ناک کی طرف اشارہ کرتی پھر کچھ کہتی اور ہنسنے لگتی۔
لڑکے کی ناک پر آئس کریم لگی تھی۔ جسے اتارتے وہ خود بھی ہنس دیا تو۔ بے مثال جوڑی تھی۔
لیکن عمر ہادی کے قدموں تلے تو جیسے زنجیر بندھ گئی تھی۔
اس کی ہنسی، چمکتا چہرہ۔ اسے لگا اب تک وہ دھوکا بھری زندگی جیتا آیا ہو۔ یا سامنے نظر آتا منظر ہی جھوٹا ہو، فریب ہو، نظر کا دھوکا ہو۔ مگر حقیقت کھلی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔
نہ وہ آگے بڑھ سکا اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکا۔
پر وہ دونوں ہی یونہی ہنستے مسکراتے آگے بڑھ گئے تھے۔
عمر ہادی کو اپنے اطراف پھیلی رونق بھول گئی۔ اس ایک منظر نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔
وہ ہنکھو کل، شخص وقت دیکھنا بھول گیا، زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی ضروری ہے وہ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل نہ رہا۔
آفس جاتا تو ایک ہی فائل کو کھولے رہتا اور کبھی غلط فائل پر غلط ہی کام کر جاتا ہے۔
کیا جادو طاری کرنے والا تھا۔ اس کی ذہنی حالت پر آفس کی طرف سے اسے ایک ہفتہ ریسٹ پر بھیج دیا گیا۔

"قابل بندہ ہے ہو گیا ہو گا کچھ ٹینشن۔" ہمدردی
سے یہ جملہ اس کے فور میں کہہ دیا جاتا۔
لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ٹینشن نہیں ہے' بلکہ یہ وہ
حاصل کرب ہے' جس پر اس کی پوری ۔۔۔ زندگی محیط
ہوتی لگنے لگی تھی۔۔۔ وہ ہنستا' پر سکون چہرہ اس کی ملت
تھا۔

اس نے تحمل وقار کو یہ سوچ کر چھوڑ دیا تھا کہ عمر
ہادی کا ساتھ اس کے لیے تکلیف دہ ہو گا۔

لوگوں کے لیے تو کیا خود اس کے اپنے قریبی رشتے
ہی اس کے لیے تضحیک کا باعث بنتے' لیکن وہ اس کو
چھوڑ کر خوش و مطمئن ہو گی یہ بھی اس کے لیے اذیت
ناک ہو گا' قابل بیان دکھ ہو گا وہ اس پر بھی غیر یقین
تھا۔۔۔ حیران تھا خود پر۔۔۔

مگر وہ کھا بھلا نا ہوا ہر طرح کے دکھ کے احساس
بلکہ ہلکی سی چھوائی سے بھی پاک' عمر ہادی کی ذات کو بھی
اندر تک مار گیا تھا۔۔۔ عزت نفس کی موت تو اسے کبھی
بھی منظور نہیں تھی۔۔۔ لیکن محبت کی سانسیں
بند ہو جاتیں یہ بھی قابل قبول نہ تھا اس کے لیے۔

"اور یہ تو حقیقت ہے تحمل کہ تمہیں ہنستے دیکھ کر
بھی میں خوش نہیں ہوں لیکن تم ۔۔۔ سے اپنی محبت کو
بھی ختم کر دینے پر قادر نہیں ہوں۔" کھلے آسمان تلے ایک
بینچ پر بیٹھا وہ آسمان کی وسعتوں میں پناہ لیتے' زندگی کی
مانند بھاگتے دوڑتے بادلوں میں اس کے اس مسکراتے
عکس کو ڈھونڈتے مخاطب ہوا۔ محبت کا مسکراتا چہرہ
یعنی تحمل وقار کی ذات جیت کا نشان۔۔۔ اور خود سے
لاپروا ویران چہرہ۔۔۔ یعنی عمر ہادی کا وجود۔۔۔ سب کچھ ہار
دینے کا نشان۔

وہ راکھ ہونے لگا تھا اندر سے۔۔۔ یہ سوچ کر کہ تحمل کو
صرف اس سے انسیت تھی۔۔۔ اس کی کھور آنکھیں جو
اس کے دل پر دستک دیتی تھیں محبت کی' وہ سب ایک
بے توقیر احساس تھا اس کا۔

"تو کیا وہ خود ہی اس راہ پر تھا' تحمل وہ اس کے قدموں
کا نشان تو کیا عکس بھی نہ تھا ان رستوں پر۔۔۔" وہ بے
ساختہ ہی بند ھا ہوا۔۔۔ یہ خود کلامی اسے جھنجوڑ گئی۔

وہ اپنا سر ہاتھوں پر گرا گیا۔

ہلکی ہلکی برف اس پر گرنے لگی تھی۔

سفید بادلوں نے کب اپنا رخ بدلا اور بھیگنے کے
بجائے نرم سی سفید مخملی ردا اوڑھی وہ بے خبر ہی رہا۔
اسے لگا بس وہ فنا ہونے کے قریب ہے۔

اور تب ہی اس مندلی شام میں کوئی اس کے پشت
سے جڑی بینچ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"آخر مجھ میں کون سی ایسی کمی ہے' جو تمہیں میرا
ہونے سے روکتی ہے؟" کیا سوال تھا۔۔۔ عمر کی سن ہوتی
سماعتوں نے سنا تو اس کا مفہوم اس کے لبوں کو زہر خند
کر گیا۔

اس نے تصور کی آنکھ سے خود کو تحمل وقار کے
مقابل دیکھا لیکن پھر سر جھٹکتے' تصور کو پل میں مٹاتے
وہاں سے اٹھنے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ عام سا شخص
تحمل جیسی حسین لڑکی کے کہاں قابل تھا۔

"کیونکہ مجھ میں اب مکمل ہونے کا احساس ہی
نہیں ہے' میں نامکمل ہوں۔"

یہ نسوانی شناسا آواز اس کی روح تک کو منجمد کر گئی
اتنی کہ وہ رخ موڑنے تک سے قاصر ہوا' جسے ایک بار
دیکھ کر وہ خود سے غافل و انجان ہونے لگا تھا اب اس
کے ایک جملے نے اسے دیوانہ بنا دیا۔

کیا جواب دے وہ تھا تحمل وقار نے' کیونکہ یہ تو وہ
جواب تھا اس نے بار ہا بے حساب تحمل وقار کے تصور کو
دیا تھا۔

اس کے مقابل کوئی بھی وہ محبت مانگتی اس سے تو
وہ اسے اسی جواب سے نوازتا' لیکن محبت سے کبھی بھی
نہیں۔ وہ نامکمل تھا تو سے کیا مکمل کرتا اور اب ان دو
سالوں بعد وہی کہانی تصور سے نکل کر ان دو شخصیتوں
کی طرف رخ موڑ رہی تھی' یعنی اس کے سامنے بیٹھا
شخص "تحمل وقار" تھا جسے جواب میں ذات کا ادھورا
پن دکھا دیا گیا تھا وہ بھی "عمر ہادی" کی جانب سے۔

یعنی تحمل وقار کے وجود میں عمر ہادی کی ذات بس گئی
تھی۔۔۔ عمر ہادی کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے سے
قطرے سے چمکنے لگے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو نحل؟ تم مکمل ہو خوب صورت، پڑھی لکھی خود مختار ہو، لیکن پھر بھی بے حیا سی آزادی تمہیں نہیں دیکھی میں نے، اسی لیے میں نے تمہیں پرپوز کیا اور یاد کرو نہ جانے کتنی بار۔۔۔ کبھی اشاروں میں اور کبھی واضح الفاظ میں، لیکن تمہاری بے پروائی مجھے ہر بار ہی ڈس ہارٹ کرتی رہی، روکتی رہی مجھے پھر بھی میں تمہیں پانا چاہتا ہوں، کیونکہ آئی ریئلی وانٹ تو میری یو۔" سنجیدہ مضبوط مردانہ آواز کی شائستگی لفظوں میں اور لہجے کی مہک میں پسندیدگی کا اعتراف تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی عمرہادی کو بے کل کر گئی۔

"یحییٰ میری محبت مکمل نہیں نہ ہی میری ذات اپنی تکمیل کے احساس سے پُرنور ہے۔۔۔ میری محبت، میری ذات ادھوری ہے۔"

اک طمانچہ تھا جو عمرہادی کے چہرے پر لگا تھا۔

وہ سانس روکے اس پُرسکون آواز کو سن رہا تھا اور اک درد خود میں محسوس کرنے لگا تھا۔

"تم مجھے انتظار کرنے دو، تم بہت اچھے ہو، میرے دوست بھی ہو، لیکن میری ذات کی تکمیل تم سے نہیں ہے اور ہو بھی کیسے میری ذات کا حصہ گمشدہ ہے۔"

گہری یاسیت سی اتر آئی تھی اس کی آواز میں۔۔۔

اب وہ بھی کس حد تک مضبوطی کا مظاہرہ کر پاتی۔۔۔ جیسے محسوس کرتے عمرہادی لب بھینچ گیا۔

یحییٰ خاموش تھا بالکل۔

"یہ پاگل پن ہے نحل۔۔۔" وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ یقین ہے یحییٰ۔"

"کیسا یقین۔۔۔" یحییٰ کا لہجہ استہزائیہ ہونے لگا۔

شاید اپنا ٹھکرانا اسے اچھا نہ لگا تھا۔ خاصا خوب صورت مردانہ سراپا تھا اس کا۔ نظرانداز کیے جانے کے ہرگز قابل نہ تھا۔

اور نحل وقار ہی اسے نظرانداز کر سکتی تھی، کسی کی گہری چھاپ جو اس کے دل پر نقش تھی۔ نرم سی پھوار میں تیزی آنے لگی۔

سفید سفید برف چاروں طرف گرتی بہت خوش مزاج سی لگ رہی تھی۔ لیکن عمرہادی اپنی ذات کے کٹہرے میں کھڑا تھا، محبت وجود رکھتی ہے، ذات رکھتی ہے، مگر ظاہری نہیں، کوئی عمرہادی کو آرے سے بھی کاٹتا تو بھی اسے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اب ہو رہی تھی۔

"اس کی گمشدگی یقیناً ان ہی سالوں پر محیط ہے جن میں، میں تم سے ملا ہوں اور نہ جانے آنے والے کتنے سال لگ جائیں گے اسے لوٹنے میں اور تمہیں یقین ہے۔۔۔" عجیب سی وحشت محسوس کرتے عمرہادی کھڑا ہو گیا تھا۔

نحل کی خاموشی طویل ہونے لگی، عمر کا ضبط ختم ہونے لگا۔

نحل کی ذات کو رگید نے اس استہزائیہ سوال کا جواب وہ نہ دے سکی لیکن اسے دینا تھا وہ بہت خاموشی سے سامنے جا کھڑا ہوا، دل نے اس عمل کو سراہا تھا۔

ذات کی ملامت خاصی کڑی ہوتی ہے اور اس میں اگر محبت کی ملامت بھی شامل ہو جائے تو انسان فنا نہ ہوتے ہوئے بھی لمحہ بہ لمحہ خود کو اس احساس میں گم دیکھتا جاتا ہے۔

اور عمرہادی پل پل کے اس فنائی عمل سے بچنا چاہتا تھا وہ جان گیا تھا کہ محبت ظاہری شخصیت سے نہیں کی جاتی۔

"یہ یقین عمرہادی کی ذات سے منسلک ہے، جو تم جیسے پانے کی خواہش رکھتے شخص کی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

کتنا پُریقین مضبوط انداز تھا۔

یحییٰ نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا۔۔۔ پھر نحل کو۔

یحییٰ کے مقابلے میں بے حد عام سا شخص، نحل وقار کے حسین وجود کو ساکت کر گیا۔

اس نے دوبارہ نگاہ عمرہادی پر ڈالی جو نحل کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا اور بہت آہستگی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں قید کر گیا تھا۔ عمرہادی کے دل نے درد کا پردہ خود سے ہٹایا اور جھوم اٹھا "معافی بہت چھوٹا لفظ ہے، پھر بھی مانگتا ہوں تم سے۔

"محمل! اپنی بے حسی و بے اعتنائی پر۔" اس کی نگاہ ان آنکھوں کے سحر پر مرتکز تھی جیسے چھونے کی خواہش پل میں اس کے اندر پیدا ہوئی تھی مگر اس نے اپنی تمام تر شدت اپنے ہاتھوں میں دبے ان نازک ہاتھوں میں سمونے کی کوشش کی تھی۔

اور یہ ہی شدت محمل وقار کو زندہ کر گئی۔

"تمہیں پاگل بھی جا سکتا ہے عمر۔" دھیمے لہجے میں اک دھونس تھی' بے ساختہ مسکراہٹ عمر کے لبوں کو چھو گئی۔

زندگی سے بھرپور مسکراہٹ۔

"میں نے تو یہ ہی سمجھا کہ میں خود کو اوجھل کر کے تمہیں اذیت دینے سے بچالوں گا مگر یہ نہیں معلوم تھا اک اذیت ہمیشہ کے لیے خود لے لوں گا اور تمہیں ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا کر جاؤں گا۔ میں تمہیں ہنستے دیکھنا چاہتا ہوں تو فقط اپنے ساتھ' خوش حال چاہتا ہوں تو بھی اپنے ساتھ اور تمہیں روتے بھی اپنے لیے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔" ایسا شدید اظہار محمل کی تمام تر مزاحمتی طاقت کو روک گیا۔

وہ جو سوچتی تھی کہ عمر ہادی سے لڑے گی' خفا ہو گی اس پل بالکل خاموش سحر زدہ سی اسے سن رہی تھی۔

"آج مجھے معلوم ہوا کہ تم نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہ کی' کیونکہ تم اپنی محبت پر کامل تھیں' میری طرح کمزور نہیں' سب چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا۔ کچھ لوگوں کی بے حسی کا بدلہ تمہاری محبت سے لیا۔ محبت کے اس سفر میں جیت تمہاری اور تکمیل بھی تمہاری ہی ہے محمل وقار۔ عمر ہادی تو تم سے ہار گیا۔"

محمل ششدر رہ گئی۔

اسے بے ساختہ وہ مایوس کن زدہ شام یاد آئی۔ جب اس نے خود سے عزم لیا تھا کہ وہ مایوس نہیں ہو گی اور کامیاب بھی رہی' لیکن یہ بات صرف محمل کو ہی معلوم تھی' لیکن اس پل عمر ہادی کے لبوں سے اپنی ہار سن کر اسے محبت کے اس معجزے کا یقین ہو چلا۔

دلوں سے دلوں کا ربط محبت کا سلسلہ ہی رکھتا ہے۔

اسے یقین کامل ہونے لگا۔

اور اپنی ذات کا غرور حاصل کرنے والا شخص نہیں تھا عمر ہادی۔

یہ سوچ غلط تھی محمل وقار کی' کیونکہ اس پل اپنی ہی ذات کا جھکاؤ اس کے اس پل کتنا قریب تھا۔

فقط محبت کے سبب۔

نرم سی برف تلے محمل وقار کے سارے غم ڈھلنے لگے' وہ ہلکی نرم سی ہونے لگی۔

بے ساختہ عمر ہادی کو دیکھا جو بہت محبت و محویت سے اسے دیکھتا کھڑا اقرار کر رہا تھا۔

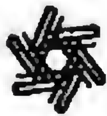
"میں نے تو ایک دیا جلا کر رکھا تھا عمر! محبت کے لوٹ آنے کے لیے ہی لیکن تم نے تو مجھے سیراب کر دیا۔" بے ساختہ ہی اسے دیکھا تھا یحییٰ نے' جس کے اظہار نے عمر ہادی کو روشن کر دیا تھا اور اس کی گھور سیاہ آنکھوں کی نمی نے بے چین بھی۔

"سیراب کیسے نہ کرتا محمل وقار۔ تم نے مجھے غلط جو ثابت کر دیا کہ انتظار کرنا واقعی ممکن ہے اور یہاں بھی کہ محبت روگ ہی نہیں دیتی مکمل بھی کرتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا انتظار انسان کو کمزور نہیں مضبوط کرتا ہے۔" عمر ہادی نے اپنی ذات کا اظہار اسے سونپا اور ساری نمی سمیٹ گیا۔

اس منظر میں محبت کی تکمیل کا لمحہ' بہت ہی خوب صورت تھا۔ خاموش و پشیمان سے یحییٰ نے بہت آہستگی سے قدم بڑھائے تھے اور جان لیا تھا کہ محبت واقعتاً "پانے" کا نام نہیں ہے اور تکمیل کا عمل بھی محبت کی ذات کے سبب ہے۔

اور اگر وہ بھی اپنی ذات کی تکمیل چاہتا تھا تو وجود ذات کا حسن نہیں' محبت کا حسن پہلی و آخری منزل ہے۔

کیونکہ تکمیل محبت ہی تکمیل ذات کا حصہ ہے۔





جس نے تیری آنکھوں میں شرارت نہیں دیکھی
وہ لاکھ کہے، اس نے محبت نہیں دیکھی

اک روپ مرے خواب میں لہرا سا گیا تھا
پھر دل میں کوئی چیز سلامت نہیں دیکھی

آئینہ تجھے دیکھ کر گلزار ہوا تھا
شاید تیری آنکھوں نے وہ رنگت نہیں دیکھی

خیرات کیا وہ بھی، جو موجود نہیں تھا
تو نے تہی دستوں کی سخاوت نہیں دیکھی

صد شکر گزاری ہے، قیامت تن تنہا
اس رات کسی نے میری حالت نہیں دیکھی

شاید اسی باعث وہ فروزاں ہے ابھی تک
سورج نے کبھی رات کی ظلمت نہیں دیکھی

شہزاد احمد

اس کے نام کی ہتھیلی پہ
رنگِ حنا لیے
بانہوں میں چوڑی کی کھنک ہے
آنکھوں میں ملن سے
سندر سپنوں کی دھنک ہے
پاؤں میں پائل کی جھنکار لیے
میں جھوم رہی تھی
دل میں جس کا انتظار لیے
وہ چاند تو
کسی اور آنگن میں اتر گیا
مجھے خبر بھی نہ ہوئی
دل میں ہلکا سا درد ہوا اور کاجل بکھر گیا

شبانہ یوسف



وہ سلسلۂ ہجر کا ابہام کیا ہوا
کوئی خبر کہ عشق کا الہام کیا ہوا

وہ جو گئے تھے دشت کی جانب باچشمِ نم
اُن تشنگانِ عشق کا انجام کیا ہوا

جلتے دیے کے ساتھ ہیں آنکھیں پڑی ہوئی
اے دانایانِ شہر یہ اِفہام کیا ہوا

اہلِ عزا نے پھاڑ دیے ماتمی لباس
آہ و بکاہ و گریۂ آلام کیا ہوا

اُٹھتی ہیں ٹیسیں آج بھی میرے وجود سے
اے کائناتِ ہجر یہ آرام کیا ہوا

کائنات احمد

وہ ایک شخص کہ باعث مرے زوال کا تھا
زمیں سے ملتا ہوا رنگ اس کے جال کا تھا

دل و نگاہ میں جھگڑا بھی منفرد تھا مگر
جو فیصلہ ہوا، وہ بھی بڑے کمال کا تھا

میں جان دینے کا دعوا وہاں پہ کیا کرتا
جو مسئلہ اسے درپیش تھا، مثال کا تھا

میں چاہتا تھا کہ وہ خود بخود سمجھ جائے
تقاضا اس کی طرف سے مگر سوال کا تھا

یہ اور بات کہ بازی اسی کے ہاتھ رہی
وگرنہ فرق تو لے دے کے ایک چال کا تھا

تمام عمر گنوا دی جسے بھلانے میں
وہ نصف ماضی کا قصہ تھا، نصف حال کا تھا

انعام الحق جاوید



نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس گھر میں مہمان آتے ہیں، اس میں بھلائی اس سے بھی زیادہ جلدی آتی ہے جتنی جلدی چھری اونٹ کے کوہان پر پہنچتی ہے۔"

(ابن ماجہ)

دعائے خیر،

ملک کی پارلیمنٹ کا اجلاس دعا سے شروع ہوا۔ اس دن وزیراعظم اپنے ساتھ اپنی ننھی نواسی کو بھی لے گیا۔ اجلاس کے خاتمے پر ننھی نواسی نے پوچھا۔
"ناناجان! یہاں یہ دعا کیوں مانگی گئی ہے؟"
ناناجان نے جواب دیا۔ "میری بچی! بس ہوتا یوں ہے کہ اجلاس شروع ہوتے ہی اسپیکر اسمبلی کے ممبروں پر نگاہ ڈالتا ہے اور ملک کی سلامتی کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔"

سونیا۔ جہلم

روشنیاں،

☆ اخلاص کوئی کاروبار نہیں، جہاں آپ کچھ دیں اور لیں بلکہ یہ تو ایک خوبصورت احساس ہے جہاں آپ بغیر کسی صلے کی امید کے، رشتے ہی نبھانا پسند کرتے ہیں۔

☆ انسان تب سمجھ دار نہیں ہوتا جب وہ بڑی باتیں بولنے لگے، بلکہ تب ہوتا ہے جب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنے لگے۔

☆ اندھیرے کو اندھیرا نہیں روشنی مٹاتی ہے۔ اسی طرح نفرت کو نفرت نہیں، پیار مٹاتا ہے۔

☆ خوشبو صرف ان ہاتھوں سے آتی ہے، جو پھول تقسیم کرتے ہیں۔

☆ مشکل کا مطلب ناممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب مزید اور سخت محنت ہوتا ہے۔

☆ یقین کی پختگی اور اخلاص کا حسن جس انسان میں آ جائے وہ ایک وقت میں خالق اور مخلوق کا محبوب بن جاتا ہے۔

فریحہ شبیر۔ شاہ نکڈر

علم کے موتی،

حجاج بن یوسف نے اپنے طبیب سے فرمائش کی کہ مجھے طب کی کچھ اچھی باتیں بتاؤ۔
طبیب نے کہا۔

※ گوشت صرف جوان جانور کا کھاؤ۔

※ جب دوپہر کا کھانا کھاؤ تو تھوڑا ٹائم سو جاؤ اور شام کا کھانا کھا کر چلو، چاہے تمہیں کانٹوں پر چلنا پڑے۔

※ جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو، دوسرا کھانا نہ کھاؤ، چاہے تمہیں تین دن ہی کیوں نہ لگ جائیں۔

※ جب تک بیت الخلا نہ جاؤ، سونے کے لیے بستر پر نہ جاؤ۔

※ پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ، جب موسم جانے لگے تو پھل کھانا چھوڑ دو۔

※ کھانا کھا کر پانی پینے سے بہتر ہے کہ زہر پی لو یا پھر کھانا ہی نہ کھاؤ۔

نائلہ۔ حیدرآباد

قابلِ دید

برنارڈ شا کے ڈرامے کے منیجر نے برنارڈ شا کو درجہ اول کے چھ عدد اعزازی پاس دیتے ہوئے کہا۔
"یہ پاس آپ شہر کے معززین کو اپنی طرف سے دیں۔ انہیں ضرور مدعو کریں تاکہ ہمارے ڈرامے کی نمائش کامیاب ہو جائے۔"
ان ہی دنوں برنارڈ شا کے گھر میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ چنانچہ برنارڈ شا نے منیجر کے چلے جانے کے بعد ٹھیکے دار کو بلا کر کہا۔
"یہ ڈرامے کے پاس ہیں۔ تم آج شام اپنے عزیزوں کے ساتھ جا کر اسے دیکھ لینا۔"
دوسرے دن ٹھیکے دار نے برنارڈ شا کو تعمیراتی کام کا بل دیا تو اس میں تین گھنٹے کا اوور ٹائم بھی درج تھا۔

عمیرا نوشین۔ منڈی بہاؤالدین

قیمت

ایک مرتبہ ایک دیہاتی کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک ہار ملا۔ دیہاتی نے ہار اٹھا لیا اور سوچا کیوں نہ یہ ہار میں اپنے گدھے کو ہی پہنا دوں۔ چنانچہ اس نے ہار گدھے کو پہنا دیا۔ اتفاق سے ایک جوہری کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے جونہی قیمتی الماس کا ہار گدھے کو پہنا دیکھا تو فوراً دیہاتی سے بولا۔
"بھائی! کیا آپ اس ہار کو فروخت کریں گے؟"
دیہاتی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ مجھے تو مفت میں ہی یہ ہار ملا ہے۔ میں پیسے ہی کھرے کر لیتا ہوں۔
دیہاتی نے جواب دیا۔ "جی ہاں میں یہ ہار فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اس ہار کی قیمت ایک ہزار اشرفی ہے۔"
دیہاتی کو کیا معلوم تھا کہ یہ اتنے قیمتی موتیوں کا ہار ہے۔ اس نے تو اپنے اندازے سے قیمت بتا دی اور دل ہی دل میں خوش ہوا۔
جوہری بہت چالاک تھا۔ قیمت سن کر کہنے لگا۔
"میں تمہیں پانچ سو اشرفیاں دوں گا۔"
جوہری کے یہ کہتے ہی ہار ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ جوہری بہت حیران ہوا اور اس نے ہیروں کے ذرّوں سے پوچھا۔
"تم کیوں بکھر گئے؟"
الماس کے ذرّے بہت دکھ سے بولے۔ "وہ تو ایک دیہاتی تھا کم عقل، جاہل۔ ان کو ہماری اوقات کا علم نہیں تھا لیکن تم تو جوہری ہو۔ جب تم نے سب جانتے ہوئے ہماری قیمت اتنی گرا دی تو کیا ہم پھر بھی سالم رہ سکتے تھے؟"

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

خوشامد

دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے لیکن کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے تو یہ خوشامد کہلاتا ہے۔

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

سزا

حسد کرنے والے کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جب آپ خوش ہوتے ہیں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

دیس دیس کی کہاوتیں

☆ نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر اٹھ جانا کمال ہے۔
(چینی کہاوت)
☆ نیند آدھی غذا کا کام دیتی ہے۔
(جرمن کہاوت)
☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔
(جاپانی کہاوت)
☆ مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔
(عربی کہاوت)
☆ پھول مرجھاتے ہیں لیکن کانٹے رہ جاتے ہیں۔
(برطانوی کہاوت)
☆ جو چیز شیر کو لومڑی بنا دیتی ہے وہ ضرورت ہے۔

(فارسی کہاوت)

مدیحہ فہمید۔ کراچی

بری مرچیں

"میرا بھائی دس سال سے وائلن بجانے کی مشق کر رہا ہے۔"

"اب تو بہت اچھا بجانے لگا ہوگا؟"

"زیادہ اچھا نہیں... دراصل نو سال تک مشق کے بعد تو جا کر اسے یہ پتا چلا کہ وائلن منہ سے نہیں بجایا جاتا۔"

"ذرا فین سن لینا۔"

"لیکن گھنٹی تو بجی نہیں۔"

"تم بھی ہر کام اس وقت کرتے ہو جب وہ سر پہ آن پڑے۔"

"تمہیں ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے۔"

"لیکن سر... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"اسی لیے تو برخاست کیا جا رہا ہے۔"

"اللہ کے نام پر چائے پینے کے لیے پچاس روپے دیتے جائیں۔"

"لیکن چائے پچاس روپے کی تو نہیں آتی۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن میرا دوستوں کے ساتھ پینے کا ارادہ ہے۔"

"تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے؟"

"میرے بھائی نے دکان کھولی تھی۔"

"کیسی چل رہی ہے؟"

"معلوم نہیں..."

"کیوں... بھائی سے ملاقات نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے، وہ چھ ماہ سے جیل میں ہے، اس نے ہتھوڑے سے دکان کھولی تھی۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

یقین

بچپن میں ــ یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ برس پیشتر گاؤں سے ہماری برادری کی ایک پھوپھی نود بی بی لاہور میں ہمارے گھر کام کاج کرنے آئی۔ وہ گھریلو ملازمہ تو نہ تھی۔ اگرچہ گھر کے سب کام کرتی تھی۔ تب اس مکان کی پہلی منزل پر ایک مختصر صحن تھا اور اس کی دیوار پر جانے کب سے پڑے کچھ گملے تھے جن کی مٹی خشک ہو چکی تھی۔ کبھی ان میں گل بوٹے ہوا کرتے تھے۔ پر اب وہ بے کار ہو چکے تھے۔ آپا جی نے انہیں اٹھوا دیا۔ صرف ایک گملا رہ گیا۔ کیونکہ وہ بہت بھاری تھا۔ دیوار سے اٹھایا نہ جا سکتا تھا۔

پھوپھی نود بی بی جب دوپہر ڈھلتی تو مجھ سے کہتی۔ "آؤ مستنصر! گملے کو پانی دیں۔"

وہ ایک ڈبے سے اس گملے کی خشک ہو چکی مٹی کو سیراب کر دیتی۔

میں پوچھتا۔ "نود بی بی! اس گملے کی مٹی خشک ہو چکی ہے، بنجر ہو چکی ہے۔ اسے کیوں باقاعدگی سے پانی دیتی ہو؟"

تو وہ ان پڑھ پھوپھی کہتی۔ "مستنصر! یہ میرے اور تمہارے درمیان ایک راز ہے، کسی کو نہیں بتانا۔ تم دیکھنا کسی نہ کسی دن اس کی مٹی میں سے ایک بوٹا پھوٹے گا اور اس میں سے ایک پھول کھلے گا۔ تم دیکھنا۔"

پھوپھی نود بی بی کو سب گھر والے پاگل سمجھتے تھے کہ وہ باقاعدگی سے اس گملے کی بنجر مٹی کو پانی دیتی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک سویر واقعی اس کشتِ ویران میں ایک بوٹا نمودار ہوا اور کچھ دنوں بعد ایک زرد رنگ کا پھول نمودار ہو گیا۔

پھوپھی نود بی بی کا سرخ و سپید چہرہ دمکنے لگا۔ "دیکھا مستنصر میں نہ کہتی تھی کہ ایک نہ ایک دن اس میں پھول کھلے گا۔"

(مستنصر حسین تارڑ۔ کارواں سرائے)



خالدہ جیلانی



نوال افضل گھمن ـــــــ گجرات

اگرچہ فیصلہ ہجر اختیار میں تھا
مگر وہ شخص مری ذات کے مدار میں تھا
سفر شناس! تجھے کون یہ خبر دے گا
دیا جلائے ہوئے کوئی انتظار میں تھا

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساس تنہائی بہت
اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے اپنی ذات سے
ہم نے اس دل سے لگانے کی سزا پائی بہت

ثمینہ تنویر ـــــــ ملتان

یقیناً ضبط ٹوٹا ہے، یقیناً تم بھی روئے ہو
ہوا میں جانی پہچانی نمی محسوس کی میں نے
تمہارے بعد دنیا میں ہوا میں اس قدر تنہا
تمہارے بعد اپنی بھی کمی محسوس کی میں نے

نمرہ اقرار ـــــــ کراچی

آئینے سچے تھے اور چہرے غلط
کس طرح سچائی کو لکھتے غلط

ارم کمال ـــــــ فیصل آباد

اک دربدری ہم کو لاحق ہے مگر ہم
کونجوں کی طرح شور مچایا نہیں کرتے
اس شہر کے ماحول کو کیا ہو گیا تابش
کچھ دن سے پرندے یہاں آیا نہیں کرتے

فرحت اشرف جٹ ـــــــ سیدوالا

جنوری کی سرد خنک شام میں
اس کا سرد لہجہ رلاتا ہی رہا
بے رخی سے رخ موڑ کر
وہ چلا گیا اور میں پکارتا ہی رہا

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں ہمیشہ امتحان میں رہتے ہیں
حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہل عشق تو سارے جہان میں رہتے ہیں

ثنا نثار ـــــــ بنگہ چیمہ

نہ باب حرف و صدا میں تھا نہ ماہ و سال میں تھا
جواب جس کا نہیں تھا وہ اس سوال میں تھا
میں زندگی کی طرح اس کی بات بات میں تھی
وہ روشنی کی طرح میرے خد و خال میں تھا

صبیحہ شوکت ـــــــ لاہور

گوشۂ آنکھوں کے دریچوں میں جو نم سا ہو گا
دل کی گہرائی میں رستا ہوا غم سا ہو گا
یاد آئیں جو کبھی ڈھونڈنا ویرانوں میں
ہم نہ مل پائیں گے شاید کوئی ہم سا ہو گا

عائشہ نور ـــــــ لاہور

نشاط جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں تم نے تجھے بھلا کے دیکھا ہے

مدیحہ سحر احمد ـــــــ کراچی

میں نفرتوں کے جہاں میں رہ کر
جفا کروں گا تو ٹھیک کروں گا
یہ ٹھیک کہتے ہیں بے وفا ہوں
وفا کروں گا تو کیا کروں گا

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

دوست بھی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں مجھے
میں سمجھتا تھا مرے یار سمجھتے ہیں مجھے
میں بدلتے ہوئے حالات میں ڈھل جاتا ہوں
دیکھنے والے اداکار سمجھتے ہیں مجھے

نبیلہ احسن ——— کراچی
وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کر جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

سعیدہ فرقان ——— لاہور
آنکھوں کو انتظار کے لمحات سونپ کر
نیندیں بھی کوئی لے گیا اپنے سفر کے ساتھ

عظمیٰ رحیم ——— ساہیوال
پتھر دل کے دیس میں تھا مجھ کو تنہائی کا غم
کیا خبر تھی راستے میں آئینہ مل جائے گا

صائمہ ظہیر ——— بہاولپور
تمام عمر تیرا انتظار کرلیں گے
مگر یہ رنج رہے گا زندگی کم ہے

ثناء عبدالقیوم ——— بنگر چیمہ
دل، نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

عذرا انور ——— میر پور خاص
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی میں نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

مدیحہ عمر ——— سکھر
ہم پھولوں کے دیس کے رہنے والے تھے
ہم کو کس نے شیشہ و سنگ میں جھونک دیا

سمیعہ ارشد ——— کمالیہ
رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

مدیحہ فہمید ——— کراچی
کرتے ہیں، میری خامیوں کے تذکرے کچھ اس طرح
اپنے عمل میں فرشتے ہوں جیسے لوگ

ندا فضہ ——— فیصل آباد
تھپکیاں دے کے سُلاتی ہے تیری یاد ہمیں
نیند جو رات کی آنکھوں سے خفا ہو جائے

صائمہ سندھو ——— اسلام آباد
منکشف ہوتی ہے ہر روز کوئی بات نئی
روز کھلتا ہے تیرا پیار بھی سازش کی طرح

اقصیٰ ناصر ——— کراچی
ترکِ محبت، ترکِ تمنا کر چکنے کے بعد
ہم پہ یہ مشکل آن پڑی ہے کیسے بھلائیں تمہیں
دل کے زخم کا رنگ تو شاید آنکھوں میں بھر آئے
روح کے زخموں کی گہرائی کیسے دکھائیں تمہیں

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ
دل میں وہ وہم و گماں نہ تھا تیری جدائی کا
اب حشر تک دید کو ترسیں گی میری آنکھیں
کون کہتا ہے مرہم ہے وقت ہر گھاؤ کا
قیامت تک رہ رہ کر برسیں گی میری آنکھیں

ثمرہ، اقراء ——— کراچی
درد کب تک سنبھال کر رکھیں
زخم ہوتے رہیں رفو کب تک
کوئی موسم تو ہو دل مہکائے
زندگانی ہو بے نمو کب تک

سانحہ ارتحال

معروف صحافی مصنف فلم ساز اور ہدایت کار علی سفیان آفاقی لاہور میں انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

علی سفیان آفاقی تقریباً" 60 سال سے صحافت سے وابستہ تھے۔ انہوں نے برصغیر کی فلمی دنیا کی پوری تاریخ بھی لکھی ہے۔ علی سفیان آفاقی ہماری مصنفہ آسیہ رزاقی کے کزن اور بہنوئی تھے۔ انہوں نے دو بیٹیوں اور بیوہ کو سوگوار چھوڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علی سفیان آفاقی کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے آمین۔

امت الصبور

خاتون کی ڈائری



کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ دلفریب غزل
ماریہ اعجاز اور عارفہ معین کے نام۔

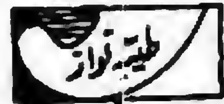
کب پاؤں فگار نہیں ہوتے کب سر پر دھول نہیں پڑتی
تیری راہ پر چلنے والوں سے مگر بھول نہیں ہوتی

سر کوچہ عشق آپہنچے ہو لیکن ذرا دھیان رہے
کوئی نیکی کام نہیں آتی یہاں کوئی دعا قبول نہیں ہوتی

ہر چند اندیشہ جاں ہے بہت لیکن اس کار محبت میں
کوئی پل بیکار نہیں جاتا کوئی بات فضول نہیں ہوتی

وصل کی آس بدلتے ہوئے تیرے ہجر کی آگ میں جلتے ہوئے
کب دل مصروف نہیں رہتا کب جاں مشغول نہیں ہوتی

اے رنگ جنوں بھرنے والو اے شب بیداری کرنے والو!
عشق وہ مزدوری ہے جس میں اجرت وصول نہیں ہوتی



کی ڈائری سے

جب زندگی پے در پے کانٹے ہمارے راستے میں بچھاتی ہے، تو پھر ایک لمحہ آتا ہے کہ ہمیں زندگی سے بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب خوشیاں دستہ بھول جاتی ہیں۔ زندگی سے مخاطب ایک پکار۔

جینے رہنے کی سزا دے زندگی اے زندگی
اب تو مرنے کی دعا دے، زندگی اے زندگی

میں تو اب اکتا گیا ہوں، کیا یہی ہے کائنات
بس یہ آئینہ ہٹا دے، زندگی اے زندگی

ڈھونڈنے نکلا تھا تجھ کو اور خود کو کھو دیا
تو ہی اب میرا پتا دے، زندگی اے زندگی

یا مجھے احساس کی قید سے کر دے رہا
ورنہ دیوانہ بنا دے، زندگی اے زندگی



کی ڈائری سے

محبت کسی طبقے کی میراث نہیں۔ اس کے لیے صرف ایک خاص ادا، سچا کھرا دل چاہیے ہوتا ہے۔ جو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن محبت کا اظہار مشکل ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو سلیم عباس قیصر نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

ضروری بات

ذرا ٹھہرو!
کہ تم سے اک ضروری
بات کرنی ہے ادھر آؤ
کہ رستے میں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا

یہاں بیٹھو
کہ باتیں تو ہمیشہ ہم تسلی سے ہی کرتے ہیں
ہمیں اس طرح مت دیکھو
نہیں تو ہم تمہارے سامنے
کچھ کہہ نہ پائیں گے
تو ہاں بس بات اتنی ہے
چلو چھوڑو
کبھی موقع ملا تو پھر بتائیں گے

طیبہ کی ڈائری سے

دکھ تو پھر دکھ ہوتے ہیں لیکن مقدر کی چالیں جو دکھ ہمیں دیتی ہیں، ہم ان کا مداوا نہیں کر پاتے۔
ایک خوبصورت نظم پڑھنے والوں کی نذر۔
کیا اندھیروں کے دکھ کیا اجالوں کے دکھ
جب برا دیں مقدر کی چالوں کے دکھ !!

جن کی آنکھیں نہیں، وہ نہ رو دیں کبھی
جان جائیں اگر آنکھ والوں کے دکھ

میری منزل کہاں ہے؟ کدھر ہمسفر؟
مار ڈالیں گے اب ان سوالوں کے دکھ

دو گھڑی کے لیے پاس بیٹھو ذرا
بھول جائیں گے ہم کتنے سالوں کے دکھ

میری سوچوں کے جلتے ہوئے دشت سے
چھین لے آ کے اپنے خیالوں کے دکھ

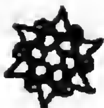
شبنم شمشاد کی ڈائری سے

کچھ لوگ محبت میں خود کو مٹا کر امر ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ رضی الدین رضی نے ایسی ہی خواہش کو لفظوں کا پیرا ہن دیا ہے۔ آپ سب کی نذر۔
اسے انجانے رستوں سے گزر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی
وہ کہتا تھا جیون تیرگی ہے
اور ہمیں اس تیرگی میں رنگ بھرنے ہیں روشنی کے

اور یہ ہم کو مختصر سے چند لمحے جو میسر ہیں
یہ لمحے ہمیں محبت سے آباد کرنے ہیں
کسی کو دور سے دیکھنا اور کسی سے بات کرنی ہے
جہاں یہ دن گزر جائیں، وہیں پر رات کرنی ہے
وہ کہتا تھا محبت کا کوئی موسم نہیں ہوتا
یہ ہر موسم کا جذبہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا
ادھوری سی محبت ہی ہے ہمیں تکمیل کرنی ہے
محبت کو نئے ڈھب سے بسر کرنے کی خواہش
اسے شب بھر جگاتی ہے
نہ جانے کون سی خواہش اسے ہر پل رلاتی ہے
شناسا سا تھا ہر ایک سے بہت انجان رہتا تھا
اسے ہر شخص کو حیران کر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم میری پسندیدہ ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔
آگ خرید کے لائی ہیں
آگ خرید کے لائی
دنیا داری قسمت ماری
شکلیں بدلے وارے
دل کی ایک نہ چلنے دے
اور شکلیں بدلے روز
عشق کے کاروبار میں پڑ کے
اچھا نفع کمایا
گھڑی گھڑی پل پل کر
اپنے دل کا ماس کھلایا
تن من دھن سب بیچ دیا اور
جا آگ خرید کے لائی ہیں
جا آگ خرید کے لائی
کوئل لینے گھر سے نکلی
کا آگ خرید کے لائی ہیں
کا آگ خرید کے لائی
آگ خرید کے لائی ہیں



معروف فنکار

شہریار منور سے ملاقات

شاہین رشید

شہریار منور نے بہت کم ڈراموں میں کام کیا ہے مگر اپنی اچھی پرفارمنس سے ناظرین کے پسندیدہ آرٹسٹ بن گئے ہیں۔ پھر کمرشلز بھی ان کی شہرت کا باعث بنے ہیں۔ "آسمانوں پہ لکھا اور زندگی گلزار ہے" میں ان کی پرفامنس بہترین تھی۔ شہریار منور سے انٹرویو کرنے کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑی مگر آخر کار کامیابی ہو ہی گئی۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج ٹائم ہے؟"

"بالکل جی۔ آپ بات کریں۔"

"آسمانوں پہ لکھا" کے وقت سے آپ سے ٹائم مانگ رہی ہوں۔"

"جی جی۔ مجھے معلوم ہے۔ سوری مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ ٹائم نہ دے سکا۔ خیر اب فارغ ہوں۔"

"کیا مصروفیت ہیں آج کل؟"

"بس جی۔ آپ سب سمجھتی ہیں کہ ایک فنکار کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔ بس میری بھی وہی مصروفیات ہیں۔ کچھ انڈر پروڈکشن ڈرامے، کچھ کمرشلز۔"

"گڈ۔ بہت کم عرصے میں آپ ناظرین کے پسندیدہ فنکار بن گئے ہیں۔ قسمت کی مہربانی سے یا اپنی محنت سے؟"

"میرے خیال میں دونوں کی مہربانی سے ہی انسان ترقی کرتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو میں نے اپنی محنت سے مکمل کیا اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوا۔"

"کچھ بتائیں گے کہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"سب کچھ بہت آسانی سے ہو گیا۔ اس فیلڈ میں آنے کے لیے بہت زیادہ جدوجہد تو کرنی نہیں پڑی۔ شوبز میں کام کرنے کا ہمیشہ سے شوق تھا مگر وہی بات کہ گھر والوں نے خصوصاً" والدین نے کہا کہ بیٹا جی پہلے آپ تعلیم مکمل کریں پھر اپنے شوق کو پورا کریں۔ اے کرکے اپنی تعلیم میں مگن ہو گیا۔ لیکن جب آئی بی اے سے بیچلر کر رہا تھا تو ایک آفر آئی۔ سوچا کر لیتے ہیں۔ بس پھر تھوڑا تھوڑا شوق پورا ہوتا رہا۔"

"پھر باقاعدہ اس فیلڈ کو کب جوائن کیا۔"

"2012ء میں باقاعدہ جوائن کیا۔ 2012ء میں میرا گریجویشن مکمل ہوا تو ملک سے باہر جاکر ماسٹرز ڈگری لینے کی خواہش ہوئی، لیکن اس دوران ڈرامہ سیریل "میرے درد کو جو زبان ملے" میں کام کرنے کی آفر آگئی۔ سوچا اسے کرلوں پھر باہر جاؤں گا۔ مگر پھر اس میں کامیابی نے میرے قدم روک لیے اور میں نے اس فیلڈ کا انتخاب کرلیا کہ اب سے ہی پروفیشن بناؤں گا۔"

"اور ماسٹرز کرنے کا خواب؟"

"وہ بھی پورا ہوگا ان شاء اللہ، بس تھوڑی سی فراغت مل جائے مجھے۔"

"پہلے ڈرامے کا کیا رسپانس ملا تھا؟"

"اچھا رسپانس ملا تب ہی تو حوصلہ افزائی ہوئی۔ پہلی ناکامی انسان کو مایوس اور پہلی کامیابی انسان کو بہادر بنا دیتی ہے۔ تو جب سب نے تعریف کی، مزید آفرز بھی آئیں ڈراموں کے لیے بھی اور کمرشلز کے لیے بھی تو بس پھر اس فیلڈ کے ہو رہے۔"

"فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟"



"بہت زیادہ نہیں۔ تھوڑی بہت مشکلات سے تو میں بھی گزرا مگر میرے والدین کی تربیت ایسی تھی کہ میں مشکلات سے گھبرایا نہیں اور مشکلات ایسی نہیں کہ مجھے کام کے لیے کسی کی منت سماجت کرنی پڑی ہو' بلکہ مشکلات سے مراد یہ کہ نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں ذرا مشکل پیش آئی۔"

"آسمانوں پر لکھا" آپ کا بہترین سیریل تھا۔ بہت زیادہ تعریف ہوئی یا صرف تعریف ہوئی؟

"آسمانوں پر لکھا" ایسا ڈراما سیریل تھا کہ جس نے مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ بہت زیادہ تعریف ہوئی' بہت زیادہ پذیرائی ملی اور بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ بہت لکی ثابت ہوا یہ سیریل میرے لیے۔"

"تنقید ہوئی تو؟"

"ظاہر ہے دل ٹوٹ جاتا لیکن اگر تنقید پوزیٹو ہو تو پھر ضرور سوچتا ہوں کہ ہاں کہنے والا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی جز کریا مجھے ستانے کے لیے تنقید کرے تو پھر میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔"

"اکثر فنکار قناعت پسند ہوتے ہیں' جو مل رہا ہے ٹھیک ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے۔ قناعت پسند ہیں؟"

"میں دوسرے معاملات میں قناعت پسند ہوں مگر کام کے سلسلے میں اپنے آپ کو محدود کرنے کا قائل نہیں۔ میری نظر ہمیشہ آگے بڑھنے اور کچھ نہ کچھ کرنے پر ہوتی ہے۔ میں بلندیوں پر نظر رکھتا ہوں اور بلندیوں کو چھونا چاہتا ہوں۔"

"فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"بہت آگے' مگر مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اگلے لمحے کا بھروسا نہیں ہے تو پلاننگ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ بس خواہش ہے کہ لائف میں بہت آگے تک جاؤں۔"

"لوگ بہت پسند کرتے ہیں آپ کو۔ شہرت پاکر کیسا محسوس کرتے ہیں آپ؟"

"کہا ہے نا' مجھے شہرت سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے کبھی اس کو اپنے اوپر طاری نہیں کرتا۔ نہ حلوی کرتا ہوں کیونکہ جب ہمارا انداز بدلتا ہے تو پھر لوگوں کا انداز بھی بدلتا ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔ بس اللہ تعالیٰ عجز و

انکساری کے ساتھ ہی رکھے۔ (آمین)"
"فلم بھی تو کر رہے ہیں آپ؟"
"جی جی۔ فلم "کم بخت" تو ریلیز ہونے کو ہے بہت جلد۔ اور دوسری کی شوٹنگ جاری ہے۔ بس دعا کریں کہ کامیاب ہو جاؤں اور لوگ پسند کریں۔"
"میڈیا آزاد ہے آپ کے خیال میں؟ اور اگر ہے تو کیا یہ اچھی علامت ہے؟"
"میڈیا کا آزاد ہونا بہت اچھی علامت ہے مگر آزادی کا غلط استعمال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ ہر بات کو منفی لینا یا اپنے ملک کی برائیاں کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ اس طرح دوسرے ملکوں میں ہماری بدنامی ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم لوگوں کو پوزیٹو چیزیں دکھائیں اور اپنے ملک کی عزت بڑھائیں۔"
"ڈراموں کے سلسلے میں کیا کہیں گے بہتر ہوئے ہیں یا ابھی بھی گنجائش ہے۔"
"گنجائش تو ہر چیز میں رہتی ہے۔ ہمارے ڈرامے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہو جائیں ان میں بہتری کی گنجائش تو رہے گی۔ ویسے اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمارے ڈرامے ہمیشہ سے اچھے تھے اور اچھے ہیں اور مزید اچھے ہی ہوں گے۔"
"کردار کس طرح کے کرنے کی خواہش ہے؟"
"وہی جو اس ایج کے لڑکوں کو ہوتی ہے۔ (قہقہہ) کردار وہ ہی کرنا چاہوں گا۔ جس میں کچھ کرنے کو ہو۔ ہر طرح کے کردار کرنا چاہوں گا مگر ان میں ایک چیلنج ہو۔ پاور فل ہو 'لوگ یاد رکھیں۔ جیسے آسمانوں پر لکھا میری پہچان بنا ہے۔ چاہوں گا کہ ہر ڈراما میری پہچان بنے۔"
"کردار لیتے وقت کیا دیکھتے ہیں۔ ڈائریکٹر 'رائٹر یا کاسٹ یا صرف کردار؟"
"صرف کردار سے کام نہیں چلتا 'جب تک ڈائریکٹر اچھا نہ ہو۔ اگر ڈائریکٹر کمزور ہو گا تو وہ آپ کے پاور فل کردار کو بھی کمزور کردے گا اور ڈائریکٹر اچھا ہو گا تو آپ کا مضبوط کردار اور بھی زیادہ ابھر کر سامنے آئے گا۔ ویسے بھی ڈراما ایک ٹیم ورک ہوتا ہے اس لیے سب کو دیکھتا ہوں۔"
"گڈ۔ چلیں کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"
"جی 9 اگست 1988ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ اور اس لحاظ سے میرا ستارہ لیو ہے۔ اسلام آباد کے ایک اسکول سے 'او لیول کیا' پھر ساؤتھ اسکول سے اے لیول کیا' اور پھر آئی بی اے کراچی سے گریجویشن کیا۔"
"آئی بی اے میں تو وہ ہی طالب علم جاتے ہیں جو پڑھنے میں تیز ہوتے ہیں آپ بھی تیز تھے یا لگ کے کام کیا؟"
"نہیں جی۔ پڑھائی میں لگ کے کام نہیں کرنا' محنت کام کرتی ہے اور ماشاء اللہ میں واقعی بہت اچھا طالب علم تھا اور ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوا ہوں۔"
"والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتائیں کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"
"ہمارا تعلق جناب سیہون شریف سے ہے۔ والدہ کا تعلق قلات سے ہے۔ میری والدہ صفیہ منور فلورل آرٹ سوسائٹی آف پاکستان کی وائس پریزیڈنٹ ہیں اور میرے والد منور عالم صدیقی ایئر فورس پائلٹ رہ چکے ہیں۔ آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا بزنس کر رہے ہیں۔ انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ امتیاز اور ستارہ امتیاز مل چکا ہے۔ ہم تین بھائی تھے' ایک بھائی جو مجھ سے بڑے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔"
"تمغہ امتیاز اور ستارہ امتیاز پانے والے والے کے بیٹے ہیں۔ فخر تو بہت ہوتا ہو گا؟"
"جی بہت زیادہ۔ اور یہ ہی کوشش ہوتی ہے کہ جو مقام انہیں حاصل ہوا ہے' اللہ تعالی ہمیں بھی عطا کرے۔ میری والدہ بھی ہمارے لیے بہت قابل فخر ہیں۔"
"دونوں عملی زندگی میں بہت مصروف رہے۔ آپ کو کوئی شکایت ہوئی اپنے والدین سے؟"

"بالکل بھی نہیں۔ باوجود مصروفیات کے ہمارے والدین نے ہمیں بھرپور ٹائم دیا اور وہ کہتے ہیں ناکہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر سے" تو ہمارے والدین نے بھی ایسا کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم ان کی تربیت کی وجہ سے زمانے کی اونچ نیچ اور اچھائی برائی سے پوری طرح آگاہ ہیں اور عملی زندگی میں کامیاب ہیں۔

"شادی کے کب ارادے ہیں؟"

"یہ تو اوپر والے کی مرضی ہے' جب نصیب میں ہوگا ہو جائے گی۔ جب اپنی ہم مزاج مل جائے گی تو شادی بھی ہو جائے گی۔"

"والدین کی کوئی ایسی بات جو پہلے بچپن میں تو اچھی نہیں لگتی تھی مگر بڑے ہونے کے بعد اچھی لگنے لگی۔"

"بچپن سے ہی والدین نے جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت ڈالی۔ بچپن میں یہ بات بری لگتی تھی کہ ہم اپنی مرضی سے نہ سو سکتے ہیں نہ اٹھ سکتے ہیں مگر اب اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک اچھی عادت تھی۔ سب کام وقت پر کرنا اچھا لگتا ہے اور والدین کی تربیت کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ انہوں نے میری اتنی اچھی تربیت کی کہ مجھے اب زندگی کے کسی بھی موڑ پر مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

"مطالعہ کا شوق ہے؟"

"بالکل ہے۔ انگریز ادیبوں کو پڑھا ہے۔ پاکستانی ادیبوں کو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نام سب کے سنے ہوئے ہیں۔"

"غصہ آتا ہے؟ اور فیصلہ دل سے کرتے ہیں یا دماغ سے؟"

"جی ہاں۔ بالکل آتا ہے اور ردعمل کیا ہوتا ہے۔ زیادہ اظہار کا طریقہ آتا نہیں ہے۔ بس تلملا کر رہ جاتا ہوں اور غصہ آتا بھی ہے تو جھوٹ پر اور لوگوں کی منافقت پر آتا ہے۔ فیصلہ کرتے وقت دماغ سے کام لیتا ہوں مگر کبھی کبھی دل کی بھی مان لیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔"



"شاپنگ کا شوق ہے؟ اکیلے یا فیملی کے ساتھ؟"

"شوق ہے۔ اور اکیلے شاپنگ کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور بس جو چیز پسند آتی ہے خرید لیتا ہوں۔"

"کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا؟"

"گھر کا بھی پسند ہے اور باہر کا بھی۔ اب تو زیادہ تر باہر سے ہی کھانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر شوٹ پر ہوتا ہوں اور گھر میں ہوتا ہوں تو پھر گھر کا ہی کھانا پسند کرتا ہوں۔"

"خود بھی پکا لیتے ہیں۔ اور کیا پسند ہے کھانے میں؟"

"بہت مجبوری ہو کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں کچھ نہیں مل رہا تو پھر کچھ نہ کچھ پکا کر پیٹ بھر لیتا ہوں۔ ویسے ایسا موقع کبھی آیا نہیں۔ ویسے میں پاستا اور چکن بہت اچھی پکا لیتا ہوں۔ اور پسند تو مجھے دیسی اور بدیسی سب ہی کھانے ہیں۔"

"گھر والوں کو کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"اف۔ یہی تو شکوہ ہے گھر والوں کو مجھ سے کہ میں انہیں ٹائم نہیں دیتا۔ کیا کروں ٹائم ہی نہیں ہوتا میرے پاس۔ آج کل دن رات ڈراموں اور فلم کی شوٹ میں مصروف ہوں۔"

"اپنی کامیابی میں فیملی کے کس بندے کو کریڈٹ دیں گے؟"

"اپنے والدین کو۔ اور والدین میں اپنی ماں کو۔ ان کی دعاؤں کی بہت سپورٹ رہی مجھے۔"

"کھیلوں سے کتنی دلچسپی ہے؟"

"بہت ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ کہ جس کھیل سے دلچسپی ہے وہ کھیلتا ہوں مگر دیکھتا نہیں اور جو دیکھتا ہوں وہ کھیلتا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے اسکواش کھیلنے کا شوق ہے اور کھیلتا بھی ہوں لیکن دیکھتا نہیں ہوں۔ اس طرح کرکٹ دیکھتا ہوں مگر کبھی کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"سالگرہ مناتے ہیں؟"

"بالکل مناتا ہوں اور مجھے سالگرہ منانا اچھا لگتا ہے۔ اور جب دوست احباب میری سالگرہ منائیں تو مجھے اور بھی زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"گھر سے نکلتے وقت کیا لے جانا نہیں بھولتے؟"

"ماں کی دعائیں اور سیل فون' والٹ اور کارڈز وغیرہ"

"فیس بک سے دلچسپی ؟ایس ایم ایس کے جواب دیتے ہیں؟"

"ای میلز چیک کرتا ہوں۔ فیس بک کے لیے ٹائم نہیں ملتا اور ایس ایم ایس کرنے کے بجائے فون کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ کون ایس ایم ایس ٹائپ کرے۔ بہتر ہے کہ بندہ بات ہی کرلے۔"

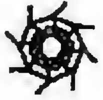
"اسمارٹ رہنے کے لیے جم یا ڈائٹنگ؟"

"جم جانا بہتر ہے۔ ڈائٹنگ نہیں کرتا۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"ہاں جی۔ چاہتا ہوں کہ اس ملک سے غربت کا خاتمہ کردوں لیکن یہ سب کچھ میرے اختیار میں نہیں۔ میں محبت لینے اور دینے والا انسان ہوں۔ چاہتا ہوں کہ سب ایسے ہو جائیں۔ کیونکہ دنیا سے جانے کے بعد آپ کا اچھا عمل ہی لوگوں کو یاد رہے گا اور اپنے والدین سے محبت کریں اور ایثار و قربانی کا جذبہ ان سے سیکھیں۔"

اور اس کے ساتھ ہم نے شہریار منور سے اجازت چاہی۔



خبریں وبریں

واصفہ سہیل

ناشتا

یونی ورسٹی آف لندن کے مطابق ناشتا نہ کرنے والے بچوں میں ذیابیطس ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ برطانوی ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ بچے جو صبح اٹھنے کے بعد ناشتا نہیں کرتے ان کی نہ صرف اسکول میں کارکردگی متاثر ہوتی ہے بلکہ ان کو ذیابیطس ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ناشتا نہ کرنے والے بچوں میں شکر کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور ان میں جارحانہ رویہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کو صبح ناشتا کرنے کی عادت ضرور ڈالیں۔

مداح

صبا قمر فلموں سے ٹی وی ڈراموں کی طرف آئیں تو اپنی عمدہ اداکاری اور پھر "ہم سب امید سے ہیں" میں کامیڈی کر کے چھا سی گئیں۔ اب دوبارہ وہ فلم کی طرف گئی ہیں تو کہتی ہیں کہ ان کے مداحوں کو فلموں میں ایک الگ ہی صبا قمر نظر آئے گی۔ (جی! وہ آپ کا آئٹم سونگ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ "کتنی" الگ نظر آ رہی ہیں۔) صبا نے کہا کہ ڈراما سیریل مات کے کردار نے مجھے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ میں نے اس سے پہلے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اتنی مقبولیت حاصل کر لوں گی۔ (جی فلم میں آپ اسی شہرت کو زوال کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔)

کامیڈی کے حوالے سے صبا قمر کا کہنا ہے کہ "ویسے تو کسی کو ہنسانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے لیکن مجھ سے کامیڈی خود بخود ہو جاتی ہے۔" (اور کیا خوب ہوتی ہے۔) صبا کا مزید کہنا ہے کہ میرے آئٹم سونگ کو



پذیرائی مل رہی ہے۔ (جی۔ کیا کہا؟ پذیرائی۔۔؟) اور اب ان کے مداح انہیں الگ روپ میں دیکھنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ (آئٹم سونگ کے بعد بھی الگ روپ اللہ خیر!)

خواہش

علی ظفر کہتے ہیں میں ایسی فلمیں بنانا چاہتا ہوں جو پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر نمائندگی کر سکیں۔ میں نے بھارت میں کام کر کے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہاں سے حاصل کیے تجربے کو میں پاکستانی فلم انڈسٹری کے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لیے بہت جلد اپنی ذاتی فلم شروع کرنے والا ہوں۔ جس کے لیے ان دنوں انڈسٹری کے نمایاں لوگوں کے ساتھ ساتھ نوجوان رائٹرز (یقیناً "ہماری ہی رائٹرز



ہوں گی) سے، ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ہمارے پاس بہت خوب صورت کہانیاں اور لکھنے والے موجود ہیں۔ جن کے ذریعے میں پاکستان کا خوب صورت چہرہ پوری دنیا میں متعارف کرواؤں گا۔ (کاش ایسا ہو!)

وجہ

عمران خان اور ریحام خان کی شادی کی خبر تو ہم آپ کو پہلے ہی دے چکے ہیں کب کچھ رہا بھی نہیں ہے ان دونوں کے بارے میں بتانے کو کہ اچانک ہمیں ایک اور خبر مل گئی۔ آپ کو کیوں نہ بتائیں۔ تو جناب! ہوا یوں کہ ریحام سے اپنی شادی کے بارے میں عمران خان نے کہا کہ "بے چاری ریحام دو دو نوکریاں کرکے اپنے تینوں بچوں کی پرورش کرتی ہے" (کیا شادی کرنے کی یہ وجہ تھی؟!) اب حقیقت کچھ یوں ہے کہ "بے چاری" ریحام کے سابقہ شوہر نے (اعجاز خان جو کہ ایک سائیکاٹرسٹ ہیں) ریحام کو شادی کے بعد پڑھایا لکھایا اور نوکری کی اجازت بھی دی۔ (دوسرے معنوں میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری۔) انہوں نے طلاق کے وقت انہیں ڈیڑھ کروڑ پاکستانی روپے ادا کیے اور بچوں کے ماہانہ اخراجات کے لیے تین ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ (یعنی ساڑھے چار لاکھ پاکستانی) ادا کرنے کے پابند ہیں۔ (واضح رہے کہ "بے چاری" ریحام کے تینوں بچے لندن میں رہتے ہیں۔) اعجاز خان کی لندن کی جائیداد میں سے ایک قیمتی مکان بھی انہیں ملا ہے اور جب "بے چاری" ریحام پینسٹھ سال کی ہوں گی تو انہیں برطانوی سوشل سیکورٹی کے محکمے سے بھاری پنشن بھی ملے گی۔

عمران خان نے سانحہ پشاور کی وجہ سے شادی سادگی سے کرنے کا اعلان کیا اور واقعی شادی میں عمران خان کی بہنیں اور تحریک انصاف کے صف اول کی قیادت میں سے کوئی شریک نہ ہوا۔ دولہا کی شیروانی صرف پچاس ہزار کی اور دلہن کا سوٹ ڈیڑھ لاکھ اور میک اپ بھی صرف پچاس ہزار کا تھا۔ اور دلہن کا دولہے کا سوٹ بس ایک لاکھ کا تھا۔ دلہن نے جو ڈائمنڈ کا سیٹ پہنا وہ بھی بس لاکھوں کا ہی تھا۔ زیادہ کا نہ تھا۔ اس طرح عمران خان نے ایک "بے چاری مطلقہ عورت" سے "انتہائی سادگی" کے ساتھ شادی کی۔ جس میں دلہن دولہا انتہائی خوش اور خوب صورت لگے۔



پذیرائی

کہنے والے نجانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں۔ "رابعہ زندہ رہے گی" کی ہیروئن مونالیزا (ارے بھئی اپنی سارہ لورین) کہتی ہیں کہ وہ قدرتی خوب صورتی کی حامل ہیں (جیسے ہم تو جانتے ہی نہیں۔) اور یہ کہ اسکرین پر پرکشش نظر آنے کے لیے انہیں کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑتی۔ (بس بوٹوکس اور دیگر سرجریز۔۔۔!) سارہ لورین مزید کہتی ہیں کہ بھارت میں میری فنکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے مجھے بھرپور پذیرائی ملی (جی۔ جب ہی 2010ء سے اب تک آپ صرف دو فلمیں ہی کر سکیں۔) "مزدور تھری میں میری آواز کی کوالٹی اور مکالموں کی ادائیگی سے فلم بین اور ناقدین بہت متاثر ہوئے (مونا! وہ فلم ہم نے بھی دیکھی تھی۔) کسی بھی نئی لڑکی اور خاص کر پاکستانی اداکارہ کے لیے بھارتی فلم انڈسٹری میں نام اور مقام بنانا آسان نہیں' یہ بہت بڑی بات ہے کہ میں نے بھارتی فلم میں اہم کردار ادا کیا جو آج سے پہلے کسی پاکستانی اداکارہ نے نہیں کیا (اچھا تو پھر کون سا تمغہ دیا جائے آپ کو؟)

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ مغرب کا اپنا حال تو یہ ہے کہ کہہ دیا جائے کہ ہٹلر نے 60 لاکھ یہودی نہیں مارے تھے' دو چار کم کر لو تو سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ یہ تو تاریخ کا معاملہ ہے جبکہ ہمارے ہاں تو مذہب کا معاملہ ہے۔

(شہر آشوب۔۔۔ سجاد میر)

☆ سانحہ ٹمبر مارکیٹ کے حوالے سے ایک سوال کہ آدھا کلو میٹر دور سے فائر بریگیڈ کی گاڑی آخر دو گھنٹے تاخیر سے کیوں پہنچی؟ کیا الزام دھرنا اور بہانے بنانا ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے لیکن سانحات کے اصل محرکات اور ان کے تدارک کا کوئی واضح طریقہ کار سامنے نہیں آپاتا۔

(جسارت)



☆ فرانس کی ایک پارٹی نیشنل فرنٹ کے سابق سربراہ اور بانی جین لی پین کا کہنا ہے کہ پیرس میں چارلی ہیبڈو پر حملہ امریکی' اسرائیلی خفیہ اداروں کی کارروائی ہے اور یہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔

جین لی پین نے یہ بھی کہا کہ حملے کے بعد جو لاکھوں لوگ جمع ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں چارلی ہوں۔

یہ چارلی نہیں چارلی چولن تھے۔

(روزنامہ۔۔۔ امت)



سرورق کی شخصیت

ماڈل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ علینہ

میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موسیٰ رضا



آپ کا باورچی خانہ

دولت مومو

(1) ہمارے ہاں تو بس کھانا ہی پکتا ہے۔ کون سی پسند اور کہاں کی نفاست ہے۔ اور شاید ہمارے یہاں کسی کو خاص فرق بھی نہیں پڑتا۔ چونکہ ہم نے گھر میں ہر ایک کو بس ہر دم کھاتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ اور شاید ہمارے یہاں کا واحد اصول بھی یہی ہے۔

(2) ہمارے یہاں تو ہر دم مہمانوں کا موسم ہی رہتا ہے۔ ابھی سانس بحال ہوئی نہیں کہ پھر سے کوئی مہمان ٹپک پڑتے ہے۔ اور اکثر گھر میں کچھ خاص ہوتا بھی نہیں ہے۔ تو پھر ہم گھر کی لڑکیاں تیزی سے دماغ چلا کر نئی نئی ایجاد کرواتے ہیں۔ ایک بار اچانک ہی سہ پہر میں مہمان آ گئے تھے۔ گھر میں اس وقت پرانی ڈبل روٹی اور کچھ بیسن پڑا تھا تو یہ مزے دار ڈش ایجاد ہو گئی تھی۔ آپ بھی آزمایئے گا۔ نام بھی اس کا ہم نے خود ہی منتخب کر لیا۔

چسکہ بریڈ پکوڑا

اشیا :

ڈبل روٹی کے سلائس	6 ، 7 عدد
بیسن	آدھی پیالی
زیرہ	تھوڑا سا
پسی سرخ مرچ	حسب پسند
نمک	حسب ضرورت
کلونجی	دو چٹکی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

سب سے پہلے بیسن لے کر اسے ایک پیالے میں ڈال لیں اور پانی میں گھول لیں۔ اب نمک، سرخ مرچ پسی ہوئی، زیرہ اور کلونجی ملا کر ایک طرف رکھ دیں۔

اب بریڈ کے ایک ٹکڑے کے چار ٹکڑے کاٹ لیں اور بیسن کے گھول میں بھگو کر گرم تیل میں تلنے کو ڈال دیں۔ سنہری ہونے پر نکال لیں۔ یہ بہت مزے کے بنتے ہیں اور سردی کے موسم میں اس میں لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ساتھ میں املی کی چٹنی بنا لیں۔ یہ سالگرہ وغیرہ پر بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

جب ہم نے مہمانوں کو یہ ڈش کھلائی تھی۔ تو وہ حیرت سے پوچھتے تھے کہ ڈش اتنی عمدہ ہے کیسے بنائی ہے اب ہم کیسے بتاتے یہ باسی ڈبل روٹی اور تھوڑے سے بیسن کا کرشمہ ہے۔

(3) جی ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے۔

ہمارے یہاں باورچی خانے کی صفائی ساتھ ساتھ بھی ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر کسی وقت کچن خالی نظر آئے۔ تو پھر سرف ڈال کر فرش کی رگڑائی کی جاتی ہے۔ (لوگوں کی چہل پہل کچھ زیادہ ہی ہے نا) اور سنک 'سلیب' اوون 'شیلف وغیرہ کی صفائی کا معاملہ بھی ساتھ ہی ساتھ چلتا رہتا ہے۔

(4) صبح کا ناشتا ہمارے ہاں ایک نہایت ہی اہم اور لازمی امر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے صبح ہی صبح مختلف اقسام کی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہی رہتی ہیں۔ چونکہ ہمارے یہاں سب کو خوب ڈٹ کر کھانے کا تو شوق ہے ہی ساتھ ہی ساتھ کچھ نہ کچھ پکاتے رہنے کا بھی اک جنون سا ہے۔ اسی لیے صبح ناشتے کی میز پر کبھی آلو کے پراٹھے 'نان کلچے 'مسالے والی کلیجی 'مکس سبزی بھاجی' آلو کی اچاری بھجیا 'قصوری میتھی والے آلو کی بھاجی' ٹماٹر پیاز کی بھاجی 'تلے ہوئے انڈے' جام 'شہد 'مکئی روٹی 'ساگ 'میدے کی پوری تمار روٹی 'حلوہ جات 'ابلا انڈہ 'دودھ سویاں 'ڈبل روٹی وغیرہ وغیرہ۔ موجود ہوتے ہیں۔

یہ ڈش اکثر بنتی ہے اور ناشتے میں ہمارے ہاں بہت کھائی جاتی ہے۔

ابلے آلو کی اچاری بھاجی

اشیا:

ابلے آلو	3 سے 4 عدد
پیاز چھوٹی	1 عدد
لہسن	3 جوے
نمک	حسب ضرورت
پسی سرخ مرچ	حسب ذوق
اچاری مسالے کے لیے	
رائی دانہ	2 چٹکی
میتھی دانہ	دو چٹکی
کلونجی	تین چٹکی
سونف	2 چٹکی
اجوائن	دو چٹکی
گرم مسالا	حسب پسند
ہری مرچ	2 عدد
آم کا اچار	2 ٹکڑے (ضروری نہیں ہے)
تیل	3 کھانے کے چمچ

سب سے پہلے آلوؤں کو ابال کر چوکور شکل میں کاٹ لیں۔ اب اک دیگچی میں اچاری مسالے کی تمام اشیا ڈال کر تھوڑا سا بھون لیں تھوڑے تیل میں۔ اور پھر ابلے آلو کے ٹکڑے ڈال کر 4 سے 5 منٹ پکا کر آخر میں لہسن اور آم کا اچار ڈال کر کچھ دیر دم پر لگا دیں۔ اچاری آلو تیار ہیں۔

(5) آئے روز باہر نکلنے اور کھانے پینے کے پلان بنتے تو ہیں۔ مگر ہائے رے اگر ممکن تب ہی ہو پاتا ہے۔ جب کوئی مہمان ہمارے یہاں رہنے آتا ہے۔

(6) موسم کو بہ نظر رکھتے ہوئے جو کچھ پکا کر کھایا جاتا ہے۔ تب تو ہر کھانے کا مزا ہی دوبالا لگتا ہے۔ جب گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ تب کڑھی دال چاول 'آم کے اچار کے ساتھ 'لسی وغیرہ اور موسم سرما میں ساگ 'مکئی کی روٹی کے ساتھ زردہ یا متنجن 'مرغی کے چٹ پٹے تکے اور پیاز والی روٹی (ہ)مونی کے ہاتھ کی ہو تو کیا بات

(7) میں نے بتایا نا کہ ہمارے ہاں۔۔۔ ہر چیز کا سب کو جنون کی حد تک شوق ہے تو ظاہر ہے۔۔۔ کھانا کھانا تو ہے ہی۔۔۔ مگر پکانے کے لیے تو ہر چھوٹا بڑا۔۔۔ میدان میں کود پڑتا ہے اور اپنی جان لڑا دیتا ہے۔

(8) میٹھا سوڈا کچن میں ضرور رکھ لیں۔ یہ بڑا فائدہ مند رہتا ہے۔ کچن میں جمی چولہے کی چکنائی ہو یا سلیب کی۔ یا پھر سنک بند ہو جائے اس کو کھولنے کے لیے کافی کارآمد شے ہے۔۔۔ تھوڑا سا میٹھا سوڈا گرم پانی میں گھول لیں۔ جمی چکنائی پر گیلا گیلا موٹا موٹا سا لیپ کی صورت لگا کر کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں اور پھر گرم پانی سے صاف کریں۔



حلوے بنائیں

خالدہ جیلانی

بیسن کا حلوہ

ضروری اجزا :

بیسن	ایک پاؤ
انڈے	چار عدد
چینی، گھی	دو، دو کپ
بادام	آٹھ دس دانے
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد
دودھ	دو کپ

ترکیب :

دودھ، چینی اور انڈے اکٹھے گرائنڈ کر لیں۔ اب ایک کڑاہی میں گھی گرم کرکے الائچی کے دانے کڑکڑائیں۔ پھر بیسن ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو دودھ، انڈے کا آمیزہ ڈال کر آہستہ آہستہ ملاتے جائیں اس دوران مسلسل چمچہ ہلاتے جائیں۔ جب بیسن گھی چھوڑ دے تو میوہ ڈال دیں اور اتار لیں۔ مزے دار حلوہ تیار ہے۔

کھجور کا حلوہ

ضروری اجزا :

کھجور	آدھا کلو
شکر، سوجی	ایک ایک پاؤ
کھویا	حسب پسند
گھی	آدھی پیالی

ترکیب :

گھی گرم کرکے سوجی براؤن ہونے تک فرائی کریں پھر کھجور اور شکر شامل کرکے اچھی طرح مکس کریں۔ اس دوران مسلسل چمچہ چلاتی رہیں۔

آخر میں کھویا ڈال کر کچھ دیر پکائیں۔ اس کے بعد چولہے سے ہٹالیں۔

پلیٹ میں نکال کر پستے کی ہوائیاں چھڑک کر پیش کریں۔

انڈوں کا حلوہ

ضروری اجزا :

انڈے	چھ عدد
دودھ	آدھا کلو
چینی	دو کپ

ترکیب :
انڈوں کو اچھی طرح دودھ اور چینی کے ساتھ پھینٹ لیں۔
کڑاہی میں گھی ڈال کر الائچی دانے کڑکڑائیں پھر اس میں انڈے ڈال کر خوب اچھی طرح مکس کریں۔ میوہ ڈالنا چاہیں تو ابھی ڈال دیں۔
جب حلوہ گھی چھوڑ دے تو ڈش میں پھیلا کر اوپر سے کترا ہوا میوہ ڈال دیں۔

لوکی کا حلوہ

ضروری اجزا :

لوکی	آدھا کلو
دودھ	ایک کلو
چینی میوہ	حسب ذائقہ و پسند
گھی	حسب ضرورت
کیوڑہ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :
لوکی چھیل کر کدوکش کرلیں پھر دودھ میں ڈال کر پکائیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو الگ دیگچی میں گھی گرم کر کے الائچی کڑکڑائیں ساتھ ہی دودھ اور لوکی کا آمیزہ بھی ڈال دیں۔ تھوڑی دیر تک بھون کر چینی ڈال دیں۔ چینی خشک ہونے پر اتارلیں پھر کیوڑہ ڈال کر ڈش میں نکالیں۔ گرم گرم پیش کریں۔

سوجی کا حلوہ

ضروری اجزا :

سوجی' چینی	ایک' ایک پاؤ
گھی	آدھا پاؤ
بادام' کشمش	حسب پسند
زردہ رنگ	ایک چٹکی

ترکیب :
سوجی کو کڑاہی میں ڈال کر آہستہ آہستہ بھونیں' جب خوشبو آنے لگے تو گھی اور الائچی ڈال دیں۔ چینی کو دگنے پانی میں ڈال کر شیرہ بنائیں' پھر اس کو سوجی میں شامل کر لیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو حلوے کو خوب بھونیں یہاں تک کہ حلوہ گھی چھوڑنے لگے پھر اس میں میوہ شامل کر کے اتارلیں۔

ناریل کا حلوہ

ضروری اجزا :

پسا ناریل	دو کپ
چینی	دو کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ
میوہ	حسب پسند

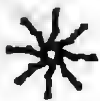
ترکیب :
چینی کو برابر کے پانی میں ملا کر چاشنی تیار کرلیں۔ پھر اس میں ناریل ڈال کر اتنا بھونیں کہ شیرہ — اس میں خوب مکس ہو جائے۔ اب ایک ڈش میں گھی لگائیں اور حلوہ پھیلا دیں۔ اوپر میوہ چھڑک دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کاٹ لیں۔

چنے کی دال کا حلوہ

ضروری اجزا :

چنے کی دال	ایک پاؤ
دودھ	ایک پاؤ
چینی' گھی	آدھا' آدھا پاؤ
میوہ	حسب پسند
کھویا	آدھ پاؤ

ترکیب :
دال کو دھو کر رات بھر کے لیے دودھ میں بھگو دیں۔ اگلے دن دال کو باریک پیس لیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کر کے الائچی کڑکڑائیں۔ دال ڈال کر اچھی بھونیں۔ اب چینی شامل کرلیں۔ جب دال گھی چھوڑ دے تو میوہ شامل کر دیں اور ڈش میں ڈال کر اوپر کھویا ڈال دیں۔ مزے دار حلوہ تیار ہے۔





فرح۔۔۔ سمندری

ج:۔ فرح بہن! آپ ایف اے پاس ہیں' بی اے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح سوچ رہی ہیں۔

فرائڈ کہتا ہے کہ خواب ہمارے لاشعور کا عکس ہوتے ہیں۔ ہماری دبی ہوئی خواہشیں جو ہمارے ذہن اور شعور میں نہیں ہوتیں۔ خوابوں کی شکل میں سامنے آجاتی ہیں۔ ممکن ہے کہیں آپ کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی ہو۔ جو خواب کی شکل میں سامنے آگئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ خواب کی تعبیر ایک باقاعدہ علم ہے۔ ہر شخص خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا اور نہ ہی ہر ایک کے سامنے خواب بیان کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں خواب جس طرح دیکھا ہو اسی طرح پورا ہو' خوابوں میں بالعموم اشارے ہوتے ہیں۔

آپ نے اپنی بہن کو یہ خواب بتا کر غلطی کی' اب اس کی شادی میں کوئی رکاوٹ ڈال کر دوسری غلطی نہ کریں۔ ایک اچھا' حافظ قرآن' پڑھا لکھا' برسر روزگار لڑکا آپ کی بہن کا مقدر بننے جارہا ہے تو اس کی خوشی میں خوش ہو جائیں۔ ان شاء اللہ آپ کی شادی بھی بہت اچھے لڑکے سے ہو گی۔

انجم۔۔۔ کراچی

ج:۔ انجم بہن! آپ نے مفتی صاحب سے فتویٰ لے لیا۔ آپ پر ساری بات واضح ہو گئی۔ اپنی بہنوں کو بتا دیا۔ اپنی ماں سے اظہار کر دیا۔ آپ کے شوہر نے دین کی سمجھ نہ ہونے کے باعث گناہ کیا۔ اب وہ پشیمان ہیں۔ پچھتا رہے ہیں۔ آپ کی والدہ اپنی بیٹیوں کی نظر میں ذلیل ہو گئی ہیں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟ اب اگر مزید بات پھیلے گی تو پوری دنیا میں تماشا بنے گا اور اس کی زد میں سب سے زیادہ آپ کے بچے آئیں گے جن کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دنیا والے انہیں کس نظر سے دیکھیں گے' کیا کیا طعنے دیں گے' اس کا اندازہ کر سکتی ہیں؟

آپ اپنے لیے نہیں' اپنی اولاد کے لیے سوچیں اور جزا اور سزا کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ آپ نے کوئی غلطی نہیں کی' گناہ نہیں کیا' آپ کے بچے بھی بے گناہ' بے قصور ہیں۔ پھر خود کو اور اپنے بچوں کو کیوں سزا دے رہی ہیں؟

آپ کے لیے اب بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ کا مزید کچھ کرنا صرف رسوائی کا سبب بنے گا۔

ملائکہ کوثر۔۔۔ بسم اللہ پور

س:۔ کسی بھی قسم کی معمولی نوعیت کی بیماری یا لمبے سفر کے بعد جیسے میرا ذہن سست رہتا ہے جیسے غنودگی میں ہو یا دھند چھائی ہو' خواب کی سی کیفیت لگتی ہے۔ بظاہر صحت ٹھیک لگتی ہے۔ سستی اور تھکاوٹ تو پہلے سے کم ہو گئی ہے مگر فریش بالکل نہیں ہے۔ دماغ خوشی کو بھی صحیح سے انجوائے نہیں کرتا اور غم کو بہت محسوس کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے وہم ہے۔ کسی نے کہا نفسیاتی پرابلم ہے۔ ملنے جلنے سے بھی دل کتراتا ہے' حالانکہ میں پہلے بڑی خوش مزاج تھی۔ یہ بھی بتا دوں کہ بہت بچپن میں مجھے ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا جو سر کو چڑھ گیا تھا۔ جب جب بھی میں بیمار ہوئی

میری ذہنی کیفیت یہی تھی جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔
ج: اچھی بہن! آپ نے اپنی جو کیفیت لکھی ہے۔ وہ تائی فائیڈ کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے آپ میں

خون کی کمی ہو آپ بلڈ ٹیسٹ کرائیں۔ ڈپریشن بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ معمولی علاج سے آپ ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ آپ کسی سائیکاٹرسٹ کو اپنی کیفیت بتا کر دوا لے لیں۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔

ص۔غ

ہم دس بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ ابو جی کا ڈیڑھ سال ہوا انتقال ہوئے اللہ ان کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ غربت نہیں دیکھی، لیکن وقت تھا، سو گزر گیا، اچھا بھی اور برا بھی، لیکن ایک چیز کی جو کمی بچپن سے آج تک دیکھی، وہ محبت کی تھی اور بدگمانی کی فراوانی دیکھی۔ لڑائی جھگڑے دیکھے امی ابو کے، بہنوں کے اور اب حالات یہ ہیں کہ سات بہنوں کی شادی ہو گئی ہے، بھائی بھی شادی شدہ ہے اب میری باری ہے میں ایم اے اسلامیات اور ایم اے ایجوکیشن ہوں اور ساتھ میں عالمہ فاضلہ میں بھی ڈگری ہولڈر ہوں، میں جاب بھی کرتی رہی ہوں اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی پچھلے تین سال سے میں گھر پر ہوں اور میرا رشتہ دیکھتے ہوئے پونے چار سال ہو گئے ہیں مگر پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے کسی بھی جگہ بات نہیں بنتی یہاں تک کہ میرا روحانی علاج بھی کروایا گیا ہے۔ اسی صدمے کو لے کر ابو جی بھی چلے گئے۔ دوسری بات عدنان بھائی وہ یہ کہ ایک لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اس نے میری بہن کو فون کرکے بہت عزت سے بات کی اور بس پھر وہ دن اور آج کا دن میری بدبختی ختم نہیں ہوئی، میری سزا ختم نہیں ہوئی، میری جاب ختم کرادی گئی، میری تعلیم چھڑوادی گئی، میرے پڑھنے پر پابندی یہاں تک میری تہجد پر بھی پابندی لگادی۔ بات بے بات بدکرداری کے طعنے ملتے ہیں۔ آئے روز مہمان ریجیکٹ کرکے چلے جاتے ہیں۔ دس بہنوں میں سے کوئی بھی بہن ایسی نہیں جس کو اپنے دل کا حال بتا پاؤں۔ باہر جانے کی مجھے اجازت نہیں، ٹیوشن پڑھانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ باتھ روم میں تھوڑی دیر لگ جائے تو شک شروع ہو جاتا ہے۔

ج: اچھی بہن! آپ کو اپنی جاب نہیں چھوڑنا چاہیے تھی۔ آپ اعلا تعلیم یافتہ ہیں ذہین ہیں، سمجھ دار ہیں۔ گھر والے جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اسے کسی طور پر بھی جائز یا درست قرار نہیں جا سکتا۔ آپ نے یہ نہیں بتایا، وہ آپ کی شادی اس لڑکے سے کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انکار کی وجہ کیا تھی؟
جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس حساب سے تو انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ وہ لڑکا شریف، پڑھا لکھا اور برسر روزگار ہے۔ آپ کی کولیگ کے شوہر اس کی ہر طرح سے تحقیق بھی کر چکے ہیں تو پھر آپ کے گھر والوں نے انکار کیوں کیا؟ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعد آپ پر پابندیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

جاب چھڑائی گئی۔ طعنے، تشنے اور شک کرنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کی دعا اور تہجد پر بھی پابندی لگادی گئی۔ اوپر سے ان رشتوں کا سلسلہ۔ جو بار بار ریجیکٹ کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں ایک لڑکی پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ان حالات میں جبکہ گھر میں یہ ماحول ہے اور کہیں رشتہ بھی نہیں ہو پا رہا۔ آپ کے لیے سب سے بہتر تو یہی ہے کہ آپ کی شادی اسی لڑکے سے ہو جائے جس کا رشتہ آیا تھا، آپ کی ماں، بہنیں کچھ سننے پر تیار نہیں ہیں تو آپ اپنے بھائی سے بات کرکے دیکھ لیں شاید وہ آپ کا ساتھ دے سکے۔ ورنہ صبر اور دعا کا سہارا تو ہے۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

منال خان ۔۔۔ کراچی

س: میرے بال بہت روکھے ہیں۔ میں اپنے بالوں کو ملائم، سلکی بنانا چاہتی ہوں پلیز کوئی ٹوٹکا، طریقہ وغیرہ بتا دیں۔ بکھرے بھی ہیں میں چاہتی ہوں گھنے اور سلکی ہو جائیں۔

اور ایک گزارش کرنی تھی۔ پلیز نظرانداز مت کیجیے گا۔ میں میک اپ بالکل نہیں کرتی۔ میرے ہزبینڈ کو میک اپ بالکل بھی پسند نہیں لپ اسٹک بھی نہیں۔ پلیز کچھ ایسا بتائیے کہ جو پردہ دار خواتین ہیں، جنہیں نہ بیوٹی پارلر جانے کی اجازت ہے نہ گھر پر کسی کو بلوا کر میک اپ کرنے کی اجازت ہے اور نہ خود سے کچھ لگانے کی، وہ کیسے اپنی اسکن کو شفاف، بے داغ بنائیں، گورا رنگ، چمکدار بڑی بڑی آنکھیں، نرم و ملائم ہاتھ پیر اور خوب صورت گلابی ہونٹ کیسے حاصل کریں؟ ہر جگہ میک اپ، لپ اسٹک، نیل پالش، آئی شیڈو وغیرہ کا چرچا ہے، ایسے میں وہ خواتین کہاں جائیں جو اپنے شوہر کے لیے سجنا اور خوب صورت دکھنا چاہتی ہیں اور جو میک اپ، لپ اسٹک وغیرہ نہیں لگا سکتیں کیا ان کا کوئی حق نہیں خوب صورت دکھنے کا؟

ج: منال! یہ آپ سے کس نے کہا کہ صرف بیوٹی پارلر میں جا کر اور میک اپ کر کے ہی ریشمی ملائم بال، شفاف چمک دار جلد اور گلابی ہونٹ ہو سکتے ہیں، میک اپ سے وقتی طور پر چہرے کو خوب صورت بنایا جا سکتا ہے لیکن دیرپا خوب صورتی کے لیے آپ کو خود کوشش کرنا ہوگی۔

بازار میں بہت سی کریمیں اور لوشن ملتے ہیں جن کی مدد سے جلد کو خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ خوب صورت ریشمی بالوں کے لیے آپ ایک عدد انڈا، ایک چمچہ دہی اور ایک لیموں کا عرق ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اسے بالوں میں لگائیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد اچھے شیمپو سے بال دھولیں۔ بالوں میں نرمی اور چمک پیدا ہو جائے گی۔

ہفتہ میں دو بار سر میں تیل سے اچھی طرح مساج کریں۔ شفاف، چمک دار جلد کے لیے آپ ہفتہ میں ایک بار بھاپ لیں۔ اس سے آپ کے چہرے کے مساموں میں چھپا میل کچیل باہر نکل آئے گا۔ بھاپ لینے سے پہلے چہرے پر کلینزنگ ملک ضرور لگائیں۔ بھاپ لینے کے بعد چہرہ فیس واش سے دھولیں۔ پھر کوئی اچھا موئسچرائزر لگائیں۔ رات سونے سے پہلے کولڈ کریم ضرور لگائیں۔ آپ چونکہ کراچی میں رہتی ہیں۔ اس لیے ان چیزوں کا حصول آپ کے لیے دشوار نہیں ہوگا۔

ہفتہ میں ایک بار اسکرب کا استعمال بھی کریں۔ اس سے آپ کے چہرے کے مردہ خلیے ختم ہو جائیں گے۔

ہونٹ گلابی کرنے کے لیے آپ سیب کے بیج پیس کر لگائیں۔

آنکھوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے آپ گاجر کا جوس پئیں، زیادہ بہتر یہ ہے کہ کچی گاجریں کھائیں۔ آنکھوں میں اصلی شہد لگانے سے بھی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہفتہ میں ایک بار چہرے پر ماسک لگائیں۔ آسان ترین ماسک یہ ہے۔ ایک انڈے کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ کر اس میں ایک لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد ملالیں۔ اس کو روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں، پندرہ منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر چہرہ صاف پانی سے دھولیں۔

موسم کے پھل اور سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔ خصوصاً ٹماٹر، گاجر، چقندر، کھیرے کا سلاد بنا کر کھائیں۔ سیب اور کینو کا استعمال جلد کے لیے بے حد مفید ہے۔ ہفتہ میں ایک بار پپیتا ضرور کھائیں۔ اگر آپ نے ان ہدایات پر عمل کیا تو بغیر میک اپ کے آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا۔